فکری تربیت کے اہم تقاضے

علامہ یوسف القرضاوی

ہماری مطبوعات

کتاب	مصنف	قیمت
تفسیر فی ظلال القرآن (اردو) (اوّل تا چہارم)	سید قطبؒ مترجم سید حامد علیؒ	۶۴۰/-
تفسیر فی ظلال القرآن (اردو) (پارہ عم)	سید قطبؒ مترجم سید حامد علیؒ	۱۴۰/-
عہد نبوی کا نظام حکومت	مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ	۱۵/-
فولاد ہے مومن	عبید اللہ فہد فلاحی	۶۰/-
بائبل قرآن اور سائنس	موریس بوکائے	۶۵/-
جہاد اسلامی	خلیل احمد حامدی	۳۵/-
وادی نیل کا قافلہ سخت جاں	محمد حامد ابوالنصر	۵۰/-
رسول اکرم کی حکمت انقلاب	مولانا سید اسعد گیلانی	۱۰۰/-
محمد اسلام کے پیغمبر	راما کرشنا راؤ	۹/-
تاریخ دعوت وجہاد	عبید اللہ فہد فلاحی	۷۰/-
اخوان المسلمون مقصد مراحل طریقہ کار	پروفیسر سعید حوّی	۴۵/-
ہندوستان میں ملّی مسائل	پروفیسر عمر حیات خاں غوری	۵۵/-
فکری یلغار اس کے منصوبے اور ہتھیار	ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق	۳۵/-
سفر نامہ ابن بطوطہ	مولانا مقبول احمد سیوہاروی	۳۵/-
عجائبات ہند	مولانا مقبول احمد سیوہاروی	۱۷/-
قرآن میں عورت کی حیثیت	مائل خیرآبادی	۵۰/-
اللہ کے سپاہی	مسکین حجازی	۱۲۰/-
اخوان المسلمون کا تربیتی نظام	ڈاکٹر یوسف القرضاوی	۲۵/-
اسلامی ریاست میں عورت کے حقوق	مائل خیرآبادی	۷/-
نور محمدی	مائل خیرآبادی	۱۲/-
سات سو برس پہلے کا ہندوستان	مولانا مقبول احمد سیوہاروی	۲۲/-

New Crescent Publishing Company
2035, Qasim Jan Street, Ballimaran, Delhi-6 Ph.:3262545

فکری تربیت
کے
اہم تقاضے

ڈاکٹر یوسف القرضاوی

ترجمہ وتعلیق

سلطان احمد اصلاحی

نام کتاب - فکری تربیت کے اہم تقاضے

نام مصنّف - ڈاکٹر یوسف القرضاوی

ترجمہ اور تعلیق - سلطان احمد اصلاحی

ناشر - نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی۔ دہلی ٦

سنِ اشاعت - 2008

قیمت - Rs 90/-

ملنے کا پتہ

نیو کریسنٹ پبلشنگ کمپنی

٢٠٣٥-گلی قاسم جان، بلّی ماران، دہلی۔ ٦

Ph.: 23262545,65363445

فہرست موضوعات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مترجم

ماضی قریب میں عالم عرب کی کم ہی شخصیتیں ہوں گی جنھیں اردو دنیا میں وہ شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی ہو جو جناب ڈاکٹر یوسف القرضاوی کے حصے میں آئی ہے۔ ان کی تصنیفات کا بڑا حصہ اردو میں منتقل ہو کر قبول عام حاصل کر چکا ہے، اور روزانہ اس کی فہرست میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پیشِ نظر کتاب 'داعی کی مطلوبہ ثقافت' یا 'فکری تربیت کے اہم تقاضے' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جس کا موضوع جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے علمی اور فکری تیاری کے ذیل میں دین کے ایک داعی کے لئے ان اہم نکات کی نشاندہی ہے جن کا لحاظ کئے بغیر وہ اس کا حق ادا نہیں کر سکتا ہے۔ یوسف القرضاوی نے ذہن رسا پایا ہے اور ان کی نظر وسیع ہے۔ اس کے علاوہ وہ صرف ایک صاحب نظر اہلِ قلم ہی نہیں بلکہ ایک پرجوش مبلغ اور داعی بھی ہیں۔ اس لئے ان صفحات میں ان کے علمی خیالات وآرا ہی نہیں بلکہ ان کے دعوتی تجربات ومشاہدات کا ایک بڑا حصہ بھی صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو گیا ہے جن سے امید ہے خاص طور پر دعوتی حلقے اور ان میں بھی بالخصوص نوجوان زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔ موصوف 'اخوان المسلمون' کے ایک سرگرم

کارکن اور اس کے صفِ اول کے رہنماؤں کے قریب ترین ساتھیوں میں رہے ہیں۔ اس لئے آئندہ صفحات میں علمی وفکری تیاری کے ذیل میں بالواسطہ طور پر 'اخوان' کے نقطۂ نظر اور اس باب میں ان کے اندازِ فکر کی ایک جھلک بھی بڑی حد تک دیکھی جا سکتی ہے۔ بیسویں صدی کی اس عظیم اسلامی تحریک کے نقطۂ نگاہ کو معلوم کر کے دوسری معاصر تحریکات بھی بجا طور پر اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں، اور باہمی اخذ واستفادہ سے ہر ایک کو اپنی کمیاں دور کرنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ 'اسلامیات' کے ایک عام طالب علم کے لئے بھی اس کتاب کا مطالعہ ان شاء اللہ افادیت سے خالی نہ رہے گا۔ بنیادی اسلامی ماٰخذ اور ان کے متعلقات سے اخذ واستفادہ کے نہج وانداز کا ایک اچھا جائزہ اس میں آ گیا ہے۔ قرآن وحدیث اور ان کے متعلقات کے علاوہ فقہ، اصول فقہ، علم کلام، تصوف نیز عصری علوم مثلاً تاریخ، نفسیات، سماجیات، اخلاقیات وغیرہ کے سلسلے میں بھی اچھی خاصی معلومات اس میں سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔

داعی کی علمی اور فکری تیاری کے ذیل میں پوری کتاب میں مصنف نے بات جس انداز سے کہی ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ عربی زبان اور اسلام کے بنیادی ماٰخذ سے براہ راست واقفیت کو داعی کے لئے ایک شرط لازم کی حیثیت سے تصور کرتے ہیں۔ جس کی طرف اشارہ کی بھی چنداں حاجت نہیں ضرورت صرف اس سے آگے کی باتوں کی طرف متوجہ کرنے کی ہے۔ خدا کرے کہ عربی دنیا سے باہر کے دعوتی حلقوں کے لئے یہ چیز عربی زبان اور بنیادی اسلامی ماٰخذ سے براہِ راست واقفیت بہم پہنچانے کے لئے ایک مہمیز کا کام دے سکے۔

مصنف نے ہر ہر موضوع سے متعلق اپنے معاصرین کے کاموں کا حوالہ

کتاب میں بڑی فراخ حوصلگی سے دیا ہے اور ان سے استفادہ کرنے کی تلقین کی ہے مستقل کتابوں کے علاوہ منفرد مضامین کا ذکر بھی اسی اہتمام سے کیا ہے اور عالم عرب سے باہر کی شخصیتوں کے کام کا تعارف کرانے میں بھی کسی بخل سے کام نہیں لیا ہے بلکہ پوری قدر افزائی کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔ برصغیر ہند و پاک کی حد تک یہ چیز ہمارے لئے عبرت آموز ہی نہیں قابل تقلید بھی ہے۔ جبکہ ہمارے یہاں عام طور پر معاصرین کے چھوٹے موٹے کاموں کا تو خیر ذکر ہی کیا ان کے بڑے بڑے کارناموں کو پس پشت ڈال دینے کو ایسا لگتا ہے گویا کار ثواب سمجھا جاتا ہے۔ اس ذیل میں مختلف موضوعات سے متعلق اہم اردو تصنیفات کا اضافہ ہم نے اپنی طرف سے کر دیا ہے۔ غالباً اجنبی زبان میں ہونے کے سبب وہ موصوف کی نگاہ میں نہ آسکی ہوں گی لیکن اپنے موضوع پر وہ جس اہمیت کی حامل ہیں اس کے پیش نظر ان کا ذکر نہ کرنے سے ایک بڑی تشنگی باقی رہ جاتی۔

مختلف مقامات پر کتاب میں ذکر کردہ احادیث کو اصل مآخذ سے رجوع کرنے پر اندازہ ہوا کہ مصنف نے زیادہ تر حدیثوں کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے کہیں کہیں فٹ نوٹس کے ذریعہ ہم نے اس اختلاف کو واضح بھی کر دیا ہے۔ اردو قارئین جو اور جنرل اردو تصنیفات میں کسی بھی حدیث رسولؐ کو مآخذ میں ذکر کردہ متن سے مطابق دیکھنے کے عادی ہیں، امید ہے اس وضاحت کے بعد انھیں کوئی خلجان نہیں رہے گا۔ اہل عرب کو علاوہ اور بہت سی باتوں کے ایک فائدہ یہ بھی حاصل ہے کہ وہ حدیث کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے ہوئے بھی متن حدیث سے قریب تر رہتے ہیں۔ اردو کے لحاظ سے البتہ یہ بہر حال ایک کمی ہے جسے ان شاء اللہ آئندہ دور کرنے کی کوشش کی جائے

گی۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے تو کوئی دوسرا صاحب ذوق بھی یہ کام اپنے ذمہ لے سکتا ہے جس پر ہمیں بیحد مسرت ہوگی۔

ترجمہ کے سلسلے میں ہماری ناچیز رائے ہے کہ الفاظ کی پابندی کر کے اس کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا ترجمہ کی اصل خوبی یہ ہے کہ ایک زبان میں کہی ہوئی بات دوسری زبان میں اس کے اپنے اسلوب اور طرز ادا کو ملحوظ رکھتے ہوئے بیان کی جائے۔ یہ مقصد لفظی ترجمہ سے کسی صورت حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ ہم نے اس ترجمہ میں اپنی حد تک پوری کوشش کی ہے کہ مصنف کی عربی زبان میں کہی گئی بات اردو کے اپنے اسلوب میں ادا کی جا سکے۔ البتہ اس سلسلے میں زیادہ آزادروی سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ ہماری یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہے اس کا فیصلہ ناظرین ہی کر سکیں گے۔

مختلف مقامات پر حسب ضرورت ہم نے اپنی طرف سے تعلیقات کا اضافہ کر دیا ہے جو امید ہے ان شاء اللہ افادیت سے خالی نہ ہوں گی۔ اسی طرح مدعا کی توضیح اور گفتگو کو مربوط کرنے کے لیے قوسین کی عبارت کا اضافہ ہماری طرف سے ہے۔ بھول چوک سے کوئی انسانی کام خالی نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ مجھ جیسے بے مایہ و بے بضاعت کی کوئی کوشش۔ اہل علم کسی فروگذاشت کی نشاندہی کر کے ہمارے شکریہ کے مستحق ہوں گے اور اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا کرے گا۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

سلطان احمد اصلاحی
پان والی کوٹھی علی گڑھ
۲۳۔ اپریل ۱۹۸۳ء

مقدمہ

دین کی طرف دعوت دینا اور اللہ کے راستے کی طرف بلانا اس کام کا بیڑہ سب سے پہلے حضرات انبیاء علیہم السلام نے اُٹھایا جنہیں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے درمیان سے خاص اس کام کے لئے منتخب فرمایا اور انہیں ان کے پاس اپنا پیغامبر بنا کر بھیجا۔ ان کے بعد اس بوجھ کو ان کے سچے جانشینوں نے اپنے کندھوں پر اٹھایا جو اس کام کے سلسلے میں ان کے وارث قرار پائے۔ یہ وہ برگزیدہ شخصیتیں تھیں جو علم کے ساتھ عمل کا پیکر اور صدق و اخلاص کا کامل ترین نمونہ تھیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جس کام کو انھوں نے اپنے ذمہ لیا اس کا حق ادا کر کے دکھایا۔ کون نہیں کہے گا کہ خدا تعالیٰ پر ایمان کے بعد سب سے افضل عمل اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ یہی دعوت الی اللہ ہے۔ اس لئے کہ اس کی بدولت لوگوں کو حق کی طرف رہنمائی ملتی اور سچائی کا راستہ روشن ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں لوگ بھلائیوں اور نیکیوں سے محبت کرتے اور بدی اور برائی سے ان کے اندر نفرت پیدا ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ لوگ اس کی بدولت اندھیروں سے نکل کر اُجالے میں آجاتے ہیں۔ اور زندگی کے سفر میں ان کے لئے حق و صواب کا راستہ

روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے دعوت دین کی اس بات کو سب سے بھلی بات اور اسے سب سے اونچا کام قرار دیا ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ (فصلت : ۳۳)

(اس شخص سے زیادہ بھلی بات اور کس کی ہوسکتی ہے جو بلائے اللہ کی طرف اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمان ہوں)

اللہ کی طرف بلانے کا مطلب ہے لوگوں کو اس کے دین کی طرف بلانا اور انھیں اس بات کے لئے آمادہ کرنا کہ زندگی کے اندر وہ اس کے بتائے ہوئے راستے کے مطابق چلیں اور روئے زمین پر اس کے عطا کردہ ضابطہ حیات کو جاری و نافذ کریں۔ صرف ایک اللہ کی بندگی کی جائے، اسی سے مدد طلب کی جائے اور صرف اسی کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم قرار دیا جائے۔ اور اس ایک ہستی کے علاوہ جن بے شمار شیطانی طاقتوں کی لوگ پیروی کر رہے ہیں اور ان کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہیں، ان سب سے برأت کا اعلان کیا جائے۔ حق اسی کو مانا جائے جسے اللہ نے حق بتایا ہے اور جس چیز کو اس نے باطل قرار دیا ہے کسی رو رعایت کے بغیر اسے باطل تصور کیا جائے۔ بھلائی کا حکم دیا جائے، برائی سے روکا جائے اور اللہ کے راستے میں اپنی جان اور مال کی بازی لگانے سے ذرا بھی گریز نہ کیا جائے۔ مختصر لفظوں میں یہ کہ دین اسلام کی طرف دعوت دی جائے بالکل خالص اور بے آمیز طریقے پر، نہ اس کے حصے بخرے کئے جائیں نہ اس کے اندر کسی اور چیز کی آمیزش کو روا رکھا جائے۔

خوب سمجھ لیا جائے کہ دین کی دعوت جب اس انداز سے پیش کی جائے گی تو اسے ٹھنڈے پیٹوں کبھی بھی برداشت نہ کیا جائے گا۔ اور ایسا کبھی نہ ہوگا کہ لوگ

جوق در جوق بس اسے قبول کرتے جائیں اور کسی طرف سے اس کے خلاف ایک آواز بھی نہ اُٹھے۔ اس کا تصور کیونکر کیا جاسکتا ہے جبکہ بہت سے لوگ ہوتے ہیں جن کے ذہن و دماغ پر تعصبات کے دبیز پردے پڑے ہوتے ہیں خواہش نفس ان کے اندرون میں اپنے گھونسلے بنا چکی ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ حق و باطل کے درمیان قوت امتیاز سے محروم ہو جاتے ہیں۔ پھر ان سب پر مستزاد بے شمار شیطانی طاقتیں ہوتی ہیں جو انھیں مسلسل اسی سمت میں آگے بڑھتے چلے جانے کے لئے مہمیز کرتی رہتی ہیں اور ان کی مستقل کوشش ہوتی ہے کہ ان کے ذہن کے دریچے کسی صورت کھلنے نہ پائیں۔ لہٰذا ناگزیر ہے کہ اس کار دعوت کو سنبھالنے کے لئے انتہائی مضبوط ہاتھ سامنے آئیں جو اپنے اندر اس کے ہمہ گیر تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور اسے درپیش چیلنجوں کا بھرپور طریقے پر جواب دے سکیں۔ انھیں خود بھی کار دعوت کی عظمت و اہمیت کا پوری طرح احساس ہو اور دوسرے دلوں کو بھی وہ اس کی روشنی سے منور کرنے اور ان کے اندر اس شجرۂ طیبہ کی تخم کاری کی اہلیت رکھتے ہوں۔ غرضیکہ وہ خود اس کی حلاوت کے لذت آشنا اور اس کے نشے سے سرشار ہوں۔ اور دوسروں کو بھی اس سے شاد کام اور اس نشے سے سرمست کر دیں۔ کار دعوت کے اس سیاق میں داعی کی حیثیت اصل قوت محرکہ کی ہوتی ہے جس سے پورا قافلۂ دعوت مہمیز حاصل کرتا ہے۔ دراصل یہی وہ 'ڈائنمو' ہوتا ہے جس سے یہ پورا کارواں متحرک ہوتا ہے اور یہی وہ 'پاور ہاؤس' ہوتا ہے جو اس پوری بستی کو منوّر رکھتا ہے۔

آج تعلیم و تربیت کے ماہرین کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اس میدان میں اصل اہمیت معلّم و مربی کی ہے اور اس پورے نظام میں اسے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔

معلّم ہی کی ذات ہے جو ایک طالب علم کے اندر بے تابی کی رُوح پھونکتی اور اس کی رگوں کے اندر زندگی کا خون دوڑا دیتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم و تربیت کی اس مہم میں دوسرے بہت سے عوامل کار فرما ہوتے ہیں۔ اور دوسری بہت سی چیزیں اس کے اوپر اثر انداز ہوتی ہیں۔ تعلیم گاہ ہوتی ہے۔ اس کا ایک پورا نظام ہوتا ہے۔ کتاب کاپی اور قلم ساتھ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تحقیق و تفتیش کے بے شمار آلات ہوتے ہیں جن سے اس سلسلے میں مدد لی جاتی ہے لیکن اس پورے نظام میں کونے کے پتھر کی حیثیت اسی معلّم اور مربی کو حاصل ہوتی ہے۔ اور سب کچھ ہوتے ہوئے اگر اس خاکے سے صرف اسے نکال دیا جائے تو یہ پورا نقشہ بالکل بے رنگ اور یہ پورا ڈھانچہ ایک لاشۂ بے جان کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا ہے۔

اب اگر تعلیم و تربیت کے میدان میں معلّم و مربی کی یہ حیثیت ہے تو کیا دعوت و تبلیغ کے میدان میں داعی اور مبلغ کی حیثیت اس سے کچھ مختلف ہوگی۔ کون نہیں کہے گا کہ ایک تعلیم گاہ کی نسبت سے جو اہمیت ایک معلّم اور مربی کی ہو سکتی ہے، میدان دعوت میں داعی کی حیثیت اس سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہوگی۔ اس لئے کہ اس کا تو پورا نظام اسی کی شخصیت کے گرد گردش کرتا ہے۔ تعلیم کی طرح اس کے نہ تو متعین اوقات ہوتے ہیں، نہ درس و تدریس کا باقاعدہ سلسلہ ہوتا ہے، نہ اس کا کوئی باقاعدہ کورس مقرر ہوتا ہے اور نہ تو اس کے لئے مدرسہ و کالج کی وہ فضا ہوتی ہے جس کا ایک لگا بندھا نظام ہوتا ہے اور باقاعدگی کے ساتھ روزانہ اس پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دعوتی میدان میں تمام تر دار و مدار داعی کی شخصیت پر ہوتا ہے، وہ خود جتنا متحرک ہوگا دوسروں کو بھی اسی نسبت سے متحرک کر سکے گا جس نسبت سے وہ اپنا خون جگر جلائے گا اسی کے بقدر اسے اپنے ارد گرد روشنی نظر آئے گی۔ غرضیکہ اس پورے نظام میں از اول تا آخر جو کچھ ہے وہ

سب یہی داعی کی شخصیت ہے اور اسی کے گرد اس کا پورا نظام گردش کرتا ہے یہی ادارہ ہے، یہی اس کا نظام الاوقات ہے، یہی اس کا نصاب ہے، اسے ہی معلم کے فرائض انجام دینے ہیں اور اپنے پورے قافلے کو جو رُخ بھی دینا ہے وہ اسی کے ذمہ ہے۔ کتنا بھاری ہے یہ بوجھ جو اسے اٹھانا ہے اور کتنی اہم ہے یہ ذمہ داری جو اسے انجام دینی ہے۔

کار دعوت کے اس پس منظر میں داعی کی جیسی کچھ اہمیت ہو سکتی ہے اس پر اب مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ معلوم ہوا کہ اس میدان کا اصل کام انہی داعیوں کا تیار کرنا ہے۔ ان کی بہتر سے بہتر تربیت کا سامان کیا جائے۔ فکری اور عملی لحاظ سے ان کو خوب اچھی طرح تیار کیا جائے۔ اور ان کے علمی معیار کو زیادہ سے زیادہ بلند کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر یہ کام نہ ہو سکا تو دعوت دین کے تمام لمبے چوڑے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ اور خارج کی دنیا میں کار دعوت کی انجام دہی الگ رہی دعوت کا یہ قافلہ خود اپنی صفوں کو پژمردگی و اضمحلال سے محفوظ رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ داعی گروہ جب تک اپنے کو علمی فکری اور عملی ہر حیثیت سے پوری طرح تیار نہیں کرے گا وہ خود کسی مثالی اجتماعیت کا نمونہ پیش کر سکے گا نہ خارج کی دنیا میں کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام دے سکے گا۔

دین کا ایک داعی حق و باطل کی اس کشمکش سے کامیابی کے ساتھ اسی وقت عہدہ برآ ہو سکتا اور ظلم و جہل اور فتنہ و فساد کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں روشنی کا چراغ اسی وقت جلائے رکھ سکتا ہے جب کہ باطل کی اس پوری فوج سے لڑنے کے لئے اس نے اپنے کو پوری طرح مسلح کر لیا ہو اور دشمن کے ہر حملے کا پوری قوت کے ساتھ جواب دینے کی پوزیشن میں ہو۔

باطل کے خلاف اس جنگ میں ایک داعی کے لئے اگر کوئی اسلحہ کارگر ہو سکتا

ہے تو وہ سب سے پہلے 'ایمان' کا اسلحہ ہے۔ کہ اس کے بغیر دوسرے تمام اسلحے بیکار اور ان کا کھٹل قرار پانا یقینی ہے۔ لیکن یہ ایمان کوئی معمولی چیز نہیں، صرف زبانی جمع خرچ سے اس کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ایمان صحیح معنوں میں ایمان اسی وقت قرار پاتا ہے جبکہ وہ انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے اور اس کی عملی زندگی اس کی شہادت پیش کرنے لگے۔

دوسری چیز 'حسن اخلاق' ہے کہ وہ اخلاق عالیہ کا پیکر ہو اور یہ چیز اس کی فطرت ثانیہ بن چکی ہو۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے اندر صحیح معنوں میں ایمان جاگزیں ہو جائے تو اس کے اندر اس حسن اخلاق کا پایا جانا لازمی ہے یہی وجہ ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے 'ایمان' کے ساتھ بطور لازم و ملزوم کے پیش کیا ہے۔

اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا	(مسلمانوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان والا
(ابوداؤد۔ دارمی)	وہ ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہو)

دین کے ایک داعی کے لئے 'حسن اخلاق' کی اس اہمیت کے سلسلے میں اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ قرآن داعی اوّل صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وصف سے متصف گردانتا ہے:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (قلم: ۴)	(اور بیشک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو)

اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر اپنا احسان جتاتے ہوئے اسے آپ پر اپنا خصوصی انعام قرار دیا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ	(یہ اللہ کی بڑی مہربانی ہے کہ تم ان کے لئے
كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ	نرم ہو۔ ورنہ اگر تم تند خو اور سخت دل ہوتے

حَوْلِكَ ۔ (آل عمران:۱۵۹) تو لوگ تمہارے گرد سے چھٹ جاتے)

حق و باطل کے اس کارزار میں کام آنے والا تیسرا اسلحہ علم اور ثقافت ' کا ہے۔ روحانی اور اخلاق ہتھیاروں کے پہلو بہ پہلو یہی فکری اسلحہ وہ تیسری چیز ہے جس کے ذریعہ اس معرکہ کو سر کیا جا سکتا اور اس مہم میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ دعوت دراصل ایک طرح کی معنوی داد و دہش ہے، اب ظاہر بات ہے کہ جو خود اندر سے خالی اور نور علم سے بے بہرہ ہوگا وہ دوسروں کو اس سے کیونکر فیض یاب کر سکتا ہے۔ جو خود خالی ہاتھ ہے وہ دوسرے کو کیا دے سکتا ہے۔ جو شخص صاحب نصاب ہی نہیں اس کے زکوٰۃ ادا کرنے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔

آئندہ صفحات میں ہم نے دعوت دین کے اسی تیسرے تقاضے سے بحث کی ہے۔ دعوت کا فکری پہلو یعنی کہ اس پس منظر میں داعی کو کن کن پہلوؤں سے تیار ہونا چاہئے۔ وہ خود اپنے کو اس میدان کے لئے کس طرح تیار کرے یا اگر دوسرے لوگ اسے اس مقصد کے لئے تیار کرنا چاہیں تو انھیں اس سلسلے میں کن امور کو پیشِ نظر اور کن باتوں کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ داعی کی مطلوبہ ثقافت کیا ہونی چاہیئے اگر ہم اس مقصد کے لئے کسی مدرسے یا کسی کالج کا قیام عمل میں لانا چاہیں۔ یا اگر کچھ لوگ خود اپنے طور پر اس کام کے لئے اپنے کو تیار کرنا چاہیں تو اس کے سلسلے میں انھیں ہم کیا مشورہ دے سکتے ہیں۔

یہی سوال ہے جس کا اس کتاب میں جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے جو دراصل اس مقالے کا بدلا ہوا قالب ہے جو دعوت اور ارباب دعوت کے مسائل سے متعلق پہلی کانفرنس میں پیش کیا گیا تھا جس کا اہتمام جامعہ اسلامیہ مدینہ نے صفر ۱۳۹۶ھ

میں کیا تھا۔ خیال تھا کہ یہ مقالہ کچھ زیادہ طویل نہ ہوگا اور چند صفحات میں بحث سمٹ کر آجائے گی۔ لیکن اپنی خواہش کے باوجود گفتگو طویل ہوگئی جو بجائے ایک مقالہ کے ایک کتاب کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ ویسے یہ موضوع کافی اہم ہے۔ خاص طور پر آج کے حالات میں جبکہ عالم اسلام میں ہر جگہ اس مقصد کے لئے الگ الگ اداروں اور انجمنوں کا قیام پیش نظر ہے شاید یہ گفتگو کچھ زیادہ بے موقع اور بے محل بھی نہ ہوگی۔

اس پس منظر میں نے ایک داعی کے لئے چند باتوں کی نشاندہی کی ہے جس کے لئے میں نے 'ثقافت' کی نئی اصطلاح استعمال کی ہے۔ داعی کی یہ مطلوبہ ثقافتیں درج ذیل ہیں:

۱۔ اسلامی ثقافت ۲۔ تاریخی ثقافت ۳۔ ادبی ثقافت ۴۔ انسانی ثقافت ۵۔ علمی ثقافت اور ۶۔ ثقافت واقعیہ یعنی حالات حاضرہ پر نظر۔

داعی کے لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ ان تمام 'ثقافتوں' سے اپنے کو بھرپور طریقے پر آراستہ کرنے کی کوشش کرے۔ انھیں اچھی طرح ہضم کرے اور انھیں زیادہ سے زیادہ اپنے اندر اتارنے کی کوشش کرے۔ جب تک وہ خود ان کیفیات سے پوری طرح سرشار نہ ہو، دوسروں کو ان سے سرشار کرنے میں اسے کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔

اب میں ان میں سے ہر 'ثقافت' کے متعلق الگ الگ گفتگو کرتا ہوں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے میرے ذہن کے دریچوں کو کھول دے اور میں اپنی بات کو بہتر سے بہتر طریقے پر بیان کر سکوں۔ وباللہ التوفیق۔

یوسف القرضاوی

۱۸۔ ۱۲۔ ۱۳۹۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی ثقافت
اور
اس کے عناصر ترکیبی

ایک مسلمان جو دعوت دین کا حق ادا کرنا چاہتا ہے سب سے پہلے اسے، جس فکری سرمائے سے آراستہ ہونے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ وہ اپنے اندر اسلامی ثقافت کو اچھی طرح جذب کر چکا ہو۔ جس کی جڑیں گہری ہوں اور جس کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہوں اسی صورت میں وہ داعی کو اپنے عمدہ پھلوں سے اچھی طرح شاد کام کر سکے گی۔

'اسلامی ثقافت' سے ہماری مراد وہ 'ثقافت' ہے جس کا مرجع و محور اسلام ہو۔ خواہ معاملہ اس کے مصادر و مراجع کا ہو، یا اس کے اصول اور بنیادوں کا، یا اس سے تعلق رکھنے والے علوم کا جو اس سے پھوٹ کر نکلے ہوں۔ اور یہ بالکل فطری بات ہے۔ اس لئے کہ وہ شخص جو دعوت اسلامی کا حق ادا کرنا چاہتا ہے اس کے لئے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے، وہ یہ کہ اسے اچھی طرح معلوم ہو کہ وہ اسلام ہے کیا جس کی طرف وہ لوگوں کو دعوت دے رہا ہے؟ پھر یہ بات بھی ضروری ہے کہ اس کی یہ واقفیت گہری ہو جس پر اسے پوری طرح شرح صدر حاصل ہو۔ سطحی اور اوپری واقفیت نہ ہو جس کی وجہ سے اس کے خیالات

ہر وقت شکوک و شبہات کی آماجگاہ بنے رہیں۔ اس لئے ناگزیر ہے کہ اسلام کی یہ واقفیت اس کے اصل مصادر کی روشنی میں ہو جس میں اس کے چشمۂ صافی سے براہ راست سیرابی حاصل کی گئی ہو۔ انتہاپسندوں کی تحریفات کا اس میں کوئی دخل نہ ہو، نہ باطل پرستوں کے من گھڑت خیالات کی کوئی آمیزش ہو اور نہ ناواقفیت کاروں کی دور از کار تاویلات کا کوئی شائبہ ہو۔

اس طرح دین کا یہ داعی اپنے رب کی طرف سے ایک 'روشن دلیل' پر ہوگا جیسا کہ اس کا ارشاد ہے: أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ (محمد-۱۴) اور اپنی دعوت میں اسے پوری طرح 'شرح صدر' حاصل ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروؤں کے سلسلے میں اس کی گواہی دی ہے:

قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ (یوسف - ۱۰۸)	(کہہ دو یہ میرا راستہ ہے، میں بلاتا ہوں اللہ کی طرف اس پر مجھے شرح صدر ہے اور ان کو بھی جو میرے پیرو ہیں۔ پاک ہے اللہ کی ذات اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں)

پس دین کے ایک داعی کے لئے ناگزیر ہے کہ دینی علوم پر اسے گہری دسترس حاصل ہو۔ اس نے انھیں اچھی طرح سمجھا ہو، ہضم کیا ہو اور ان کا لذت آشنا بن چکا ہو۔ اس کے بعد ہی وہ دینی فکر کو خالص اور بے آمیز طریقے پر پیش کر سکے گا جس کی بدولت عامۃ النّاس کے لئے اپنے امراض باطنی سے شفایاب ہونے کی توقع ہو۔

قرآن کریم اور اس کی تفسیر

قرآن کریم اسلام کا مرجع اول ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ اسلامی ثقافت کی نسبت سے بھی اسے مرجع اول ہونے کا مقام حاصل ہے۔ اسلام کی تمام تعلیمات خواہ ان کا تعلق عقائد و تصورات سے ہو، یا اقدار اور زاویہ ہائے نظر سے، دینی شعائر اور عبادات کا معاملہ ہو یا اخلاق اور آداب کا یا معاملہ شرائع اور قوانین کا ہو، ان تمام دائروں میں جہاں تک ان کے اصول اور اساسیات کا سوال ہے ناگزیر ہے کہ ان کو قرآن کی طرف پلٹایا جائے قرآن نے ان تمام دائروں سے متعلق بنیادیں قائم کر دی ہیں، اور ان کے ستونوں کو خوب مضبوط استوار کر دیا ہے۔ اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت موجود ہے جس نے اس کے ایک ایک گوشے کی وضاحت کر دی ہے اور کوئی چیز تشنہ نہیں چھوڑی ہے۔ اس کے نتیجے میں اسلام ہمارے سامنے ایک ایسی بلند و بالا عمارت کی صورت میں سامنے آتا ہے جس کا گردش دوراں کا بڑے سے بڑا طوفان کچھ بگاڑنے سے قاصر ہے۔

قرآن اپنے دامن میں غیبی حقائق کو سمیٹے ہوئے ہے۔ اسی طرح اس کا دامن نفس انسانی کے حقائق، زندگی کے حقائق اور انسانی اجتماعیت کے حقائق سے مالامال ہے۔ وہ کائنات کے اندر اللہ تعالیٰ کی ان سنتوں کی نشاندہی کرتا ہے، اسی طرح انفس و آفاق کی ان نشانیوں کو سامنے لاتا ہے کہ کوئی بھی انسان ان سے واقفیت بہم پہنچانے اور ان سے روشنی حاصل کرنے سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

اس بات کو توصرف اس ایک معجزانہ اسلوب میں ہی بیان کیا جا سکتا ہے کہ: یہ کلام سرتاپا نور ہے۔ جس کی توضیح و توصیف کے سلسلے میں ہم مجبور ہیں کہ ذات باری

کے ان لفظوں کو مستعار لیں کہ:

كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ (ہود - ۱)

(یہ کتاب ہے جس کی باتیں جانچی پرکھی ہیں پھر انھیں کھولا گیا ہے ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے)

خود اس کے نازل کرنے والے نے اس کی یہ صفت بیان کی ہے کہ یہ 'نور' یعنی روشنی ہے، اور روشنی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ظلمتوں کو کافور کر دیتی ہے جس کے نتیجے میں انسان صحیح راستے کو پالیتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُم بُرْهَانٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا۔ (نساء - ۱۷۴)

(اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیل آگئی ہے اور ہم نے تمہارے پاس ایک واضح روشنی بھیجی ہے)

اسی طرح اس نے اس کا ایک وصف یہ بیان کیا ہے کہ یہ 'روح' یعنی زندگی بخشنے والی کتاب ہے۔ اس لئے کہ روح کی خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ حرکت عطا کرتی اور زندگی بخشتی ہے:

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا۔ (شوریٰ - ۵۲)

(اسی طرح (اے نبیؐ) ہم نے تمہاری طرف اپنے حکم سے ایک روح کی وحی کی ہے)

پس ناگزیر ہے کہ وہ لوگ جو اس پر ایمان رکھتے ہوں اور اس کی روشنی سے کسب فیض کرتے ہوں، وہ ان دو اوصاف سے متصف ہوں۔ وہ سرتاپا، زندگی اور سرتاپا روشنی ہوں۔ 'موت' اور 'تاریکی' ان دونوں چیزوں کو یہ ہمیشہ کے لئے شکست دے چکے ہوں:

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (انعام-۱۲۲)

(کیا بھلا وہ جو مردہ تھا پس ہم نے اس کو زندہ کیا اور اسے روشنی دی جسے لیکر وہ لوگوں میں چلتا ہے، اس کے مانند ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہو۔ اور وہاں سے کسی طرح نکل نہ سکتا ہو)

داعی کا قرآن سے تعلق

داعی کو چاہیئے کہ وہ قرآن کریم کو حفظ کرلے جتنا کچھ وہ کر سکے، بلکہ زیادہ بہتر تو یہ ہوگا کہ اسے پورا قرآن حفظ ہو اور وہ اس کو حسب موقعہ برابر دوہراتا رہے، اس کے بعد ہی وہ ضرورت پڑنے پر اس کو اپنے ذہن میں تازہ اور اس سے استفادہ کر سکے گا۔ اس لیئے کہ قرآن ایک ایسا خزانہ ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں، اور ایک ایسا چشمہ ہے جس کے سوتے ارباب دعوت کے لیئے کبھی خشک نہیں ہو سکتے۔

داعی خواہ حافظ قرآن ہو یا نہ ہو لیکن جہاں تک کتاب اللہ کی تلاوت کا سوال ہے تو دل کے پورے جھکاؤ اور گہرے تفکر و تدبر کے ساتھ اس پر کاربند رہنا ضروری ہے۔ اس کی بدولت انسان کے دل کے بند دریچے روشنی سے ہمکنار ہوتے اور سینے اس کے لائے ہوئے حق کو قبول کرنے کے لئے کھل جاتے ہیں۔ عقل اس کے ذریعہ معرفت کے انوار سے فیض یاب ہوتی ہے، اور اپنے دامن کو اسرار و حقائق سے مالامال کر لیتی ہے۔

اس طرح فکر و تدبر کے ساتھ تلاوت قرآن کا اہتمام کرنے سے داعی کو اس بات پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ حسب ضرورت قرآنی شواہد سے استدلال کر سکے، جس سے وہ اپنے کسی فکر و خیال کی تائید چاہتا ہے۔ اس طرح اس کی فکر کو خدائی انتساب حاصل ہو جاتا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ داعیٔ حق تلاوت قرآن کا بہتر سے بہتر انداز میں اہتمام کرنا چاہیئے۔ قرآن کی تلاوت وہ پوری شائستگی اور خوب ٹھہر ٹھہر کر کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔ اس طرح اس کے لئے تجوید کے قواعد کا سیکھنا بھی ضروری ہے تاکہ وہ اپنی قرأت کو درست کر سکے۔ اس کے بعد ہی وہ پورے خشوع و خضوع اور حزن آمیز تفکر کی سہ گونہ کیفیات کے ساتھ اس کی تلاوت کا حق ادا کر سکے گا۔ اب اگر اس کو رونا آتا ہے تو اس کے کیا کہنے ورنہ کم از کم اپنے اوپر یہ کیفیت ہی طاری کرنے کی کوشش کرے۔ لہ

قرآن کی خصوصیات پر نگاہ

جو شخص قرآن کو سمجھنا چاہتا ہے اس کے لیئے ضروری ہے کہ اس کو پڑھتے ہوئے وہ اس کی خصوصیات اور اس کے امتیازات کو اپنی نگاہ میں رکھے۔ اور اسے اپنے عقل و شعور کے آئینے میں اُتارنے کی کوشش کرے۔

۱۔ قرآن کلام الٰہی ہے

اس سلسلے میں قرآن کی سب سے پہلی خصوصیت جو ہر وقت ذہن میں تازہ رہنی چاہیئے وہ یہ کہ وہ خالص اللہ کا کلام ہے بشری اوہام اور بشری خواہشات کا اس میں کوئی شائبہ نہیں۔ نہ بشری تحریفات اور بشری انحرافات کو اس میں در آنے کا موقعہ ملا ہے۔ وہ صد فی صد اور 'الف' سے لے کر 'ی' تک پورا کا پورا اللہ کی طرف سے ہے۔ جبریل امین اس کے صرف ناقل ہیں۔ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اخذ کیا ہے اور اپنے سینے میں محفوظ کیا ہے۔ اس کے بعد اسے لوگوں تک پہنچایا اور اس کے اجمال کی توضیح و تبیین کی ہے:

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ

(بیشک یہ رب العالمین کا اتارا ہوا ہے، ایک معتبر فرشتہ اسے لے کر تیرے دل پر اترا ہے

لہ اس مضمون کی ایک روایت مرسل اور ایک روایت مرفوع ہے۔ ملاحظہ ہو الاتقان: ۱/۱۰۷ (مترجم)

مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ، بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ۔ (تاکہ تو ڈر سنانے والا ہو، یہ صاف اور کھلی ہوئی عربی زبان میں ہے) (شعرآ ۱۹۲-۱۹۵)

اس کا مطلب ہے کہ قرآن اپنے جلو میں الٰہی علم، الٰہی حکمت، الٰہی رحمت اور الٰہی قدرت کو سمیٹے ہوئے ہے، اور اللہ کی ذات وہ ہے جو ہر کمال سے متصف اور ہر نقص سے پاک ہے:

قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا۔ (کہہ دو! اسے اتارا ہے اس نے جو جانتا ہے آسمانوں اور زمین کے تمام بھید کو بیشک وہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے) (فرقان - ۶)

پس یہ عین اس کی طبیعت کا تقاضا ہے کہ اس کی بتلائی ہوئی چیزیں کامل سچائی سے متصف ہوں، اور اس کے دئے ہوئے احکام سراپا عدل کی تصویر ہوں:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ (اور تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف میں کامل ہے۔ اس کے کلام کو کوئی بدلنے والا نہیں اور وہ سننے والا، جاننے والا ہے) (انعام - ۱۱۵)

قرآن حکیم میں جو واقعات بیان کئے گئے ہیں، پند و موعظت کی جو باتیں کہی گئی ہیں، جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے اور جن باتوں سے منع کیا گیا ہے، حیات و کائنات کے متعلق جو نقطۂ نظر عطا کیا گیا ہے اور انسانی زندگی کے لئے جو شریعت اور جو قانون وضع کیا گیا ہے، ان تمام چیزوں کے اندر سرتاپا حق کی نمود ہے، اور سرتاپا خیر، سرتاپا جمال، سرتاپا عدل، سرتاپا حکمت، سرتاپا رحمت اور سرتاپا مصلحت ہے جو ان میں جلوہ گر ہے۔ اس لئے کہ یہ سب ایک ایسی ہستی کی طرف سے ہے جو انہی صفات سے متصف ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ۔ (ہود - ۱) (یہ ایک بڑے حکمت والے اور باخبر کی طرف سے ہے)

مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ (نمل - ۶) (یہ اس ہستی کی طرف سے ہے جو سرتاپا حکمت اور سرتاپا علم ہے)

تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (فصلت ۴۲) (یہ اتارا ہوا ہے اس کی طرف سے جو سرتاپا حکمت اور ستودہ صفات ہے)

تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ (فصلت - ۲۲) (یہ اتارا ہوا ہے اس کی طرف سے جو بڑا مہربان انتہائی رحم والا ہے)

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (حاقہ - ۴۳) (یہ اتارا ہوا ہے اس کی طرف سے جو سارے جہان کا پالنے والا ہے)

شاید یہی وجہ ہے جو قرآن اپنی احکامی آیات کو اکثر و بیشتر اس طرح کے الفاظ پر ختم کرتا ہے:

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (بقرہ - ۲۱۶) (اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے ہو)

وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ (بقرہ - ۲۸۲) (اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔)

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا۔ (نساء - ۱۱) (بیشک اللہ علم والا حکمت والا ہے۔)

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ (مائدہ - ۳۸) (اللہ غالب ہے، حکمت والا ہے۔)

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ (توبہ - ۲۸) (بیشک اللہ علم والا، حکمت والا ہے)

پس کسی مخلوق کے لئے جائز نہیں، خواہ اس کا مرتبہ و مقام کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، کہ وہ خالق کے کلام پر اپنا عکس ڈالنے کی کوشش کرے۔ ایسا کر کے وہ

اس میں اپنے جہل ہی کی آمیزش کرے گا، اگرچہ دعویٰ اسے علم کا ہوگا۔ یہ چیز تمام تر اس کی خواہش نفس کی آئینہ دار ہوگی، اگرچہ وہ اسے نام روشن خیالی کا دیگا۔ غرض یہ کہ وہ اس میں اپنے نقص ہی کی آمیزش کر سکے گا اگرچہ اپنے طور پر اسے وہ کمال نظر آرہا ہو۔ بس اللہ ہی کی باتیں سب سے اونچی ہیں۔ جہالت و نادانی، ہوا و ہوس اور اوہام و خرافات سے وہ بالکل ماورا ہیں۔

۲۔ اسے خود اللہ نے آسان کیا ہے قرآن کی دوسری خصوصیت اس کا آسان ہونا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے خود اسے آتارنے والی پاک ذات نے آسان کیا ہے۔ اس کی تلاوت کو آسان کیا ہے۔ اسے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کو آسان کیا ہے، بشرطیکہ انسان ایسا کرنے کے لئے آمادہ ہو۔ وہ انسان پر کوئی سخت بوجھ نہیں ڈالتا، نہ اسے کسی ایسی چیز کا مکلف ٹھہراتا ہے جس سے وہ تنگی میں مبتلا ہو۔

ارشاد ہوا:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ۔ (قمر۔ ۱۷، ۲۲، ۳۲)
(اور ہم نے قرآن کو آسان کیا ہے یاد دہانی کے لئے تو کوئی ہے یاد دہانی حاصل کرنے والا)

فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ۔ (دخان - ۵۸)
(اے نبیؐ! ہم نے اس کتاب کو تمہاری زبان میں آسان کر دیا ہے شاید کہ یہ لوگ یاد دہانی حاصل کریں)

ہر انسان، بشرطیکہ اس کی فطرت صحیح ہو، قرآن کو پڑھ کر یا سُن کر اسے بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ اس سے اثر قبول کر سکتا ہے، اور اس کے چشمۂ صافی سے اچھی طرح سیراب ہو سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس میں حصہ ہر شخص کو اپنے ظرف کے مطابق ہی ملے گا۔

اور کیوں نہ ہو جب کہ اس کتاب کا وصف ہی اس کا واضح سے واضح تر ہونا اور ہر طرح کے ایچ پیچ سے پاک و صاف ہونا ہے۔ پس وہ ایک کھلی ہوئی کتاب اور ایک کھلی ہوئی روشنی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ (مائدہ - ۱۵)
(تمہارے پاس آگئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور ایک کھلی ہوئی کتاب)

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُبِينًا (نساء - ۱۷۴)
(اور ہم نے تمہارے پاس ایک واضح روشنی اتاری ہے)

روشنی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنے تئیں واضح اور بے غبار ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ دوسرے کے لئے بھی بے غبار ہوتی ہے اور اس کے سامنے صحیح راہ کو بالکل روشن کر دیتی ہے۔ آنکھ والا بہر حال روشنی کو دیکھے بغیر رہ نہیں سکتا۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ہے کہ اس سے الگ ہو کر وہ کوئی دوسری چیز دیکھ بھی نہیں سکتا ہے۔

ان تمام باتوں کا تقاضا ہے کہ داعی اس طرح قرآن کو سہل اور آسان انداز میں پیش کرے۔ جیسا کہ اللہ نے خود اسے آسان کر کے اتارا ہے۔ اس کے اوپر ایچ پیچ بھول بھلیوں اور تکلف و تصنع کی چادر لپیٹ کر نہ رکھ دے کہ اس کی وجہ سے وہ اپنی آسان طبیعت (Nature) سے کٹ کر رہ جائے۔ جبکہ اللہ نے خود اسے آسان اور دوسرں کے لئے آسانی پیدا کرنے والا بنایا ہے۔

اسی طرح اسے قرآن کے معانی کے بیان کے سلسلے میں زیادہ بحث و تکرار سے احتراز کرنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ دور از کار تاویلات کے سمندر میں خود بھی ڈوبے اور دوسروں کو بھی ڈبوئے۔ جن کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ آپس میں ایک

دوسرے سے دست بگریباں اور لفظوں کے ہیر پھیر کے ساتھ ایک دوسرے کی تکرار ہوتی ہیں۔ اس کا نہ تو کوئی علمی فائدہ ہوتا ہے اور نہ اس کے نتیجے میں کوئی پختہ اور متعین رائے سامنے آتی ہے۔

۳۔ قرآن کا اعجاز | قرآن کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک معجز نما کتاب ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ اس کے ذریعہ مشرکین عرب کو چیلنج کریں کہ وہ اس جیسا کلام پیش کر سکیں، اس جیسی دس سوتیں یا ایک سورت پیش کر دیں۔ لیکن وہ ایسا کرنے سے قاصر رہے اور ان کی زبانیں بالکل گنگ ہو کر رہ گئیں۔ قرآن نے ان کے اوپر اپنا یہ دعویٰ بالکل کھلے اور دو ٹوک لفظوں میں رکھا جس کے جواب میں ان کی خاموشی کبھی نہ ٹوٹ سکی:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى	کہہ دو! اگر انسان اور جن سب مل کر اس جیسا
اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا	قرآن پیش کرنا چاہیں تو وہ اس کے مثل نہ پیش
يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ	کر سکیں گے، اگرچہ ان میں سے ہر ایک دوسرے
لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۔ (اسراء - ۸۸)	کی مدد کرنے والا ہو۔

اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر قرآن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ سب سے بڑی نشانی، اور آپ کا لازوال معجزہ ہے۔ آپ سے پہلے حضرات انبیاء علیہم السلام کی لائی ہوئی نشانیاں محسوس اور مادی نوعیت کی اور خاص اپنے زمانے کے لئے ہوتی تھیں۔ جس کی وجہ سے ان پر صرف وہی لوگ ایمان لا سکتے تھے جو اس زمانے میں موجود ہوں اور بچشم خود ان کا مشاہدہ کر سکیں۔ دور دراز بسنے والے لوگوں کے لئے اس کا موقعہ نہ تھا۔ اسی طرح بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے بھی اُن کے مشاہدہ اور

ایمان کا کوئی امکان نہ تھا۔

اس کے برعکس قرآن لسانی اور عقلی نوعیت کا معجزہ ہے، جو زمانے پر زمانے گزرتے جانے کے باوجود تا ابد باقی رہنے والا ہے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:-

مَا مِنَ الْاَنْبِيَاءِ اِلَّا اُوْتِيَ مَا عَلٰى مِثْلِهٖ	جتنے بھی انبیاء گزرے ہیں ان میں سے ہر ایک
آمَنَ الْبَشَرُ وَاِنَّمَا كَانَ الَّذِيْ اُوْتِيْتُهٗ وَحْيًا	کو کوئی نہ کوئی ایسا (محسوس) معجزہ دیا گیا جسے دیکھ کر
اَوْحَاهُ اللّٰهُ اِلَيَّ فَاَرْجُوْ اَنْ اَكُوْنَ اَكْثَرَهُمْ	لوگ ایمان لائے، لیکن مجھے جو چیز (بطور معجزہ) دی
تَابِعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (بخاری)	گئی ہے وہ یہ وحی ہے جو اللہ نے میری طرف

کی ہے (جو قیامت تک باقی رہنے والی ہے)، پس میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے روز میرے پیروؤں کی تعداد ان سب میں زیادہ ہوگی۔

قرآن کے اس اعجاز کے مختلف پہلو اور مختلف گوشے ہیں جن میں اس کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ ذیل میں ہم اُن میں سے چند ایسے اہم گوشوں اور پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں، جن پر دین کے داعی کو خاص طور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے:

(الف) پیرایہ بیان | قرآن اپنے پیرایہ بیان کے لحاظ سے معجزہ ہے۔ اس کے اس اعجاز کا تعلق اس کی بلاغت، اس کے نظم، اس کے اسلوب، اس کی عبارت اور الفاظ سے ہے۔ اور یہی وہ میدان ہے جس میں خاص طور پر ہمارے متقدمین نے اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھائے ہیں اور خوب خوب داد تحقیق دی ہے۔ اس میں علم کلام کے ماہرین نے بھی حصہ لیا ہے مثال کے طور پر علامہ باقلانی، اور علمائے لغت و بلاغت نے بھی مثال کے طور پر عبدالقاہر جرجانی۔ اسی طرح ائمہ تفسیر بھی اس میں شامل رہے ہیں مثلاً علامہ ابن جریر طبری وغیرہ۔

حال کے مصنفین اور ارباب قلم کی طرف سے بھی اس میدان میں بہت ہی قابل قدر کوششیں سامنے آئی ہیں۔ مثال کے طور پر رافعی کی 'اعجاز القرآن' سید قطب شہیدؒ کی شہرۂ آفاق کتابیں 'التصویر الفنی فی القرآن' اور 'مشاہد القیامۃ فی القرآن'۔ اسی طرح ڈاکٹر بدوی کی 'بلاغۃ القرآن'، اور ڈاکٹر دراز کی 'النبا العظیم' 'نظرات جدیدۃ فی القرآن'، محمد مبارک کی 'صورا دبیۃ من القرآن'، اور بنت الشاطئ کی کتاب 'التفسیر البیانی للقرآن' وغیرہ۔

(ب) **موضوع** | قرآن اپنے موضوع کے لحاظ سے معجز ہے۔ مراد یہ کہ قرآن اپنے اندر حکمت وہدایت اور عمدہ نصیحت کے ایسے خزانے رکھتا ہے، اسی طرح اس کے اندر انسان کی فکری اصلاح اور قانونی اور تربیتی اصلاح کا ایسا سامان موجود ہے کہ اگر انسان اسے اپنا لے اور اس کی رہنمائی میں اپنے کو دیدے تو دین و دنیا دونوں میں خوش بختی وسعادت سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ اور یہ بات جس طرح افراد اور خاندانوں کے لیے درست ہے اسی طرح قوموں اور حکومتوں کی نسبت سے بھی پوری طرح صادق آتی ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی ہے کہ دنیا بھر کے دانشور اور مشرق ومغرب کے مفکرین ایسی جامعیت، ایسے توازن واعتدال اور ایسی گہرائی وگیرائی کی حامل کوئی چیز پیش کرنے میں یکسر قاصر ہیں۔ باوجودیکہ جس شخص کے ہاتھوں یہ معجزہ ظاہر ہوا وہ ایک بالکل امی (ناخواندہ) انسان تھا اور ایسی قوم میں پیدا ہوا تھا جسے لکھنے پڑھنے سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

ہمارے قدماء نے اعجاز کی اس نوعیت پر لکھنے کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ اگرچہ اعجاز القرآن کے موضوع پر اپنی بحثوں کے دوران انھوں نے جا بجا اس کی طرف اشارہ کئے ہیں اور لوگوں کی توجہ اس کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔

ہمارے اس زمانے میں البتہ کچھ لوگوں کے ذہن اس طرف متوجہ ہوئے کہ قرآن اپنے

موضوعات اور اپنے مضامین کے لحاظ سے اعجاز کے جس اعلیٰ مقام پر فائز ہے اس کے حوالے سے دنیا کے سامنے اس کے چیلنج کو از سر نو پیش کیا جائے۔ سید رشید رضا کی 'الوحی المحمدی' اسی سلسلے کی ایک کوشش ہے۔ اسی طرح شیخ محمد ابو زہرہ کے وہ مقالات بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں جن کا عنوان ہے: "شریعۃ القرآن دلیل علی انہ من عند اللّٰہ" (قرآن کی پیش کردہ شریعت اس بات پر دلیل ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے)

اس کے علاوہ قرآن کے اس موضوعاتی اعجاز کو نمایاں کرنے والی اور بہت سی کوششیں بھی منظر عام پر آئی ہیں۔ مثال کے طور پر شیخ شلتوت کی کتاب 'القرآن والقتال' اور 'القرآن والمرأۃ'، اسی طرح عقاد کی کتاب 'الانسان فی القرآن الکریم'۔ اور المرأۃ فی القرآن الکریم'۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر دراز کی کتاب 'دستور الاخلاق فی القرآن'، اور محمد عرب دروزہ کی 'الدستور القرآنی' وغیرہ بھی اسی سنہری سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

(ج) **علمی اعجاز** | علمی اعجاز سے ہماری مراد یہ ہے کہ قرآن اپنی بے شمار آیات میں ایسے علمی حقائق کی طرف نشاندہی کرتا ہے جن کا جدید سائنس سے قبل کسی کو پتہ نہ تھا۔ ان حقائق کے سلسلے میں قرآن کا بیان ہمارے دور کے تازہ ترین سائنسی انکشافات کے عین مطابق ہے۔ حالانکہ زمانۂ نزول قرآن میں بلکہ اس کے صدیوں بعد تک ان چیزوں کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ ایسی کسی چیز کی توقع کسی انسان سے نہیں کی جاسکتی جسے خود اپنے بارے میں کچھ خبر نہیں کہ کل کو وہ کیا کمانے والا ہے۔ چہ جائیکہ اسے یہ معلوم ہو کہ دوسرے کی کیا کمائی ہوگی یا یہ کہ صدیوں زمانہ بعد انسانیت کن چیزوں کو دریافت کرنے والی ہے۔ اس چیز کی توقع تو اس کائنات کے پیدا کرنے والے اور اس کے چلانے والے کی طرف سے ہی کی جاسکتی ہے۔ وہی اس بات پر قادر ہو سکتا ہے کہ اپنی کتاب میں کائنات سے متعلق ان اسرار د

رموز کو پیوست کر دے جس تک کسی اور کی رسائی نہ ہو سکے۔ البتہ پیرایۂ بیان وہ ایسا اختیار کرے کہ اگلوں کو بھی اس کے سمجھنے میں کوئی الجھن نہ ہو اور بعد کے لوگوں کے ذہن میں بھی بات پوری طرح آجائے۔ ہمارے معاصرین میں بہت سے لوگوں نے اعجاز قرآنی کے اس رنگ کو نمایاں کرنے کی طرف توجہ کی ہے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو علوم جدیدہ میں اختصاص کے مالک ہیں۔ مثال کے طور پر استاذ محمد احمد الغمراوی محمد جمال الدین الفندی اور عبدالرزاق نوفل وغیرہ۔ ان سے پہلے لوگوں میں شیخ طنطاوی جوہری کا نام سرفہرست ہے۔ البتہ ان میں سے کچھ لوگ اس سلسلے میں غلو کی حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ ان کی پیش کردہ چیزیں قرآن کے الفاظ اور اس کے سیاق وسباق سے بالکل بے جوڑ معلوم ہوتی ہیں۔ اور بات صاف طور پر تکلف کے دائرے میں پہنچتی نظر آتی ہے۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو اس سلسلے میں ایک دوسری انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں۔ البتہ تیسرا گروہ ہے جس نے اعتدال کی راہ اپنائی ہے اور حقیقت ہے کہ سب سے عمدہ راہ اعتدال ہی کی ہے۔

۴۔ اعجاز دوام پھر قرآن کی ایک خاصیت یہ ہے کہ یہ ایک زندۂ جاوید کتاب ہے۔ یہ کسی ایک نسل کے لئے نہیں، نہ کسی ایک زمانے کے لئے خاص ہے۔ اسی طرح چند نسلوں اور چند زمانوں تک کے لئے بھی اس کا دائرہ محدود نہیں۔ بلکہ یہ آخری پیغمبر پر نازل ہونے والی آخری کتاب ہے یہی وجہ ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کو اپنے ذمہ لیا ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ۔ (حجر۔ ۹)	ہم ہی نے اس ذکر (یعنی قرآن) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اسی طرح فرمایا:

وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ۔ (فصلت ۴۱۔ ۴۲)	یہ ایک زبردست کتاب ہے، باطل اس پر نہ اس کے سامنے سے آسکتا ہے، نہ اس کے پیچھے سے یہ اتاری گئی ہے اس ذات کی طرف سے جو سراپا حکمت اور تمام خوبیوں کا محور ہے۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ قرآن کو نازل ہوئے چودہ سو سال کا زمانہ بیت گیا لیکن جس صورت میں وہ نازل ہوا اس میں آج تک سرِ مو فرق نہیں آیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جس طرح لوگوں تک پہنچایا، صحابہ کرامؓ نے اسے جس طرح اخذ کیا۔ اور اس کے بعد بھی لوگوں تک جس طرح نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا رہا کہ سینوں نے اسے محفوظ رکھا، زبانوں سے اس کا ورد ہوتا رہا، مصاحف میں اس کو لکھا گیا اور ہزاروں مسلمان اسے ازبر سناتے رہے یہاں تک کہ بچے اور وہ عجمی لوگ بھی جو اس کی زبان سے یکسر ناآشنا ہیں۔ وہ اس حقیقت کا ایک زندہ ثبوت ہے۔

داعی کے لئے لازم ہے کہ وہ قرآن کا اسی جذبے اور اسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرے کہ یہ وہ کتاب ہے جو ہر زمانے کے لئے ہے۔ پس اسے کسی خاص زمانے کے رجحان کے مطابق ڈھالنا اور کسی خاص نسل کے افکار کے چوکھٹے میں فٹ کرنا کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔ اس لئے کہ رجحانات بدلتے رہتے ہیں، اور افکار میں تغیر واقع ہوتا رہتا ہے۔ پس زمانہ گذرتا رہے گا۔ اور نسلیں آتی جاتی رہیں گی، لیکن اللہ کی کتاب اسی طرح زندۂ جاوید باقی رہے گی، جیسا کہ اللہ نے اسے نازل کیا ہے۔

۵۔ جامعیت قرآن کی پانچویں خاصیت اس کی جامعیت ہے پس جس طرح وہ ایک ایسی کتاب ہے جو ہر زمانے کے لئے ہے اسی طرح وہ ایسی کتاب ہے

جو دین کو پوری زندگی پر حاوی قرار دیتی ہے۔ عقائد کا معاملہ ہو یا دینی شعائر اور اخلاق و آداب کا ان تمام دائروں میں وہ خدائی رہنمائی اور الٰہی نقطۂ نظر کے اصولوں کو سمیٹے ہوئے ہے جس طرح کہ مثلاً وہ عبادات، انسانی معاملات، خاندان کے مسائل اور سماج کے تعلقات کے سلسلے میں خدائی قانون کے اصولوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ بلا لحاظ اس کے کہ سماج کے تعلقات چھوٹے دائرے سے تعلق رکھتے ہیں یا بڑے دائرے سے علاقائی سطح کی بات ہے یا بین الاقوامی سطح کی۔ یہاں تک کہ قرآن کی سب سے طویل آیت جو نازل ہوئی تو اس کا تعلق بھی انسان کی اجتماعی زندگی کے ایک مسئلہ سے ہے یعنی آیت دین جس میں آپسی قرضوں کو لکھ لینے کی تاکید کی گئی ہے۔

اس کے ساتھ ہی وہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی مخاطب پوری انسانیت ہے اور وہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں سے بحث کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے تمام انسانوں کے لئے دستور العمل بنا کے بھیجا ہے۔ اور دنیا جہاں کے لوگ اس کے مخاطب ہیں۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ (بقرہ - ۱۸۵)	رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا۔ جو ہدایت بنا کر بھیجا گیا ہے تمام انسانوں کے لئے۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں راہ بتانے کو اور یہ (حق و باطل کے درمیان) فیصلہ کرنے والا ہے۔

اسی طرح فرمایا:

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ (تکویر - ۲۷)	یہ (قرآن) تمام دنیا والوں کے لئے یاد دہانی ہے۔

پس یہ کوئی ایسی کتاب نہیں جو کسی ایک قوم کے لئے ہو کسی ایک ملک کے رہنے والوں کے لئے مخصوص ہو، یا مخصوص طور پر کسی ایک گروہ انسانیت کے لئے ہو۔

پھر ایسا بھی نہیں کہ اس کے مخاطب صرف عقلیت پسند لوگ ہوں۔ جذبات سے پر انسانوں کے لئے اس میں کوئی حصّہ نہ ہو، اس کا روئے سخن صرف روحانیت پسندوں کی طرف ہو مادہ پرستوں سے اس کو کوئی سروکار نہ ہو۔ اس کا مرکز توجہ صرف حکام ہو، محکوموں کی طرف یہ نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھتی ہو یہی بات اس کی برعکس تمام صورتوں کے لئے بھی صادق آتی ہے۔ اسی طرح ایسا بھی نہیں کہ یہ کتاب صرف مالداروں کے مسائل سے بحث کرتی ہو، غریبوں اور ناداروں کے مسائل سے کوئی تعرض نہ کرتی ہو۔ اور ایسا بھی نہیں کہ اس کی تمامتر توجہ غریبوں اور ناداروں کی طرف مرکوز ہو، مالداروں کی طرف سے یکسر اغماض برتتی ہو۔ نہیں! بلکہ یہ کتاب تمام انسانوں کے لئے ہے۔ اور تمام انسانوں کے لئے یکساں دستور العمل ہونے کی حیثیت رکھتی ہے۔

پس قرآن ایک مکمل اور ہمہ گیر دستور العمل ہے۔ اس کے نازل کرنے والے رب کائنات نے اس کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ یہ انسانی زندگی کی تمام گتھیوں کو سلجھانے والی ہے۔ ذاتِ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے:

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ۔ (نحل - ۸۹)	اور ہم نے آپ پر اس کتاب کو اتارا ہے جو ہر چیز کو کھول کر بتانے والی ہے اور یہ راہ دکھانے والی سراپا رحمت اور بشارت ہے اہل ایمان کے لئے

کتاب اللہ کی اسی جامعیت و ہمہ گیری کے پیشِ نظر خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ فرمایا کرتے تھے کہ "اگر اونٹ کا ایک بندھن بھی مجھ سے ضائع ہو جائے تو میں اسے کتاب اللہ میں ڈھونڈھ نکالوں گا"۔ لَوْ ضَاعَ مِنِّي عِقَالُ بَعِيرٍ لَوَجَدْتُهُ فِي كِتَابِ اللهِ۔[1]

[1] غالباً اس مقام پر مصنف محترم سے سہو ہو گیا ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے یہ قول حضرت عبداللہ بن عباسؓ (بقیہ ۳۸ پر)

اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو صرف عقائد و عبادات کی تشریح کے لئے نہیں اُتارا ہے کہ اس کا تعلق تمام تر عالم بالا سے ہو کر رہ جائے۔ اسی طرح وہ صرف آداب و فضائل کے بیان کے لئے نہیں آئی ہے کہ اخلاقیات کی فہرست میں ایک مزید کتاب کا اضافہ کردے۔ پھر صرف قانون و ضابطے کی وضاحت بھی اس کا موضوع نہیں جس کی بنا پر وہ صرف قانون (Law) کی کتاب بن کے رہ جائے۔ نہیں بلکہ وہ ایک ایسی کتاب ہے جو بیک وقت ان تمام چیزوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ اس سے بھی بلند تر ایک چیز ہے۔ ایک بالکل اچھوتے اسلوب کی حامل کتاب جو حد درجہ عجیب و غریب انداز میں اپنی باتیں پیش کرتی ہے۔

سورۂ بقرہ کی صرف درج ذیل دو آیتوں کو پڑھیے:

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا ، وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ پہنچ جائیں اپنی مدت (یعنی عدت) کو تو یا تو انھیں اپنے پاس رکھو بھلے طریقے سے یا انھیں جانے دو بھلے طریقے سے۔ اور انھیں روک کر نہ رکھو نقصان پہنچانے کو کہ ان پر زیادتیاں کرو۔ اور جو کوئی ایسا کرے گا تو اس نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اللہ کی آیتوں کو مذاق نہ بناؤ۔ اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کے احسان کو اور اس بات کو اس نے تمہارے

(حاشیہ ص ۳۷ کا) کا نقل کیا ہے: لو ضاع لی عقال بعیر لوجدته فی کتاب اللّٰہ۔ ملاحظہ ہو: اتقان: ۱۲۶/۲ (مترجم)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۔ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ مِنكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ، ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۔

(آیات۔ ۲۳۱-۲۳۲)

پاس کتاب اور حکمت اتاری تم کو نصیحت کرنے کو۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ پہنچ جائیں اپنی مدت (یعنی عدت) کو تو انھیں نہ روکو اس سے کہ وہ نکاح کر سکیں اپنے شوہروں سے جبکہ وہ اس کے لئے باہم رضامند ہو جائیں معروف طریقے سے۔ یہ نصیحت کی جاتی ہے تم میں سے اسے جو ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔ یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزگی اور ستھرائی کا باعث ہے۔ اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے ہو۔

سوچیے کیا کوئی انسان ایسی دو آیتیں پیش کر سکتا ہے؟ کیسی عجیب و غریب ہیں یہ آیتیں۔ کہ ان کے اندر بیک وقت خاندانی زندگی سے متعلق ضابطہ بندی بھی موجود ہے، ذہن و فکر کی ترتیب کا سامان بھی ہے اور اخلاقی و رُوحانی ہدایات بھی ہیں۔ پھر اللہ اور آخرت کے دن کی یاد دہانی بھی ہے اور آخر میں یہ تنبیہہ بھی کہ اللہ ہی سب کچھ جاننے والا ہے، انسان کچھ نہیں جانتا ہے۔

آپ ان آیتوں کے متعلق کیا کہیں گے۔ ان کا تعلق انسانی زندگی کی ضابطہ بندی سے ہے۔ یا انسان کی تربیت اور اس کی ذہن سازی سے۔ یہ عقائد کے بیان میں ہیں یا آداب زندگی کی ترجمانی کرتی ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام ہی باتیں بیک وقت ان میں موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو صرف عقائد و عبادات کی تشریح کے لئے نہیں آتارا ہے۔ کہ اس کا تعلق تمام تر عالم بالا سے ہو کر رہ جائے۔ اسی طرح وہ صرف آداب و فضائل کے بیان کے لئے نہیں آئی ہے کہ اخلاقیات کی فہرست میں ایک مزید کتاب کا اضافہ کردے۔ پھر صرف قانون وضابطے کی وضاحت بھی اس کا موضوع نہیں جس کی بنا پر وہ صرف قانون (Law) کی کتاب بن کے رہ جائے۔ نہیں بلکہ وہ ایک ایسی کتاب ہے جو بیک وقت ان تمام چیزوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ اس سے بھی بلند تر ایک چیز ہے۔ ایک بالکل اچھوتے اسلوب کی حامل کتاب جو حد درجہ عجیب و غریب انداز میں اپنی باتیں پیش کرتی ہے۔

سورۂ بقرہ کی صرف درج ذیل دو آیتوں کو پڑھیے:

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ	اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ پہنچ جائیں اپنی مدت (یعنی عدت) کو تو یا تو انھیں اپنے پاس رکھو بھلے طریقے سے یا انھیں جانے دو بھلے طریقے سے۔ اور انھیں روک کر نہ رکھو نقصان پہنچانے کو کہ ان پر زیادتیاں کرو۔ اور جو کوئی ایسا کرے گا تو اس نے اپنے اوپر ظلم کیا اور اللہ کی آیتوں کو مذاق نہ بناؤ۔ اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کے احسان کو اور اس بات کو اس نے تمہارے

(حاشیہ ص۳۷ کا) کا نقل کیا ہے: لوضاع لی عقال بعیر لوجدته فی کتاب اللّٰہ۔ ملاحظہ ہو: اتقان: ۲/۱۲۶ (مترجم)

وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۔ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ ۗ ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ مِنكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۔ (آیات ۲۳۱۔۲۳۲)	پاس کتاب اور حکمت آتاری تم کو نصیحت کرنے کو۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ پہنچ جائیں اپنی مدت (یعنی عدت) کو تو انھیں نہ روکو اس سے کہ وہ نکاح کر سکیں اپنے شوہروں سے جبکہ وہ اس کے لئے باہم رضامند ہو جائیں معروف طریقے سے۔ یہ نصیحت کی جاتی ہے تم میں سے اسے جو ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔ یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزگی اور ستھرائی کا باعث ہے۔ اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے ہو۔

سوچیے کیا کوئی انسان ایسی دو آیتیں پیش کر سکتا ہے؟ کیسی عجیب و غریب ہیں یہ آیتیں۔ کہ ان کے اندر بیک وقت خاندانی زندگی سے متعلق ضابطہ بندی بھی موجود ہے، ذہن و فکر کی ترتیب کا سامان بھی ہے اور اخلاقی و روحانی ہدایات بھی ہیں۔ پھر اللہ اور آخرت کے دن کی یاد دہانی بھی ہے اور آخر میں یہ تنبیہ بھی کہ اللہ ہی سب کچھ جاننے والا ہے، انسان کچھ نہیں جانتا ہے۔

آپ ان آیتوں کے متعلق کیا کہیں گے۔ ان کا تعلق انسانی زندگی کی ضابطہ بندی سے ہے۔ یا انسان کی تربیت اور اس کی ذہن سازی سے۔ یہ عقائد کے بیان میں ہیں یا آداب زندگی کی ترجمانی کرتی ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام ہی باتیں بیک وقت ان میں موجود ہیں۔

قرآن کی جامعیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ صرف عقل یا صرف قلب کو خطاب نہیں کرتا۔ بلکہ پورے انسانی وجود کو مخاطب قرار دیتا ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں عقل کو مطمئن کرتا ہے اور قلب انسانی میں حرارت اور گرمی بھی پیدا کرتا ہے قرآن کریم کی ایک آیت ہے :

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ۔ (الانفطار ۶-۸)

اے انسان ! تجھے کس چیز نے بہکایا اپنے کریم رب سے جس نے تجھے پیدا کیا۔ پھر تجھے ٹھیک ٹھاک کیا، پھر تجھے برابر کیا جس صورت میں چاہا تجھے جوڑ دیا۔

اسے پڑھ کر یا سن کر انسان محسوس کرتا ہے کہ یہ اس کے پورے وجود کو مخاطب قرار دیتی ہے۔ اس کی عقل کو بھی، اس کے وجدان کو بھی اور اس کی روح کو بھی۔ وہ صرف انسان کے قلب وضمیر ہی کو مخاطب کرنے پر اکتفا نہیں کرتی جیسا کہ قرآن سے قبل مذہبی و دینی کتابوں کا انداز ہے اور نہ صرف اس کے عقل و فکر کو خطاب کرتی ہے جیسا کہ ہمیں فلسفے کی کتابوں میں نظر آتا ہے، خواہ یہ فلسفۂ قدیم ہو یا فلسفۂ جدید۔ قرآن اس کے برعکس پوری انسانی شخصیت کو مخاطب قرار دیتا ہے۔ تاکہ وہ اپنے پورے وجود اور اپنی جملہ خصوصیات کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہو سکے۔

استاذ عباس عقاد مرحوم رقمطراز ہیں :

" اسلام عقل کو خطاب کرتا ہے، وہ صرف ضمیر و وجدان کو خطاب کرنے پر اکتفا نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک عقل کی روشنی میں غور و فکر کے نتیجے ہی میں انسانی ضمیر حقیقت تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اور دراصل تفکر و تدبر ہی وہ

واحد خزانہ ہے جہاں سے انسان کو ایمان کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُم بِوَاحِدَةٍ ۖ أَن تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا۔ (سبا - ۴۶)

(اے نبی) کہہ دو ! میں تمہیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں، یہ کہ تم کھڑے ہو اللہ کے لئے دو دو اور ایک ایک کر کے، پھر غور کرو۔

نیز فرمایا :

كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ۔ (بقرہ - ۲۱۹)

اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ تاکہ تم غور کرو۔

" عقائد کی دنیا میں اس سے بڑھ کر کسی وسعت و جامعیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کی پوری شخصیت کو مخاطب قرار دیا جائے۔ اس کی روح وجسم اور عقل و ضمیر ہر ایک سے خطاب کیا جائے۔ اور انسان کی جملہ قوتوں اور صلاحیتوں میں کسی کے ساتھ کسی قسم کا بخل اور کسی قسم کی حق تلفی کو روا نہ رکھا جائے "۔ [1]

اسی طرح ایسا بھی نہیں کہ اسلام کسی ایک نقطۂ نظر اور کسی مخصوص نفسیات کے حامل لوگوں سے تو خطاب کرتا ہو لیکن اس سے مختلف نقطہائے نظر کے حامل افراد و جماعت سے اپنی نگاہیں پھیرے رکھتا ہو۔

نہیں، بلکہ وہ انسانوں کے ہر طبقے اور ان کے ہر گروہ سے خطاب کرتا ہے اور معقول و متوازن نقطۂ نظر کے حامل تمام انسانوں کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔

الف۔ جو شخص حقائق کو عقلی انداز میں سمجھنے کا خواہش مند ہے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن اسے

[1] ملاحظہ ہو موصوف کی کتاب : حقائق الاسلام و اباطیل خصومہ ص ۲۴ طبع اول

پوری طرح مطمئن کرتا ہے۔ اور یہ چیز اس کے ذہن و دماغ میں بالکل گھر کر جاتی ہے
جب وہ سنتا ہے کہ قرآن اسے پکار پکار کر فکر و نظر کی دعوت دے رہا ہے۔ اور اسے اس
چیز سے ڈرا رہا ہے کہ وہ ظن و تخمین کے راستے پر چلے، اپنی لگام خواہش نفس کے ہاتھوں
میں دیدے اور خاندان اور سماج کی روایتوں کا اسیر بنا رہے۔ اس کے برعکس اس سے
اس کا مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف اور صرف دلائل پر اعتماد کرے۔

قرآن انسانی عقل و فہم کو کس اہمیت کی نظر سے دیکھتا ہے اس کا اندازہ
اس سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف لفظ 'عقل' سے نکلنے والے مختلف مشتقات مثلاً
'یعقلون' اور 'تعقلون' وغیرہ قرآن میں اٹھاون ۵۸ مقامات پر استعمال ہوئے ہیں۔ اسی
طرح لفظ 'فکر' سے نکلنے والے مشتقات سترہ ۱۷ مرتبہ اور لفظ 'الباب' لُب کی جمع بمعنی عقل
سولہ ۱۶ مقامات پر آیا ہے۔

قرآن کی وہ بے شمار آیات اس پر مستزاد ہیں جن میں اس کے ہم معنی دوسرے بہت
سے الفاظ اور مشتقات استعمال ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر 'نظر' 'اعتبار' 'تدبر' 'حجت'
'برہان'، 'نُہیٰ'، جمع نہیہ بمعنی عقل وغیرہ۔ حقائق کو علمی انداز میں سمجھنے کے خواہش مند
تشنگان علم کسی بھی مذہبی کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیں قرآن کے علاوہ یہ
رنگ انھیں کہیں اور نہیں مل سکتا۔

ب ۔ اسی طرح روحانی حقائق کا جویا قرآن کے اندر اپنے ذوق کی تسکین اور اپنے
وجدان کی غذا کا پورا سامان پاتا ہے۔ روحانیت کی دنیا میں جتنی دور تک جانے اور
جس قدر اندر جھانکنے کی اسے طلب ہوتی ہے قرآن اس کی سیری کے لئے بھرپور غذا
فراہم کرتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ایک بندۂ صالح کا جو قصہ قرآن میں آیا ہے

وہ انسان کو روحانیت کے اسی اتھاہ سمندر کی طرف لے جاتا ہے۔

فرمایا ؛

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا۔ (کہف - ۶۵)

پھر وہ دونوں ملے ہمارے ایک (خاص) بندے سے جسے ہم نے اپنی طرف سے ایک (خاص) رحمت دی تھی، اور اپنی طرف سے ایک (خاص) علم سکھایا تھا۔

ج ۔ اسی طرح اخلاقی قدروں کا دلدادہ شخص قرآن کے اندر اپنے گوہر مقصود کو پالیتا
ہے۔ اخلاق کا موضوع انسانی زندگی میں ہمہ جہتی 'بھلائی' کا حصول ہے قرآن اس 'بھلائی'
کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے جس طرح کہ وہ ہمارے لئے 'راہ حق' کی نشاندہی کرتا ہے۔
قرآن ایک مسلمان کو اپنی زندگی میں جس سہ گانہ مہم کو سر کرنے کی تلقین کرتا ہے ان میں سے
ایک یہ 'بھلائی کا کام' بھی ہے۔ جیسا کہ فرمایا ؛

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ (حج - ۷۷)

اے ایمان والو! رکوع کرو، سجدے کرو، اپنے رب کی بندگی کرو اور بھلائی (کے کام) کرو، شاید کہ تم فلاح یاب ہو۔

اور صرف یہی نہیں کہ وہ ایک مسلمان کو 'بھلائی کے کام' کی تلقین کرتا ہے بلکہ
آگے بڑھ کر اس سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو اس 'بھلائی' کی طرف
بلانے کا فرض انجام دے۔ جیسا کہ آیت کریمہ ؛

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ

اور چاہئے کہ تم میں ایک جماعت ہو جو نیکی کی طرف بلائے، بھلائی کا حکم دے اور برائی

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ (آلعمران - ۱۰۴) سے منع کرے ۔

سے واضح ہے ۔

غرضیکہ اخلاق کا موضوع قرآن میں کافی پھیلا ہوا ہے جس کی تفصیل اس مقام پر ہم پیش نہیں کر سکتے ۔ اس کے لئے ہم قارئین کو ڈاکٹر محمد عبداللہ دراز کی کتاب 'دستور الاخلاق فی القرآن' کے مطالعے کا مشورہ دیں گے ۔

د ۔ اسی طرح جو لوگ جمالیاتی قدروں کے رسیا ہیں قرآن اپنے اندر ان کی جمالیاتی حس کی تسکین کا بھی پورا سامان رکھتا ہے جس سے ان کا فنی شعور بھرپور غذا حاصل کر سکتا ہے ۔ جمال فطرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے لئے اسی مقصد کی خاطر وہ لوگوں کی نگاہوں کو ان کی طرف متوجہ کرتا ہے ۔ جیسا کہ فرمایا :

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ ۔ (حجر - ۱۶) اور ہم نے آسمان میں برج بنائے ہیں اور انھیں خوب آراستہ کیا ہے دیکھنے والوں کے لئے

اسی طرح ستاروں کے سلسلے میں ارشاد ہوا :

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ (ملک - ۵) اور ہم نے قریبی آسمان کو چراغوں (یعنی تاروں) سے آراستہ کیا ہے ۔

نباتاتی جمال کی طرف آیت ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے :

(۱) وَأَنْبَتْنَا فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۔ (ق - ۷) اور ہم نے اس زمین میں طرح طرح کے پودے لگائے جو ایک سے ایک بڑھ کر رونق دار اور خوشنما ہیں ۔

(۲) فَأَنْبَتْنَا بِهِ حَدَائِقَ ذَاتَ پھر ہم نے اس (پانی) سے باغ اگائے جو بارونق

بَهْجَةٍ ۔ (نمل - ۶۰) اور خوشنما ہیں ۔

اسی طرح حیواناتی جمال کی نمائندگی ہمیں آیت ذیل میں ملتی ہے :

وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ۔ (نحل - ۶) اور تمہارے لئے ان (جانوروں) میں رونق کا سامان ہے جب تم انھیں شام کو پھیر کر لاتے ہو اور جب چراتے ہو ۔

انسانی جمال کو دیکھنا ہو تو درج ذیل آیت کو پڑھئے :

وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۔ (تغابن - ۳) اور اس نے تمہاری صورتیں بنائیں پس کیا خوب صورتیں بنائیں ۔

یہ تو خیر ان مختلف اشیاء کے جمال کی طرف الگ الگ توجہ دلادی ۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ خدا کی ہر تخلیق حسن وجمال کا شاہکار ہے :

صُنْعَ اللَّهِ الَّذِي أَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۔ (نمل - ۸۸) یہ اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو خوب سے خوب تر بنایا ہے ۔

ان حقائق کے بیان کے سلسلے میں قرآن جو حسین ترین اور معجز نما اسلوب اختیار کرتا ہے اور اپنے مضمون کی بلندی سے قطع نظر اس کی ہیئت ترکیبی میں جو دلکشی اور رعنائی پائی جاتی ہے وہ اس پر مستزاد ہے ۔

مطالعہ قرآن داعی کے لئے اہم ہدایات | اس مقام پر ہیں داعی کے لئے جو قرآن کی معیت میں زندہ رہنا چاہتا ہے ، تاکہ اپنے قلب کے لئے غذا فراہم کرے ، اپنی عقل کے لئے روشنی حاصل کرے ، اپنی روح کے لئے بالیدگی کا سامان کرے اور پھر دوسروں کو بھی اس غذا ، اس روشنی اور اس بالیدگی سے فیض یاب کرے ، ایسے

داعی کی توجہ میں چند امور کی طرف مبذول کرانی چاہتا ہوں۔

آیات کی جمع و ترتیب داعی کو چاہیے کہ جب بھی وہ کسی موضوع سے متعلق گفتگو کرنی چاہے، خواہ وہ لکچر یا درس کی صورت میں ہو یا تقریر و تحریر کی صورت میں، تو اس سے تعلق رکھنے والی آیات قرآنی کو جمع کرے اور اپنے حسب منشا اس میں ایک ترتیب قائم کرے، تاکہ اس موضوع سے متعلق وہ قرآن کے نقطۂ نظر کو پوری طرح واضح کر سکے۔

آیات کے اس انتخاب کے سلسلے میں داعی کو دو پہلوؤں سے نظر ڈالنی چاہیے:

۱۔ کچھ تو قرآن کے الفاظ ہوں گے جو اس موضوع سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ یہ ضرورت بڑی حد تک الفاظ قرآن کے معاجم سے پوری کی جا سکتی ہے، خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جنھیں قرآن کریم حفظ نہ ہو۔

۲۔ دوسرے یہ کہ الفاظ سے قطع نظر اس موضوع سے متعلق کیا کیا باتیں اور کہاں کہاں کہی گئی ہیں۔ اس کے لیے بڑی سوجھ بوجھ، ذہانت اور اعلیٰ درجے کی قوت استنباط درکار ہے کہ آدمی پتہ لگا سکے کہ اس موضوع سے متعلق کیا کیا باتیں کہاں کہاں کہی گئی ہیں۔ اگرچہ وہ متعین لفظوں کے ساتھ مذکور نہ ہوں۔

ان دونوں ہی دائروں میں اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ آدمی حسن تقسیم اور حسن ترتیب سے کام لے۔ جس سے موضوع کے خدوخال اچھی طرح نمایاں ہو جائیں۔ اس کی خصوصیات و امتیازات ابھر کے سامنے آ جائیں۔ اور مضمون کا مقصد و مدعا اچھی طرح واضح ہو جائے۔

اس بات کو ہم ایک مثال کے ذریعہ واضح کریں گے جس سے شاید بات اچھی طرح سمجھ میں آ سکے گی۔ "قرآن اور علم" اسی موضوع کو لے لیجیے اگر ہم اس کے متعلق گفتگو کرنی

چاہیں تو ہمارے سامنے آیات قرآنی کا ایک نہ ٹوٹنے والا سلسلہ سامنے آئے گا جس کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ رہی ہوگی۔ اس مقام پر ہمیں اس طرح کی تمام آیتوں کو نقل کرنے کے بجائے حسن انتخاب سے کام لینا پڑے گا، اور انھیں ایک خاص ترتیب سے جمع کر کے مثال کے طور پر مندرجہ ذیل عنوانوں کے تحت تقسیم کرنا پڑے گا:

اہل علم ملائکہ کے ہم نشین ہیں:

یہ بات ہمیں قرآن حکیم کی درج ذیل آیت سے معلوم ہوتی ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَا لْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (آل عمران - ۱۸)	اللہ گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں اور فرشتے اور اہل علم بھی اس گواہی میں شریک ہیں، وہی فیصلہ کرنے والا ہے انصاف کے ساتھ

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنی یکتائی اور بے ہمسری پر استشہاد کرتے ہوئے سب سے پہلے تو اپنی گواہی پیش کی ہے اور دوسرے اور تیسرے نمبر پر ملائکہ اور اہل علم کی گواہی پیش کی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ جب 'اہل علم' 'ملائکہ' کے ساتھ اس گواہی میں شریک ہیں تو لازماً انھیں ان کی ہمنشینی کا شرف بھی حاصل ہے۔

علم حاملین علم کو غیروں کے مقابل اونچا اٹھا دیتا ہے:

اس کے سلسلے میں قرآن حکیم کی درج ذیل دو آیتیں پیش کی جا سکتی ہیں:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (زمر - ۹)	کہہ دو، کیا برابر ہو سکتے ہیں وہ جو علم والے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے۔

نیز:

یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (مجادلہ - ۱۱)	اللہ رتبوں میں بڑھائے گا ان کو جو تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم کی دولت عطا کی گئی۔

علم خشیت الٰہی کی اساس ہے :

اس حقیقت کو جاننے کے لئے قرآن کی اس آیت کو پڑھئے :

اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (فاطر - ۲۸)	اللہ سے اس کے بندوں میں سے بس وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔

ناواقف کے لئے لازم ہے کہ واقف کار کی پیروی کرے خواہ وہ اس سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو :

جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والد کو خطاب کر کے کہا تھا :

یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا۔ (مریم - ۴۳)	اے ابا جان! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا آپ میرے پیچھے چلیں میں آپ کی سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کروں گا۔

کبھی کبھی چھوٹا اس بات کا پتہ لگا لیتا ہے جس تک بڑے کی رسائی نہیں ہوتی :

حضرت سلیمانؑ اور ہدہد کے قصے میں ہمیں یہی بات نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس نے صاف کہہ دیا :

فَقَالَ اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ (نمل - ۲۲)	میں اس چیز کا پتہ کر لایا ہوں جو بالکل آپ کے علم میں نہیں اور میں آپ کے پاس ملک سبا سے ایک پکی خبر لے کر آیا ہوں۔

اسی طرح ہم ہابیل اور قابیل کے قصے میں دیکھتے ہیں کہ انسان ادنیٰ کوے سے

سیکھتا نظر آتا ہے :

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا یَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ لِیُرِیَهٗ كَیْفَ یُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِیْهِ قَالَ یٰوَیْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ۔ (مائدہ - ۳۱)	پس اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین میں (کچھ چھپانے کو) کھود رہا تھا تاکہ اسے (قابیل کو) دکھائے کہ کس طرح وہ اپنے بھائی (ہابیل) کی لاش کو چھپائے۔ (اس پر) وہ بول اٹھا: ہائے میری تباہی، کیا میں اس سے بھی قاصر رہا کہ اس کوے کے مانند ہوتا اور اپنے بھائی کی لاش کو چھپا سکتا۔ پھر وہ پچھتانے لگا۔

تعلیم ہر کسی کے رتبے کو بلند کرتی ہے خواہ وہ کتا ہی کیوں نہ ہو :

سدھائے ہوئے کتے کی نسبت قرآن کہتا ہے :

یَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَهُمْ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّیِّبٰتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِیْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ عَلَیْكُمْ (مائدہ - ۴)	یہ تم سے پوچھتے ہیں ان کے لئے کیا حلال ہے؛ کہہ دو تمہارے لئے ستھری چیزیں حلال ہیں۔ اور شکاری کتے جنھیں تم سدھاتے ہو دوڑانے کو، انھیں سکھاتے ہو کچھ اس میں سے جو اللہ نے تم کو سکھایا ہے، تو کھاؤ اس میں جو یہ روک رکھیں تمہارے لئے۔

جس سے پتہ چلتا ہے کہ سکھائے ہوئے کتے کو عام کتوں پر فوقیت حاصل ہے۔

مشکل مسائل کے سلسلے میں اہل علم کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے جیسا کہ سورۂ نحل میں ہے :

فَسْــَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (آیت - ۴۳)	پس پوچھو یاد رکھنے والوں سے اگر تم کو معلوم نہیں ہے۔

اسی طرح فرمایا :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ — اے ایمان والو ! کہا مانو اللہ کا اور کہا مانو رسول کا اور ان کا جو تم میں 'اولوالامر' ہیں ۔

(نساء ـ ۵۹)

'اولوالامر' کی تفسیر میں جہاں یہ بات کہی گئی ہے کہ اس سے مراد 'امراء' ہیں ۔ وہیں اس سے 'علماء' کو بھی مراد لیا گیا ہے ۔

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۔ (نساء ـ ۸۳) — اور اگر وہ اس کو (اپنے معاملے کو) لوٹاتے رسول کی طرف اور ان کی طرف جو ان میں 'اولوالامر' ہیں تو اس کا پتہ لگا لیتے یہ لوگ جو اس کی تہ میں اترنے والے ہیں ۔

اسی طرح قرآن کہتا ہے کہ جس شخص کی کسی شئی کے تمام پہلوؤں پر نظر ہوگی وہی بے کم وکاست اس کی حقیقت سے آگاہ کر سکے گا ۔ جیسا کہ فرمایا :

وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ ۔ (فاطر ـ ۱۴) — اور تمہیں کوئی اور آگاہ نہیں کر سکتا اس کے مانند جو پورا پورا باخبر ہو ۔

اور اسی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ واقف حال کے سوا دوسرے سے کوئی بات معلوم نہیں کرنی چاہئے ۔

فَاسْأَلْ بِهِ خَبِيرًا ۔ (فرقان ـ ۵۹) — پس معلوم کرو اس سے کہ جو پوری طرح باخبر ہے ۔

علم ایک ناپیدا کنار سمندر ہے :

آیت ذیل اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے :

وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا — اور تمہیں تو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے ۔

(اسراء ـ ۸۵)

انسان کے لئے علم میں ہر آن اضافہ مطلوب ہے :

اس دعا کی تعلیم کا یہی مقصد ہے :

وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا ۔ (طٰہٰ ـ ۱۱۴) — اور کہہ کہ پروردگارا مجھے علم میں بڑھائے جا ۔

اسی طرح قرآن اس حقیقت کا بھی اعلان کرتا ہے :

وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ ۔ (یوسف ـ ۷۶) — اور ہر واقف کار کے اوپر ایک بڑا واقف کار ہے

حضرات انبیاء علیہم السلام کو اپنے سے کمتر لوگوں سے علم کے حصول میں کوئی جھجک نہیں ہوتی ہے ۔

حضرت موسیٰ اور ان کے جوان کے قصے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے :

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِّنْ عِندِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَن تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ۔ (کہف ـ ۶۵) — پس انھوں نے پایا ہمارے ایک بندے کو جسے ہم نے اپنی طرف سے ایک (خاص) رحمت عطا کی تھی اور اسے اپنے پاس سے ایک (خاص) علم سے نوازا تھا ۔ موسیٰ نے اس سے کہا کیا میں تیرے پیچھے ہو لوں اس پر کہ تو مجھ کو سکھائے کچھ سمجھ کی بات جو تجھ کو سکھائی گئی ہے ۔

جبکہ معلوم ہے کہ اپنے زمانے میں کوئی دوسرا حضرت موسیٰ سے بڑھ کر نہ تھا ۔

علم کے جویا کے لئے سفر کے بغیر چارہ نہیں :

حضرت موسیٰؑ اور ان کے جوان کے اسی قصے میں مذکور ہے :

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوْتَهُمَا۔ (کہف - ۶۰)	اور جب کہا موسیٰ نے اپنے جوان سے کہ میں نہ رکوں گا جب تک پہنچ نہ جاؤں دو دریاؤں کے سنگم تک ورنہ زمانۂ دراز تک چلتا ہی رہوں گا۔ پس جب وہ دونوں پہنچ گئے ان کے سنگم تک تو بھول گئے اپنی مچھلی کو۔

آیت ذیل میں بھی اسی بات کی ترغیب دی گئی ہے :

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا۔ (حج - ۴۶)	کیا یہ چلے نہیں زمین میں جوان کے دل ہوتے جن سے یہ سمجھتے یا کان ہوتے جن سے یہ سنتے

اسی طرح علم کے موضوع سے تعلق رکھنے والے دوسرے پچاسوں گوشے ہیں جو قرآن میں زیر بحث آئے ہیں۔ قرآن کی معیت میں رہنے والا بڑی آسانی کے ساتھ انھیں اپنی گرفت میں لے سکتا ہے۔

قرآن پر غور کرنے والے اور اس میں مہارت بہم پہنچانے کے خواہش مند داعی کو چاہئے کہ اپنے لئے الگ سے ایک نوٹ بک یا رجسٹر بنالے جس میں اپنے غور و فکر کی روشنی میں قرآن سے کسبِ فیض کرتے ہوئے مختلف موضوعات تجویز کرے اور پھر اپنی فہم و بصیرت کے مطابق ان سے متعلق آیات کو جمع کرتا رہے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد وہ دیکھے گا کہ اس طرح دس بیس نہیں بلکہ سیکڑوں موضوعات سے متعلق اس کے پاس اچھا خاصا مواد اکٹھا ہو گیا ہے۔

اس جمع و ترتیب کے بعد معاملہ اسے تصنیفی صورت میں پیش کرنے کا رہتا ہے تو داعی کو چاہئے کہ حسب توفیق الٰہی اس مہم میں لگا رہے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد اسے اپنے پاس قرآنی علوم و معارف کا کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ نظر آئے گا۔ اسرار و حقائق کا ایک سمندر جو کبھی خشک ہونے کا نام نہ لے گا۔

قرآنی قصص و حکایات پر توجہ ایک دوسری چیز جس پر ایک داعی کو خاص طور پر توجہ دینے اور نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے وہ قرآن کے بیان کردہ قصص و حکایات ہیں تاکہ وہ ان میں پوشیدہ عبرت و موعظت اور اسرار و حکم کے بے پایاں سمندر سے اپنے کو سیراب کر سکے۔

ماضی کے ان قصوں اور واقعات کو بیان کرنے کا قرآن کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ ان کی تفصیلات کو ایک ایک کر کے گنائے کہ ان سے متعلق اشخاص کے نام کیا تھے، کن ملکوں اور کن خطوں میں یہ واقعات پیش آئے اور کن تاریخوں میں پیش آئے وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کو اصل دلچسپی اس سے ہے کہ عبرت و موعظت کے وہ کون سے نمایاں پہلو ہیں جو ان میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ تاریخ کی ان شخصیتوں کے کیا خد و خال تھے اور وہ کس مزاج و کردار کی حامل تھیں۔ نیز یہ کہ ان واقعات کے نتیجے میں حالات کا کیا رُخ سامنے آیا اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ غرض یہ کہ ان قصص و واقعات کو بیان کرنے سے قرآن کی اصل دلچسپی ان سے یہی عبرت و موعظت کا حصول ہے۔ جیسا کہ وہ خود کہتا ہے :

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ۔ (یوسف - ۱۱۱)	ان قوموں کے واقعات میں عبرت و نصیحت ہے سمجھ والوں کے لئے

ان واقعات کو بیان کرتے ہوئے قرآن ان کے بین السطور بے شمار علمی، فکری اور

قانونی اسرار و حقائق کو بھی کھولتا جاتا ہے تاکہ واقعات کی تفصیل کے ساتھ ساتھ یہ اسرار و حقائق بھی انسان کے ذہن و دماغ میں اترتے جائیں۔

مثال کے طور پر علم ہی کے سلسلے میں اگر ہم جاننا چاہیں کہ قرآن نظر میں اس کا کیا مقام ہے؟ تو اس کے لئے بے شمار آیتیں تو ہمیں وہ ملیں گی جن میں براہِ راست اسی موضوع کو بیان کیا گیا ہوگا، جیسا کہ اس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے لیکن ایسا بھی ہوگا کہ قرآن کے بیان کردہ بعض واقعات میں یہ چیز مزید ابھری ہوئی صورت میں ہمارے سامنے آئے گی۔ اگرچہ وہ وہاں براہِ راست لفظوں میں مذکور نہ ہوگی۔ اس کے لئے ہم مثال کے طور پر چار مقامات کی نشاندہی کر سکتے ہیں:

۱۔ پہلی مثال تو حضرت آدمؑ کے قصے کی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرشتوں سے فرمایا:۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً	میں زمین میں اپنا ایک جانشین بنانے والا ہوں

تو ابتداء میں فرشتوں کو اس پر تعجب سا ہوا، لیکن بعد میں جب انھوں نے دیکھا کہ خدائی امتحان میں آدمؑ کی علمی برتری ثابت ہوگئی ہے تو کچھ چوں و چرا کئے بغیر ان کی بڑائی کو تسلیم کرتے ہوئے انھوں نے حکم خداوندی کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا:

قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىٕهِمْ	اللہ نے کہا: اے آدم! انھیں (فرشتوں کو) بتا دو
فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىٕهِمْ قَالَ	ان کے نام تو جب اس نے انھیں بتا دیا ان کے
اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ	نام تو اللہ نے کہا کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اَعْلَمُ مَا	میں جانتا ہوں آسمان اور زمین کے بھیدوں
تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (بقرہ - ۳۳)	کو اور جانتا ہوں وہ کچھ جو تم ظاہر کرتے ہو اور

جو تم چھپاتے ہو۔

واقعہ کی اس تفصیل کے بین السطور قرآن نے اس حقیقت کی بھی نشاندہی کر دی کہ دراصل علم ہی وہ پہلا بنیادی وصف تھا جس کی بدولت انسان روئے زمین پر خلافت کی ذمہ داری اٹھانے کا اہل قرار پایا۔

۲۔ دوسری چیز ہمیں حضرت یوسفؑ کے قصے میں ملتی ہے کہ کس طرح انھوں نے ملک کے ایک بحرانی دور میں معاشی مسئلے کو حل کرنے کے لئے منصوبہ بندی اور پلاننگ کا طریقہ اختیار کیا۔ جیسا کہ اس پندرہ نکاتی منصوبے سے واضح ہے جسے حضرت یوسفؑ نے مصری حکومت کے سامنے پیش کیا تھا۔[1] آپ نے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنایا، اور مصر اور اس سے متصل علاقوں پر اس کے انتہائی صحت مند اثرات رونما ہوئے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ کسی بھی خطۂ ارضی کے معاشی مسئلے کو حل کرنے کے لئے منصوبہ بندی اور پلاننگ کی کیا اہمیت ہے؟ جبکہ ہمارے یہاں بہت سے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ پلاننگ اور منصوبہ بندی دینداری کے خلاف ہے۔ اور اس سے اللہ کی ذات پر اعتماد و توکل کی نفی ہوتی ہے۔

۳۔ تیسری مثال حضرت سلیمانؑ کے واقعے کی ہے جو بلقیس ملکۂ سبا کے ساتھ پیش آیا تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے دربار کے ایک آدمی نے پلک جھپکنے سے بھی کم وقفے کے اندر ملکۂ سبا کے تخت کو ان کے سامنے لاکر رکھ دیا۔ یہ کارنامہ بھی وہ ایک مخصوص علم کی بدولت ہی انجام دے سکا تھا جو اسے اللہ کی طرف سے حاصل تھا۔

---

[1] قرآن حکیم میں اس منصوبے کی تفصیل مذکور نہیں ہے۔ غالباً مصنف نے یہ بات تفسیری روایات کی روشنی میں کہی ہے۔ قرآن میں اس کا تذکرہ بہت ہی اجمالی صورت میں ہے۔ قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا (یوسف: ۴۷) البتہ نفس پلاننگ کی اہمیت کے سلسلے میں مصنف نے یہ اچھا نکتہ پیش کیا ہے۔ (مترجم)

قَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ (نمل - ۴۰)

بولا وہ جس کے پاس کتاب کا (خاص) علم تھا کہ میں اسے (تخت کو) تمہارے پاس لائے دیتا ہوں اس سے پہلے کہ تمہاری پلک جھپکے۔

جب کہ حضرت سلیمانؑ شام میں تھے اور بلقیس کے تخت کو یمن سے لانا تھا۔

۴۔ چوتھا واقعہ ذوالقرنین کا ہے کہ کس طرح اس نے پگھلے ہوئے تانبے کو ملا کر۔ لوہے کا عظیم بند تیار کر دیا۔ جبکہ جدید سائنس کی روشنی میں یہ بات آج معلوم ہوئی ہے کہ تانبے کی آمیزش سے لوہے کی قوت اور اس کی مضبوطی میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ذوالقرنین نے کہا تھا:

اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ انْفُخُوْا حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا قَالَ اٰتُوْنِیْۤ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا (کہف - ۹۶-۹۷)

مجھ کو پکڑا دو لوہے کے تختے یہاں تک کہ جب اس طرح برابر کر دیا پہاڑ کے دونوں دراڑوں تک تو کہا اس کو دھونکو یہاں تک کہ جب اس طرح اسے آگ کر دیا تو کہا لاؤ میں اس پر پگھلا ہوا تانبا ڈالوں گا۔ پس نہ توان (یاجوج ماجوج) کے لئے اس پر سے چڑھ آنا ممکن رہا اور نہ وہ اس میں سوراخ کرسکے۔

اسی طرح مثال کے طور پر اگر ہم جاننا چاہیں کہ قرآن کی نظر میں ایمان کا کیا مقام ہے تو ایسی دسیوں آیتیں ہمارے سامنے آئیں گی جن میں براہِ راست اس مسئلے پر گفتگو کی گئی ہوگی کہ ایمان کی حقیقت کیا ہے؛ نیز یہ کہ انسانی زندگی میں اس کے کیا اثرات رونما ہوتے ہیں۔ لیکن اسی حقیقت پر اگر ہم قرآن کے ذکر کردہ کچھ واقعات کی روشنی میں غور کرسکیں تو ایمان کی یہ اثر آفرینی ہمارے سامنے مزید گہرائی و گیرائی کے ساتھ سامنے آتی ہے۔

چنانچہ قرآن میں ہم یہ واقعہ دیکھتے ہیں کہ ایمان کے نشے سے سرشار ہونے کے بعد کچھ نوجوانوں کا کیا حال ہوجاتا ہے؟ اور ایمان کی یہ دولت انھیں عظمت و بلندی کے کس مقام پر فائز کر دیتی ہے۔ یہ بات ہمیں کہف کے نوجوانوں کے قصے میں ملتی ہے جس میں وہ محض اپنی قوت ایمانی کے بدولت منکرین خدا کے مقابلے میں سینہ سپر ہوجاتے ہیں۔ اور باغیوں اور سرکشوں کے ظلم و طغیان کو ذرہ برابر خاطر میں نہیں لاتے ہیں:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًی وَّرَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا هٰۤؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَوْلَا یَاْتُوْنَ عَلَیْهِمْ بِسُلْطٰنٍ بَیِّنٍ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا (کہف ۱۳-۱۵)

ہم تم کو ان (اصحاب کہف) کا واقعہ ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں۔ یہ کچھ نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور انھیں ہم نے ہدایت میں بڑھایا تھا۔ اور ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کیا جب یہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے کہ ہمارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے ہم تو اس کے سوا کسی اور کو معبود نہ پکاریں گے ورنہ ہم بہت بیجا بات کہیں گے۔ یہ ہماری قوم کے لوگ ہیں جنہوں نے اس کے سوا بہت سے معبود ٹھہرا لیے ہیں تو کیوں نہیں وہ اس پر کوئی واضح دلیل لاتے پھر اس شخص سے بڑھ کر گنہگار اور کون ہوسکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے۔

اسی طرح ہم قرآن میں ایمان کی دولت سے سرشار ایک عورت کا قصہ پڑھتے ہیں جس کا شوہر ایک گنہگار اور کافر ہی نہیں بلکہ غرور اور طاقت کے نشے میں چور اور جبر و تشدد میں اپنی مثال آپ ہے۔ یہ فرعون کی عورت کا واقعہ ہے جو اس کی طاقت

واقتدار کو ذرہ برابر خاطر میں نہیں لاتی۔ جو اس کے کسی وعدے کے دام میں پھنستی ہے، نہ اس کے کسی وعید سے اس کے پائے ثبات میں کوئی تزلزل آتا ہے،

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ، اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (تحریم۔ ۱۱)

اور اللہ نے مثال بیان کی ایمان والوں کے لئے فرعون کی بیوی کی جبکہ وہ عرض گذار ہوئی پروردگار! میرے لئے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا اور مجھے نجات دے فرعون سے اور اس کی بداعمالیوں سے اور مجھے نجات دے ظالم لوگوں سے۔

اسی طرح قرآن میں ہمیں کچھ ایسے لوگوں کا قصہ بھی ملتا ہے جن کی، ایمان کا مزہ چکھ لینے کے بعد بالکل کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ ایمان کی دولت مل جانے کے بعد ان کی شخصیت کا نقشہ یکسر بدل جاتا ہے۔ اور وہ ایک بالکل نیا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ ان کے اندر حیرت انگیز قسم کی نفسیاتی قوتیں ابھر آتی ہیں، ایمان کی دولت ملنے سے پہلے جن کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا۔ یہ فرعون کے جادوگروں کا قصہ ہے جن کے سامنے حضرت موسیٰؑ کے معجزات کو دیکھ کر حق بالکل روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے چنانچہ وہ آپ پر ایمان لاتے ہیں اور فرعون کی قوت وسطوت اور اس کی دھونس اور دھمکی کے جواب میں علی الاعلان اپنا چیلنج پیش کر دیتے ہیں۔ جس کی تفصیل قرآن ان لفظوں میں پیش کرتا ہے:

وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ . رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ

اور جادوگر سجدے میں گر پڑے۔ بولے ہم ایمان لائے جہان کے رب پر موسیٰ اور ہارون کے

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ، اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَآ اَهْلَهَا فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ . لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ . قَالُوْٓا اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ، رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ . (اعراف ۱۲۰۔ ۱۲۶)

رب پر۔ فرعون نے کہا: کیا تم اس پر ایمان لائے اس سے پہلے کہ میں تم کو اس کی اجازت دوں۔ بیشک یہ ایک چال ہے جو تم نے چلی ہے ملک میں تاکہ اس سے بے دخل کر دو اس کے رہنے والوں کو۔ تو عنقریب تم کو (اس کے انجام کا) پتہ لگ جائے گا۔ میں تمہارے ہاتھ کاٹوں گا اور دوسرے پاؤں پھر تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔ وہ بولے (کچھ حرج نہیں) ہم کو اپنے رب کی طرف جانا ہے تم ہم سے اس چیز کے سوا کس چیز کا بدلہ لیتے ہو کہ ہم اپنے رب کی آیتوں پر ایمان لائے جبکہ وہ ہمارے پاس پہنچیں۔ پروردگار! ہم پر صبر کا فیضان کر اور ہم کو (دنیا سے) مسلمان اٹھا۔

مخصوص نمونوں پر نگاہ داعی کو چاہیے کہ وہ اپنے کو قرآن کے پیش کردہ ان مخصوص نمونوں کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے، جو ہمارے سامنے انسانی شخصیت کی ایک بہت ہی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں کہ کس طرح انھوں نے زندگی کے ہر موڑ پر اور نازک سے نازک حالات میں اپنے اس اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا۔ اور نعمت و نقمت کے ہر دو مواقع پر اعتدال و توازن کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

ذیل میں ہم قرآن کے پیش کردہ ان مخصوص نمونوں کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

۱۔ ایک مثال ہمارے سامنے اس مالدار کی ہے جو (نظام کائنات پر اپنی غیر معمولی دسترس کے باوجود) اپنی زندگی میں شکر و سپاس کا پیکر ہے۔ یہ چیز ہمیں حضرت سلیمانؑ کی

شخصیت میں جلوہ گر نظر آتی ہے جو چیونٹی کی گفتگو کو سمجھ جانے کے بعد بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں؛

رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰى وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ۔ (نمل - ۱۹)	پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں شکر ادا کروں تیرے احسان کا جو تو نے کیا ہے مجھ پر اور میرے والدین پر اور اس کی کہ میں نیک کام کروں جو تجھے پسند ہوں۔

اسی طرح جب بلقیس ملکہ سبا کا تخت آپ کے سامنے لا کر رکھ دیا گیا تو شکر و سپاس میں ڈوبے ہوئے یہ کلمے بے اختیار آپ کی زبان پر آ گئے ؛

هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لِیَبْلُوَنِیْۤ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا یَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّیْ غَنِیٌّ كَرِیْمٌ ۔ (نمل - ۴۰)	یہ میرے رب کے فضل سے ہے تاکہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری اور جو شکر کرے گا تو اس کا یہ شکر کرنا اسی کے کام آئے گا۔ اور جو ناشکری کرے گا تو میرا رب بے نیاز ہے، اپنی ذات میں برتر۔

سورہ نمل آیات ۱۶ تا ۴۴ میں یہ قصّے بہ تفصیل مذکور ہیں۔

۲۔ اسی طرح کی ایک مثال اس حاکم یا عدل و انصاف کے پیکر اس بادشاہ کی ہے جسے اپنی لمبی چوڑی حکومت کی مصروفیات بھی اپنے رب کی عبادت اور اس کی مخلوق کی نگہداشت سے غافل نہیں ہونے دیتی ہیں۔ اس چیز کی نمائندگی ہمیں ذوالقرنین کی شخصیت میں ملتی ہے جو اپنی فتوحات کا پھریرا لئے مشرق و مغرب کے آخری کناروں تک پہنچ گیا۔ لیکن اس کے باوجود وہ عدل و انصاف کی لگام کو مضبوط تھامے رہا۔ خوب کاروں کو وہ ان کا واقعی صلہ دیتا۔ اور بدکرداروں اور زمین میں فساد پھیلانے والوں کو ان کے کیفر کردار تک پہنچاتا۔ اسی طرح اس نے انسانوں کی بھلائی کے لئے بڑی بڑی فصیلیں اور بڑے بڑے بند تعمیر کئے۔

جس کے سلسلے میں سب سے پہلے تو وہ اللہ کی مدد کا طالب ہوا اس کے بعد عوام الناس کی محنتوں اور کوششوں سے فائدہ اٹھایا لہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سورہ کہف کی آیات ۸۳ تا ۹۸۔

۳۔ ایک اور مثال اس شخص کی ہے جس پر ہر طرف سے مصائب و آلام کی یورش ہے، لیکن اس کی پیشانی پر ذرا شکن نہیں آتی ہے۔ اور وہ فیصلۂ خداوندی پر ہر طرح سے راضی اور مطمئن ہے۔ اس شخصیت کے نمائندے حضرت ایوب علیہ السلام ہیں جن کے متعلق قرآن صراحت کرتا ہے :

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ (صٓ - ۴۴)	ہم نے اس کو (بڑا) صبر کرنے والا پایا، بہت خوب بندہ (اپنے رب کی طرف) رجوع کرنے والا۔

قصّے کی تفصیل کے لیے دیکھیے : سورہ صٓ آیات ۴۱-۴۴

۴۔ ایک دوسرا نمونہ پاکبازی و پاک دامنی کے پیکر نوجوان کا ہے۔ جو اپنے جوانی کے بانکپن اور حسن و جمال کی رعنائی میں اپنی مثال آپ ہے۔ اور جسے ہر طرف سے بہلانے اور پھسلانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اور حالات ایسے ہیں کہ ایک فرشتہ صفت انسان بھی اپنے کو ان میں بمشکل ہی پھسلنے سے بچا سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنے کو اس طوفان سے بالکل بے غبار نکال لے جاتا ہے۔ صدق و صفا کے پیکر حضرت یوسفؑ کی دل آویز شخصیت کو دیکھیے جن کی داستان قرآن میں اس طرح مذکور ہے :

لہ قرآن حکیم میں تو صرف ایک ہی بند کا تذکرہ ملتا ہے لیکن اس سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ ذوالقرنین کو اس فن میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اپنی وسیع و عریض حکومت اور اپنی طویل فتوحات کے دوران دوسرے مقامات پر بھی اس نے اس طرح کی فصیلیں اور اس طرح کے بند تعمیر کئے ہوں گے۔ (مترجم)

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِي هُوَ فِي بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۔ الخ (یوسف ۲۳)

اور اسے پھسلانے لگی وہ عورت جس کے وہ گھر میں تھا کہ وہ اپنا جی تھام نہ سکے۔ اس نے (سب طرف سے) دروازے بند کر لئے۔ اور بولی: جلدی کر۔ اس نے کہا اللہ کی پناہ! وہ میرا مالک ہے۔ اس نے اچھی طرح رکھا ہے مجھ کو۔ بیشک بے انصاف کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

۵۔ ایک اور نمونہ اس جواں سال کا ہے جو حکمِ خداوندی کی تعمیل میں اپنا سب کچھ دینے کو تیار ہے۔ چنانچہ وہ اس راہ میں خدا کے حضور اپنی گردن کو بھی پیش کر دیتا ہے۔ یہ مثال حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کی ہے۔ جب وہ دوڑنے کی عمر کو پہنچ چکے ہیں۔ اس ضمن میں باپ اور بیٹے کی گفتگو کو قرآن ان لفظوں میں نقل کرتا ہے:

قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۔ الخ (صافات ۱۰۲)

اس نے (ابراہیم نے) کہا: بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھ کو ذبح کر رہا ہوں۔ اب بتا تیرا کیا خیال ہے؟ اس نے کہا: ابا جان! آپ کر ڈالیے وہ جس کا آپ کو حکم مل رہا ہے۔ اللہ نے چاہا تو آپ مجھے (اسے) سہارنے والا پائیں گے۔

۶۔ پھر ایک اور نمونہ اس مومن کامل کا بھی ہے جو بتقاضائے مصلحت اپنے ایمان کو چھپائے رکھتا ہے۔ لیکن جب وقت آجاتا ہے تو وہ اپنے ایمان کا برملا اعلان کر دیتا ہے۔ اور حق کی مدافعت اور باطل کا مقابلہ کرنے میں وہ وہ بالکل سینہ سپر ہو جاتا ہے وہ حکمت وموعظت کی راہ اپنا کر لوگوں کو سمجھانا چاہتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اس حقیقت کے لئے اس کا سینہ بالکل کھل گیا ہے۔ یہ مثال آلِ فرعون کے اس مومن کامل کی ہے جس کے ایمان

کی شہادت قرآن ان لفظوں میں پیش کرتا ہے:

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۔ الخ (غافر ۲۸)

اور آلِ فرعون میں سے ایک مردِ مومن جو اپنا ایمان چھپاتا تھا، بول اٹھا کہ کیا تم ایک شخص کو قتل کر دو گے اس پر کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔ جبکہ وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے کھلی نشانیاں لے کر آیا ہے۔

۷۔ پھر ایک نمونہ منصبِ رسالت کے حامل اس داعی کا ہے جسے بلا قصور جیل کی کوٹھری میں ڈال دیا جاتا ہے۔ لیکن اس کال کوٹھری کی تاریکی اور اس کی پریشانیاں اس سے اس کے فریضۂ دعوت کو فراموش نہیں ہونے دیتی ہیں۔ چنانچہ وہ اس موقعے کو بھی غنیمت خیال کرتا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو توحید ہی کا دلنواز پیغام سناتا، اور شرک وبت پرستی کے ناپاک لبادے کو اتار پھینکنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی دلاویز شخصیت کا مرقع ہے جو اپنی اس دعوت کو ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۔ الخ

اے جیل کے رفیقو! کیا بہت سارے معبود جدا جدا بہتر ہیں، یا اکیلا اللہ (سب پر) غالب۔

تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: یوسف آیات: ۳۷ تا ۴۰

۸۔ اسی طرح کا ایک نمونہ اس بیٹے کا ہے جسے ایمان کی دولت ملی ہوئی ہے لیکن اس کا باپ کافر ہے۔ وہ انتہائی نرمی اور محبت کے ساتھ اس کے سامنے اپنی دعوت کو پیش کرتا اور اس پیغام کو پہنچانے کا حق ادا کرنا چاہتا ہے۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کا اسوہ ہے جو اپنے باپ سے اس طرح خطاب کرتے ہیں:

يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا۔ الخ (مریم - ۴۲)

اے ابا جان! آپ کیوں بندگی کرتے ہیں اس چیز کی جو نہ سنتی ہے، نہ دیکھتی ہے اور نہ آپ کا کچھ کام بنا سکتی ہے۔

۹۔ اس کے برعکس دوسرا نمونہ اس باپ کا ہے جو خود تو دولت ایمانی سے آراستہ ہے لیکن اس کا بیٹا کافر ہے۔ باپ اسے ہر ممکن کوشش سے خدائی پکڑ سے بچانا چاہتا ہے لیکن بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ اپنی شفقت پدری سے مجبور ہو کر وہ اپنے رب کے حضور اس کے حق میں سفارش بھی کرتا ہے، اگرچہ اس کے جواب میں اسے عتاب الٰہی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ حضرت نوحؑ اور ان کے کافر بیٹے کی داستان ہے جس کی تفصیل ہمیں سورہ ہود آیات ۴۲ تا ۴۷ میں ملتی ہے۔

۱۰۔ اسی طرح کا ایک اور نمونہ اس مثالی مومن عورت کا ہے جس کا شوہر نہ صرف یہ کہ کافر بلکہ انتہائی سرپھرا اور مغرور بلکہ خدائی کا مدعی بھی ہے۔ یہ فرعون کی بیوی آسیہ کا قصہ ہے جبکہ وہ بدترین قسم کا جابر و سرکش ہے جس نے اپنی پوری سلطنت میں اپنی خدائی کا اعلان کر رکھا ہے۔ لیکن نہ تو اس کی حکومت و سلطنت اس خاتون کو اپنے دام میں پھنسانے میں کامیاب ہو پاتی ہے۔ نہ وہ اس کی قوت و سطوت کے آگے ذرہ برابر خوف زدہ ہوتی ہے۔ اور نہ اس کے ڈرانے دھمکانے کی وہ کوئی پروا کرتی ہے۔ وہ صرف اپنے رب سے دعا کرتی ہے اور اپنے کو اس کی پناہ میں دیدیتی ہے۔

رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ۔ (تحریم - ۱۱)

پروردگار! میرے لئے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا اور مجھے نجات دے فرعون سے اور اس کی بداعمالیوں سے اور مجھے نجات دے ظالم

لوگوں سے۔

۱۱۔ دوسرا نمونہ اس کافر عورت کا ہے جس کا شوہر مسلمان ہے۔ یہ حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کی مثال ہے جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّاخِلِينَ۔ (تحریم - ۱۰)

وہ دونوں ہمارے دو نیک بندوں کی زوجیت میں تھیں، پر انھوں نے ان کا حق ضائع کیا تو وہ دونوں اللہ کے روبرو ان کے کچھ کام نہ آسکے۔ اور (ان سے) کہہ دیا گیا کہ جاؤ جہنم میں اور جانے والوں کے ساتھ۔

۱۲۔ ایک اور نمونہ بھلے اور صلح پسند انسان کا ہے جو ظلم و سرکشی کا مقابلہ خوف خدا کے اسلحے سے کرتا ہے۔ وہ برائی کو بھلائی اور شر کو خیر سے دفع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ آدمؑ کے اس بیٹے کی شخصیت کا نمونہ ہے جس کا نام 'ہابیل' بتایا جاتا ہے۔ اس کا دوسرا بھائی 'قابیل' جب اسے قتل کی دھمکی دیتا ہے تو وہ اس کے جواب میں کہتا ہے۔

لَئِنْ بَسَطْتَ إِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِي مَا أَنَا بِبَاسِطٍ يَدِيَ إِلَيْكَ لِأَقْتُلَكَ إِنِّي أَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ إِنِّي أُرِيدُ أَنْ تَبُوءَ بِإِثْمِي وَإِثْمِكَ فَتَكُونَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ وَذٰلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ الخ (مائدہ - ۲۸ - ۲۹)

اگر تو مجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ اٹھائے تو میں تجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ اٹھانے والا نہیں، میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو سارے جہان کا مالک ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے گناہ کے ساتھ میرا گناہ بھی تو ہی سمیٹے اور جہنمیوں میں سے ہو جائے اور یہی سزا ہے بے انصافی کرنے والوں کی۔

۱۳۔ دوسری مثال اس شرپسند انسان کی ہے جو اپنے بھائی پر چڑھ دوڑتا ہے اور اس کے خون سے اپنے ہاتھ کو رنگین کر لیتا ہے حالانکہ وہ بالکل بے گناہ ہوتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے

اسے نہ تو اپنے دین و اخلاق کا کچھ پاس ہوتا ہے، نہ رشتۂ اخوت کا کچھ خیال آتا ہے۔ یہ آدم کے دوسرے بیٹے 'قابیل' کی مثال ہے۔ جو اپنے بالکل حقیقی بھائی کو قتل کرنے کے درپے ہوتا ہے۔ اور اس کے اس مثالی کردار کو دیکھنے کے باوجود اپنے ارادے پر کسی قسم کی نظرثانی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا بلکہ اپنے بھائی کے خون سے اپنے ہاتھ کو رنگین کرکے ہی دم لیتا ہے:

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ . الخ (مائدہ ـ ۳۰)

پس اس کے نفس نے اس کو راضی کر لیا بھائی کے قتل کے لئے سو اس نے اسے قتل کر دیا اور ہو گیا نقصان اٹھانے والوں میں سے۔

۱۴۔ پھر ایک مثال اس بزدل قوم کی ہے جو نا موافق حالات میں انتہا درجہ بے صبری کا مظاہرہ کرتی ہے۔ یہاں تک راہ فرار اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اپنے انبیاء کے تئیں سرکشی کی روش بھی اپنانے والی ہے۔ یہ قوم بنی اسرائیل ہے جیسے اس کے رسول اور نجات دہندہ حضرت موسیٰؑ نے جب ارض موعود میں داخل ہو جانے کا حکم دیا تو وہ انتہائی بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی ہمت نہ کر سکی۔ ان کے آپس کے اس سوال وجواب کو قرآن نے ان لفظوں میں نقل کیا ہے:

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ . قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ، وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ

اس نے کہا: اے میری قوم! داخل ہو اس پاک زمین میں جو اللہ نے لکھ دی ہے تم کو اور اُلٹے نہ پھرو پیٹھ دکھا کر کہ پھر گھاٹے میں جا پڑو۔ انھوں نے کہا: اے موسیٰ وہاں ایک زبردست لوگ ہیں اور ہم اس میں ہرگز داخل نہ ہوں گے یہاں تک

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ . قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ . (مائدہ ۲۱-۲۴)

کہ وہ اس سے نکل جائیں تو اگر وہ اس سے نکل جائیں تو ہم داخل ہوں گے۔ کہا دو آدمیوں نے، انہی ڈرنے والوں میں سے، جن پر خدا کی (خاص) نوازش تھی کہ ان پر حملہ کرکے پھاٹک میں گھس پڑو۔ پس اگر تم اس میں گھس پیٹھے تو تم ہی غالب ہو۔ اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم یقین رکھتے ہو۔ وہ بولے: اے موسیٰ! ہم اس میں ہرگز عمر بھر نہ جائیں گے جب تک کہ وہ اس میں ہیں۔ پس جاؤ تم اور تمہارا رب دونوں لڑو۔ ہم تو یہاں ہی بیٹھے رہیں گے۔

۱۵۔ دوسری مثال اس محروم امت کی ہے جو اللہ کی نعمتوں کی قدردانی نہیں کرتی۔ اور انعامات کی اس بارش پر اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے اس کی ناشکری کی راہ اختیار کرتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے یہ نعمتیں چھین لی جاتی ہیں۔ یہ مثال قوم سبا کی ہے جس کی داستان قرآن ان لفظوں میں بیان کرتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ؕ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ . فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ

قوم سباء کے لئے ان کی بستی میں نشانی تھی، دو باغ دائیں اور بائیں سے۔ کھاؤ اپنے رب کی دی ہوئی روزی اور اس کا شکر ادا کرو۔ عمدہ اور پاکیزہ ملک ہے اور رب ہے بخشنے والا۔ لیکن انھوں نے دھیان نہ دیا۔ پس چھوڑ دیا ہم نے ان پر بند توڑ سیلاب اور ان دو باغوں

مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ۔ (سبا ۱۵ - ۱۷)

کے بدلے ہم نے انھیں دو دوسرے باغ دیئے جن میں تھے کچھ ایک کسیلے پھل اور جھاؤ اور کچھ تھوڑے سے بیر۔ یہ بدلہ ہم نے ان کو دیا اس پر کہ انھوں نے ناشکری کی۔ اور ایسا بدلہ تو ہم ناشکرے ہی کو دیتے ہیں۔

استدلال کی مشق اسی طرح داعی کو ایک دوسری بات کا اہتمام کرنا چاہئے بلکہ اس کے لئے پیہم اور شعوری کوشش کرنی چاہئے اور وہ یہ کہ وہ جو بات بھی کہنی چاہئے اور اس کے ذہن میں جو خیال ہو اور جو فکر بھی اس کے سامنے آئے اسے چاہئے کہ اپنے موقف کی تائید میں قرآنی آیات سے عمدہ سے عمدہ استدلال پیش کر سکے۔ اس لئے کہ جب اس کا استدلال براہِ راست قرآنی آیات سے ہوگا اور وہ انھیں ان کے واقعی مقام پر رکھ کر گفتگو کر رہا ہوگا تو پھر اس کے سلسلے میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہے گی اور اس پر کسی قسم کا اعتراض کرنا روا نہ ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس صورت میں وہ اپنے مخالف کو بالکل لاجواب کر دے گا۔ اس لئے کہ ظاہر بات ہے قرآن سے بڑھ کر کوئی دلیل ہو سکتی ہے، نہ کتاب اللہ کے بعد پھر کسی کلام کی گنجائش باقی رہتی ہے۔

۱۔ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا (نساء - ۸۷)

اور اللہ سے بڑھ کر سچی بات اور کس کی ہو سکتی ہے۔

۲۔ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۔ (نساء - ۱۲۲)

اور اللہ سے بڑھ کر اپنی بات میں سچا اور کون ہو سکتا ہے۔

اسی طرح دوسرے مقام پر فرمایا:

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۔ (مائدہ - ۵۰)

پس کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں تو اللہ سے اچھا فیصلہ اور کس کا ہو سکتا ہے ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھیں۔

اب بھلا کون مسلمان ہوگا جو صریح قرآنی آیات کو سن لینے کے بعد بھی کسی قیل و قال کو روا رکھے۔ وہ تو صاف طریقے پر اپنے کو 'آمنا و صدقنا' کہنے پر مجبور پائے گا۔ اس لئے کہ قرآن ایک مومن کی شان ہی یہ بیان کرتا ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۔ (احزاب - ۳۶)

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کا کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول کوئی فیصلہ کر دیں تو ان کو اپنے معاملے کا کوئی اختیار باقی رہے۔ اور جو کوئی نافرمانی کرے اللہ کی اور اس کے رسول کی تو وہ کھلے طور پر گمراہ ہوا۔

مشہور اموی خلیفہ مامون کے سامنے ایک واقعہ پیش آیا تھا جسے شاید اس سلسلے کی بہترین مثال قرار دیا جا سکے۔ ایک شخص مامون کے پاس آیا جو لوگوں میں چل پھر کر انھیں 'بھلائی' کا حکم کرتا اور 'برائی' سے منع کرتا تھا۔ جبکہ وہ خلیفہ کی طرف سے اس منصب کے لئے باقاعدہ مقرر نہیں کیا گیا تھا۔ مامون نے اس سے پوچھا: آخر تم 'امر بالمعروف' اور 'نہی عن المنکر' کا یہ کام کیوں کرنے لگے جبکہ اسے اللہ نے ہمارے ذمے ٹھہرایا ہے۔ اس لئے کہ قرآن کریم کی یہ آیت ہمیں ارباب اقتدار کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا

وہ کہ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار دیں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور بھلائی کا حکم دیں

بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ الآیہ — اور برائی سے منع کریں ۔

(حج - ۴۱)

اس شخص نے جواب دیا : بیشک امیرالمومنین ! آپ بالکل بجا فرماتے ہیں ۔ یہ صد فی صد درست ہے کہ سلطنت اور اقتدار اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کیا ہے اور اس مناسبت سے اس فریضے کی ادائیگی بھی آپ ہی کا منصب ہے ۔ البتہ ہم لوگ اس مہم میں آپ کے دست و بازو اور معاون و دمساز ہیں ۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جس کا انکار بس وہی شخص کر سکتا ہے جسے کتاب و سنت سے کوئی واسطہ نہ ہو ۔ اس لئے کہ قرآن تو صاف کہتا ہے کہ :

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ — اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار ہیں ، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں ۔ (توبہ - ۷۱)

اسی طرح رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضاً ۔ (متفق علیہ) — ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے عمارت کے مانند ہے جس کی ہر اینٹ دوسرے کو مضبوط کرتی ہے ۔

مامون اس شخص کے اس حسن استدلال کو دیکھ کر بالکل حیرت زدہ رہ گیا ۔ اور بیحد خوش ہوا ۔ اور اس سے کہہ دیا کہ : تم جیسا آدمی بیشک اس منصب کا اہل ہے ۔ پس جاؤ اور حسب سابق ' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ' کا فریضہ انجام دیتے رہو ۔ اور اسے ہماری طرف سے اس منصب کے لئے تقرر نامہ تصور کرو " ۔

آپ نے دیکھا کہ جب اس شخص نے خلیفہ کے بالمقابل قرآن و سنت سے زیادہ بہتر

استدلال پیش کیا تو وہ بالکل لاجواب ہو کر رہ گیا ۔ اور بالآخر اسے اس شخص کو یہ منصب تفویض کرنا پڑا ۔

اس کے برعکس ایک دوسری مثال ایک کم فہم واعظ کی ہے جس نے مامون کے پاس آتے ہی اسے جھاڑ تاڑ لگانی شروع کر دی ۔ مامون نے اس سے کہا : بھائی ذرا نرم لہجے میں بات کرو ۔ اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو جو تم سے بہت بہتر تھا ، ایک ایسے شخص کے پاس جو مجھ سے بھی بہت برا تھا بھیجا تھا ۔ لیکن اسے حکم یہ دیا تھا کہ بات نرم لہجے میں کرنا ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا تو انھیں تاکید کی کہ :

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۔ (طٰہٰ - ۴۴) — پس اس سے نرم انداز میں بات کہو شاید کہ وہ یاد دہانی حاصل کرے یا ڈر پکڑے ۔

ہر شخص محسوس کر سکتا ہے کہ اس موقع پر مامون کا موقف زیادہ مضبوط تھا ۔ اس لئے کہ اپنے حق میں اس کے پاس قرآن کی محکم دلیل موجود تھی ۔

اس مقام پر داعی کو ایک بات کا اور بھی لحاظ کرنا چاہئے اور وہ یہ کہ استدلال میں ایسی چیز پیش کرے جو متفق علیہ ہو ، اس میں کسی قسم کے احتمال یا اختلاف کی گنجائش نہ ہو ۔ اس لئے کہ جب کسی دلیل میں کسی نوعیت کا احتمال پیدا ہو جائے تو پھر اس سے استدلال ساقط ہو جاتا ہے ۔

اس بات کو ہم ایک مثال سے واضح کریں گے ۔ بہت سے لوگ قرآن کی جامعیت اور ہمہ گیری کو ثابت کرنے کے لئے سورۂ انعام کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں ۔

مَا فَرَّطْنَا فِى الْكِتٰبِ مِنْ شَىْءٍ ۔ (۳۸) — ہم نے اس کتاب میں کوئی کمی باقی نہیں چھوڑی ہے ۔

حالانکہ یہاں یہ احتمال ہے کہ ' کتاب ' سے مراد قرآن ہے بھی یا نہیں ۔ اگر ایسا ہے

تب تو یہ استدلال صحیح ہوگا لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد لوح محفوظ ہو۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کی تقادیر لکھ رکھی ہیں۔ جیسا کہ اس کا ارشاد ہے ۔

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَٰهُ فِيٓ إِمَامٍ مُّبِينٍ (یٰسٓ - ۱۲)	اور ہر چیز ہم نے ایک کھلی کتاب (لوح محفوظ) میں شمار کر رکھی ہے۔

دوسرے مقام پر ہے :

كَانَ ذَٰلِكَ فِي ٱلْكِتَٰبِ مَسْطُورًا (احزاب - ۶)	یہ چیز کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں لکھی ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ اس تاویل کی حامل دوسری بہت سی آیتیں بھی ہیں۔ پس قرآن کی جامعیت اور اس کی ہمہ گیری کو ثابت کرنے کے لئے آیت ذیل سے استدلال کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ جو مذکورہ آیات کے بالمقابل اپنے مدعا میں بالکل صریح ہے :-

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ ٱلْكِتَٰبَ تِبْيَٰنًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ (نحل : ۸۹)	اور ہم نے تمہارے اوپر کتاب اتاری ہے جو ہر چیز کو کھول کر بتانے والی ہے اور راہ دکھانے والی اور مہربانی اور بشارت ہے مسلمانوں کے لئے۔

اسی طرح داعی کو چاہئے کہ ان چیزوں سے استدلال کرنے سے اجتناب کرے جو سرے سے دلیل ہی نہ بنتی ہوں۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اللہ کے تقویٰ کا ایک ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو اس چیز کا علم عطا کر دیتا ہے جس کا اسے بالکل پتہ نہیں ہوتا ہے، آیت دَین کے اس آخری ٹکڑے سے استدلال کرتے ہیں :

وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ ٱللَّهُ (بقرہ - ۲۸۲)	اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اللہ تمہیں علم

عطا کرتا ہے۔

حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ آیت میں اس معنی کے لئے کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس لئے کہ 'وَيُعَلِّمُكُمُ ٱللَّهُ' آیت کے پہلے ٹکڑے 'وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ' کے جواب میں نہیں ہے۔ جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ اللہ سے اس تقویٰ کے نتیجے میں علم کی یہ دولت نصیب ہوگی! یہ بات تو اس وقت درست ہوتی جب آیت کے الفاظ اس طرح ہوتے۔ "وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ يُعَلِّمْكُمُ ٱللَّهُ" (یعنی تم اللہ سے ڈرو تو اس کے نتیجے میں وہ تمہیں علم عطا کرے گا) لیکن ظاہر بات ہے کہ آیت کے دونوں ٹکڑے 'واو عطف' سے جڑے ہوئے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں دو الگ الگ باتوں کا حکم دیا جا رہا ہے۔ پہلی چیز اللہ کا تقویٰ ہے، دوسری ان اوامر و نواہی کی تعلیم جس کے ذریعہ ہی اس تقویٰ کی راہ کو اپنایا جاسکتا ہے۔ قرآن کا یہی انداز ہے کہ جب وہ کسی سلسلے کے احکام کی تفصیل بیان کرتا ہے تو اسے اللہ کے تقویٰ سے لازمی طور پر جوڑ دیتا ہے۔ (تاکہ حکم سے واقفیت کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر اس پر کاربند ہونے کے لئے قوت محرکہ بھی حاصل ہوتی رہے) پس آیت زیر بحث میں وہی بات کہی گئی ہے جو آیت کلالہ[1] کے آخری ٹکڑے میں کہی گئی ہے جس میں اس مسئلے کے بعض پہلوؤں کی آخری طور پر وضاحت کی گئی ہے۔

يُبَيِّنُ ٱللَّهُ لَكُمْ أَن تَضِلُّوا۟ ۗ وَٱللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌۢ (نساء - ۱۷۶)	اللہ تمہارے لئے (مسئلہ کی) وضاحت کرتا ہے تاکہ تم بھٹکنے سے بچو اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔

جہاں تک مذکورہ بالا مضمون کا سوال ہے تو اس کے سلسلے میں سورۂ انفال کی اس آیت سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ إِن تَتَّقُوا۟ ٱللَّهَ	اے ایمان والو! اگر تم اللہ کا تقویٰ اختیار کروگے

[1] کلالہ یعنی لاولد جس کے باپ دادا میں سے بھی کوئی زندہ نہ ہو۔ بحوالہ تفہیم القرآن ۱/۳۴۳ (مترجم)

يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا۔ (آیت - ۲۹) تو وہ تمہیں ایک فیصل کن چیز عطا کرے گا۔

'فرقان' یعنی فیصل کن چیز ایک 'روشنی' جس کے ذریعہ انسان حق و باطل کے مابین امتیاز کر سکے۔

اسی طرح سورۂ حدید کی آیت سے بھی اس موضوع پر استدلال کیا جا سکتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ وَيَجْعَلْ لَكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ۔ (آیت - ۲۸)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ تمہیں اپنی رحمت کے دو حصے عطا کرے گا اور تمہیں ایک 'نور' یعنی روشنی سے نوازے گا، جس کے ذریعہ (زندگی کے سفر میں تم ٹھوکر کھائے بغیر) چل سکو۔

یہی نہیں بلکہ اس موضوع پر سورۂ طلاق کی اس آیت کے عموم سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے:

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا۔ (آیت - ۲)

اور جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا اللہ اس کے لئے خلاصی کا سامان کرے گا۔

اس لئے کہ اس میں جس 'راہ' نکالنے کی بات کہی گئی ہے اس میں یہ بات بھی شامل ہو سکتی ہے کہ آدمی کو شکوک و شبہات اور گڈمڈ امور کی دلدل سے نجات مل جائے۔

غلط تاویل و تحریف کلام سے اجتناب اسی طرح داعی کے لئے لازم ہے کہ وہ آیاتِ قرآنی کی غلط تاویل سے اجتناب کرے، انھیں ان کے اصل مقام سے ہٹانے اور ان میں کجی پیدا کرنے سے باز رہے اور انھیں وہ معنیٰ پہنانے کی کوشش نہ کرے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان سے مقصود نہ ہوں۔ اسے خود بھی ان باتوں سے اجتناب کرنا چاہئے اور دوسروں کو بھی ان سے اجتناب کی تلقین کرتے رہنا چاہئے۔ اس لئے کہ دراصل یہ ایک طرح کی تحریف ہے جس کے ارتکاب پر اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کی مذمت کی ہے۔ اہلِ کتاب کی یہ تحریف دو طرح کی تھی ایک طرف تو انھوں نے لفظی تحریف کا ارتکاب

کیا کہ اپنی کتابوں میں خود اپنی طرف سے الفاظ کی کمی بیشی کر دی، دوسری معنوی تحریف کہ آیتوں کی غلط تاویل کر کے ان کے معنیٰ و مفہوم کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

اب جہاں تک قرآن کریم کا سوال ہے تو وہ سینوں میں بھی محفوظ ہے اور سفینوں میں بھی۔ اس لئے اب اس کے الفاظ میں تحریف و تبدیلی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں معنوی تحریف کا امکان البتہ موجود ہے کہ اس کی آیتوں کی غلط تاویل کر کے اس کے منشا و مفہوم کو اُلٹ دیا جائے۔ تفسیر بالرائے کے ذریعہ سے بھی یہ چیز ممکن ہے جس کے سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حدیثوں میں سخت وعیدیں مذکور ہیں۔

ہمیشہ کی طرح ہمارے اس دور میں بھی اس انحراف و تحریف کی مختلف صورتیں اور متعدد اسباب رہے ہیں جن میں سے چند کی ہم ذیل میں نشاندہی کرتے ہیں۔

۱۔ لوگوں کا اصل مقصود تو عصری تقاضوں کی تائید ہوتی ہے۔ خواہ وہ اسلام کے مخالف ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن ساتھ ہی وہ لوگ قرآن و سنت کے نصوص سے دامن کش بھی نہیں ہونا چاہتے۔ چنانچہ وہ ان کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح کوئی دور کی کوڑی لا کر ہی سہی واضح مفہوم سے الگ ان کی کوئی نہ کوئی تاویل کر ڈالتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنے عصری تقاضے کی تائید میں شریعت کی سند بھی پیش کر سکیں۔

ہمارے زمانے میں اس کی ایک مثال تو ان کوششوں میں دیکھی جا سکتی ہے جن کے تحت بینکوں کے سود کو جائز قرار دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا گیا، یہ اس زمانے کی بات ہے جب اسلامی ممالک پر سرمایہ داری کا دور دورہ تھا۔ اور تھوڑے ہی دنوں بعد اب جو ان پر اشتراکیت کا غلبہ ہوا ہے تو اسی طرح کی کوششیں 'قومیانے' اور ملکیتوں کو ضبط کر لینے کو سند جواز عطا کرنے کے سلسلے میں ہو رہی ہیں۔ حالانکہ یہ وہ ملکیتیں ہیں جو شریعت کو رو سے اپنے

مالکوں کا ثابت شدہ حق ہیں۔ جن پر کسی طرف سے کسی قسم کی دست درازی کی گنجائش نہیں ہے۔

اسی طرح اس انحراف اور کج روی کا مظاہرہ ان بے شمار آیات واحادیث کی تشریح وتفسیر کے سلسلے میں دیکھنے کو ملتا ہے جس میں ان کو اپنے بالکل واضح اور ظاہری مدلول سے ہٹاکر دوراز کار تاویلات کا ستم خوردہ بنادیا جاتا ہے۔ جن کی بظاہر کوئی معنویت سمجھ میں آتی ہے اور نہ حق وصداقت کا ان میں کوئی شائبہ نظر آتا ہے۔ بلکہ اپنے سیاق وسباق کے لحاظ سے یہ چیز بالکل بے جوڑ ہوتی ہے۔ ایسا کیوں ہے صرف اس لئے کہ فضا میں بعض افکار ونظریات کی حکمرانی ہے۔ حالانکہ وہ کوئی ثابت شدہ حقائق نہیں جنھیں تسلیم کئے بغیر چارہ نہ ہو۔ ہمارے زمانے کے بہت سے علماء کے ساتھ یہی معاملہ رہا ہے۔ یہی حال دوسرے بہت سے اہل قلم کا بھی ہے جو ہر نئی چیز کو اپنانے کے لئے جیسے بالکل منتظر بیٹھے رہتے ہیں۔

۲۔ بسا اوقات لوگ اپنے طبعی رجحان کی وجہ سے کسی نظریہ، مسلک یا مکتبِ فکر کو پسند کر لیتے ہیں اور پھر اُس کی تائید میں نصوص تراشتے ہیں۔ آدمی پہلے تو ایک خیال قائم کر لیتا ہے پھر اس کے حق میں دلیلیں تلاش کرتا ہے۔ حالانکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے دلائل کو دیکھے پھر اس کے بعد کوئی رائے قائم کرے۔

اس صورتِ حال کا شکار ہمارے بہت سے علمائے کلام، فلاسفہ اور بعض فرقے اور فقہی مقلدین رہے ہیں۔ ان سب لوگوں کا یہ حال ہے کہ انھوں نے اصل حیثیت تو اپنے اپنے مسالک کو دی۔ پھر ان کی تائید کے لئے دینی نصوص کی کھینچ تان کرتے رہے۔ خواہ اس کے لئے کتنے ہی تکلف سے کام لینا پڑے اور بالکل دور کی کوڑی کیوں نہ لانی پڑے۔ اس کے بعد بھی اگر تاویل کی راہ سے بات نہ بنتی تو آیت یا حدیث کے منسوخ ہونے کا فتویٰ دیدیتے۔ حالانکہ صاف بات یہ ہے کہ اس طرح کی احتمال آفرینیوں سے کوئی آیت یا کوئی

حدیث منسوخ نہیں ہوا کرتی۔

ابن سینا اور تاریخ اسلام کے اس جیسے دوسرے فلاسفہ کا یہی حال تھا کہ سب سے پہلے تو انھوں نے اپنے ذہن میں یہ بات بٹھالی کہ الٰہیات اور طبیعات وغیرہ کے میدان میں ارسطو اور اس کے علاوہ دوسرے یونانی فلاسفہ کا جو خیال ہے وہ صدفی صد درست ہے۔ اب جب انھوں نے یہ دیکھا کہ یہ چیز قرآن کی بے شمار آیات سے ٹکرا رہی ہے تو انھوں نے اس کی ایسی تاویلیں شروع کردیں جو نہ لغت کی رُو سے درست قرار دی جاسکتی تھیں اور نہ دین ہی انھیں قبول کر سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام غزالیؒ اور ان کے بعد کے بعض دوسرے علمائے حق نے ان کے تین مشہور مسائل کی وجہ سے جن کے ماننے سے معروف دینی حقائق کا انکار لازم آتا تھا، ان کی تکفیر کا فتویٰ صادر کیا تھا۔

۳۔ دینی نصوص کے ٹکڑے کردینا، ایک کو دوسرے سے کاٹ دینا اور ایک موضوع سے متعلق تمام چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملاکر نہ دیکھنا غلط طریقہ ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ کسی بھی مسئلے میں اس سے متعلق جتنے بھی نصوص آئے ہوں ان سب کو پیش نظر رکھا جائے۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ ملاکر دیکھا جائے۔ اس پورے مجموعۂ نصوص کو سامنے رکھ کر ہی اس کے واقعی منشا ومراد کو سمجھا جاسکتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص سود کے سلسلے میں قرآن کے نقطۂ نظر کو جاننا چاہتا ہے تو اس کے لئے مناسب نہ ہوگا کہ وہ صرف سورۂ آل عمران کی اس آیت کو پکڑ کر بیٹھ جائے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً ۔ — اے ایمان والو! سود نہ کھاؤ دوگنا چوگنا کرکے۔

(آیت۔ ۱۳۰)

بلکہ اسے چاہئے کہ اس آیت کو سورۂ بقرہ کی ان آیات کے ساتھ ملاکر دیکھے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَ — اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود تمہارا

ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ، وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۔ (آیات ۔ ۲۷۸، ۲۷۹)

(لوگوں پر) رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم یہ نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے خبردار رہو، اور اگر تم توبہ کرتے ہو تو تم کو تمہارا اصل مال مل جائے گا، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔

اب بات واضح ہوگئی کہ اصل سرمائے 'راس المال' پر جو کچھ بھی زائد ہے وہ 'ربا' یعنی سود ہے ۔ بلالحاظ اس کے کہ اس مقدار کم ہے یا زیادہ ۔ اس صورت میں مذکورہ آیت میں 'اضعافاً مضاعفۃً' کا لفظ موجود صورت حال کی وضاحت کے لئے ہوگا ۔ یہ حقیقی قید نہیں بلکہ 'قید اتفاقی' ہوگی ۔ یہ بالکل ایسے ہی ہوگا جیسے کہ حرص وطمع کے غلام کسی تاجر ٹولے سے کہا جائے کہ 'اشیائے ضروریہ کی ذخیرہ اندوزی نہ کرو کہ اس کے ذریعہ سو کا دو سو فائدہ اٹھاؤ'' تو ایسا کہنا موجودہ صورت حال کی وضاحت کے لئے ہوگا ۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ مثال کے طور پر اگر وہ اشیائے خوردنی یا ایسی ہی دوسری ضروری اشیاء کی ذخیرہ اندوزی کرے ۔ البتہ اس کی نیت یہ ہو کہ سو میں صرف ڈیڑھ سو کا فائدہ اٹھائے گا، یا اس سے کچھ کم یا زیادہ جو بہرحال دو سے کم رہے گا، تو ایسا کرنا درست ہوگا۔

۴ ۔ **متشابہات کی پیروی اور محکمات سے گریز :** کجروی وگمراہی کا یہ ہمیشہ سے ایک اہم باب رہا ہے ۔ جیسا کہ خود قرآن نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے :

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ فَاَمَّا الَّذِيْنَ

وہی (اللہ) ہے جس نے تم پر کتاب اتاری ہے جس میں کچھ آیتیں 'محکمات' (ایک معنی اور واضح مفہوم کی حامل) ہیں جو کتاب کی اصل ہیں اور دوسری

فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۔ (آلعمران ۔ ۷)

متشابہات (کئی کئی معنوں کا احتمال رکھنے والی) ہیں ۔ تو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ انہی متشابہات کی پیروی کرتے ہیں، گمراہی ڈھونڈھنے کی خاطر اور اس خاطر کہ اس کے اٹکل پچو معنی بیان کریں حالانکہ ان کے اصل معنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ۔ اور جو علم میں پختہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے یہ سبھی ہمارے رب کی طرف سے ہیں ۔ اور یاد دہانی تو وہی حاصل کرتے ہیں جو سمجھ والے ہیں۔

یہ آیت کریمہ بتاتی ہے کہ قرآن حکیم کی کچھ آیتیں تو 'محکم' ہیں ۔ یعنی اپنے معنی پر ان کی دلالت قطعی ہے ۔ اور جو شخص ان پر غور کرے گا ان کے منشا و مفہوم کو واضح طور پر سمجھ لے گا۔ اسی طرح قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ 'ام الکتاب' ہیں ۔ یعنی یہی در اصل اس کتاب کی اصل اور اس کی اساس ہیں ۔ قرآن کا بڑا حصہ انہی آیات پر مشتمل ہے ۔ اسی طرح اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جہاں کوئی ایسا جزیہ سامنے آئے جو سمجھ میں نہ آئے تو اسے اسی 'اصل اور اساس' کی طرف لوٹایا جائے گا ۔ اور قرآن کا مختصر حصہ جو 'محکمات' سے نہیں اس کی تشریح وتفسیر اس کے اسی بڑے حصے کی روشنی میں کی جائے گی ۔ لیکن گم کردہ راہ لوگ جن کے دلوں میں ٹیڑھ اور کجی ہے وہ انہی 'متشابہات' کے پیچھے دوڑتے ہیں ۔ ان کے ظاہر کو دیکھ کر جو بات ان کی سمجھ میں آجاتی ہے اور جو ان کی خواہش نفس کے عین مطابق ہوتی ہے، کچھ سوچے سمجھے بغیر وہ اس سے چمٹ جاتے ہیں ۔ حالانکہ اگر وہ انصاف سے کام لیتے ہوئے ان 'متشابہات' کو دیگر 'محکمات' کی طرف لوٹاتے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ احتمالی امور کو قطعی اور واضح امور کی طرف پلٹاتے تو وہ حق کو اپنے سامنے بالکل بے غبار صورت میں دیکھ لیتے جس طرح کہ دیدہ بینا نمود صبح کے

نظارے سے شاد کا ہوتی ہے۔

اگر ہم تاریخ اسلامی کے ابتدائی ادوار سے لے کر آج تک امت کے راہ حق سے ہٹنے ہوئے فرقوں کے حالات کا جائزہ لیں جنھوں نے اہل سنت والجماعت کے طریق سے الگ اپنی پگڈنڈی نکالی، تو ہم دیکھیں گے کہ ان کے اس انحراف اور کج روی کا سب سے نمایاں اور اہم سبب یہی 'متشابہات' کی پیروی اور 'محکمات' سے ان کا گریز رہا ہے۔

تاریخ اسلامی کے طویل عرصے میں امت میں جن بدعات نے سر اٹھایا جبکہ ان کا دین سے دور کا واسطہ نہ تھا ان سب کا حال یہی رہا کہ ان کے علمبرداروں نے انہی 'متشابہات' کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ یہاں تک کہ ان میں جو لوگ 'وحدۃ الوجود' کے قائل رہے جن کے متعلق 'ایثار الحق علی الخلق' کے مصنف کا کہنا ہے کہ مبتدعین کی پوری فہرست میں ان سے بدتر کسی گروہ کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی۔ جن کا قرآن وسنت سے صحیح معنوں میں کبھی کوئی لگاؤ نہیں رہا۔ اور جنھوں نے خدا اور رسولؐ کے سلسلے میں انتہائی نازیبا باتیں کہی ہیں۔ لیکن اس سب کے باوجود اپنی اس بدعت وگمراہی کے سلسلے میں ان کا استدلال بھی قرآن وحدیث کی انہی 'متشابہات' سے رہا ہے۔ مثال کے طور پر وہ اپنی تائید میں قرآن حکیم کی اس طرح کی آیتوں کو پیش کرتے ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (فتح - ١٠)	جو لوگ (اے نبیؐ) تم سے بیعت کر رہے ہیں وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہے۔

نیز:

وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی۔ (انفال - ١٧)	اور وہ مٹھی بھر خاک تم نے نہیں پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی۔

اسی طرح وہ اس سلسلے میں لبید کے اس شعر سے بھی استدلال کرتے ہیں:

الا کل شیٔ ما خلا اللہ باطل	سن لو خدا کے سوا جو کچھ ہے سب بے حقیقت ہے

جو بخاری ومسلم دونوں میں موجود ہے۔ اور جسے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان اقدس سے کسی شاعر کی زبان سے نکلنے والے سچے قول کے اعلیٰ ترین نمونے (اصدق کلمۃ قالہا شاعر) کی سند عطا فرمائی تھی۔

تعجب ہے کہ ان لوگوں نے یہ بات کیسے نظر انداز کر دی جبکہ دین اسلام کے دونوں مآخذ پکار پکار کر اس حقیقت کا اعلان کر رہے ہیں، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دوسرے آسمانی مذاہب بھی اس حقیقت سے ناآشنا نہیں رہے ہیں کہ 'وجود' دو الگ اجزاء سے عبارت ہے۔ ایک رب یعنی پالنے والا دوسرے 'مربوب' یعنی وہ جنہیں وہ پال رہا ہے۔ ایک طرف خالق ہے دوسری طرف اس کی مخلوق ہے۔ ایک طرف کائنات ہے دوسری طرف اس کائنات کو پیدا کرنے والا ہے۔ پس وجود کی یہ ثنویت یعنی دوئی دین کی بدیہیات اور اس کی ابتدائی بنیادی باتوں میں سے ہے جس کے ثابت کرنے کے لئے کسی طول طویل بحث کی ضرورت ہے نہ لمبی چوڑی دلیلیں قائم کرنے کی۔ البتہ نصاریٰ کی اس سے پہلے بھی یہ کوشش رہی ہے اور آج بھی وہ اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ قرآن کی 'متشابہات' سے ایسی کوئی چیز نکالیں جس سے اپنے اس دعویٰ پر، کہ مسیح الوہیت کے مقام پر فائز ہیں، اور خدا کے بیٹے ہیں، دلیل پکڑ سکیں۔ اپنے اس مقصد کے لئے وہ قرآن کی اس طرح کی آیتوں کا سہارا لیتے ہیں:

اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَا اِلٰی مَرْیَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ۔ (نساء - ١٧١)	مسیح یعنی عیسیٰ مریم کا بیٹا اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کا رسول ہے اور اس کا کلام جو اس نے ڈالا مریم کی طرف اور ایک روح اس کی طرف سے۔

البتہ اس سلسلے کی قرآن دوسری بے شمار محکم، آیتیں انھیں بالکل نظر نہیں آتی ہیں بمثال کے طور پر آیات ذیل:

آیت	ترجمہ
۱۔ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَ جَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ۔ (زخرف - ۵۹)	وہ (ابن مریم) اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ایک بندہ ہے جس پر ہم نے اپنا (خاص) فضل کیا اور بنی اسرائیل کے لئے اسے نمونہ قرار دیا۔
۲۔ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ۔ (مائدہ - ۷۵)	مسیح مریم کا بیٹا اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک رسول ہے، اس سے پہلے بھی بہت سے رسول گذر چکے ہیں، اور اس کی ماں ولی ہے، وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔
۳۔ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِىْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبَّكُمْ۔ (مائدہ - ۱۱۷)	(پروردگار!) میں نے ان سے کچھ نہیں کہا سوائے اس کے جس کا تو نے مجھ کو حکم دیا، یہ کہ بندگی کرو اللہ کی جو میرا رب ہے اور تمہارا بھی۔
۴۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ۔ (مائدہ - ۷۳)	بیشک کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے۔
۵۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ۔ (مائدہ - ۱۷)	بیشک کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہا کہ اللہ وہی مسیح ہے مریم کا بیٹا۔

بہر حال کہنے کا مقصد یہ کہ 'متشابہات' کی پیروی کج پسند انسانوں کا ہمیشہ سے شیوہ رہی ہے۔ اس سے پہلے بھی ان کا یہی طریقہ تھا اور آج بھی وہ اسی راہ پر گامزن ہیں۔

علوم قرآن سے واقفیت دین کے ایک داعی کا علوم قرآن سے واقف ہونا

بھی ضروری ہے۔ مطالعہ قرآن کے لئے یہ چیز ایک شرط لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔ گذشتہ ادوار میں بھی اس موضوع سے متعلق بہت سی جامع کتابیں لکھی گئی ہیں۔ قدما کی کتابوں میں دو کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ امام زرکشی کی 'البرہان فی علوم القرآن'، اور علامہ سیوطی کی 'الاتقان فی علوم القرآن'، نئے دور کی کتابوں میں زرقانی کی 'مناہل العرفان فی علوم القرآن' اور ڈاکٹر صبحی صالح کی 'مباحث فی علوم القرآن'، زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ اسی نام سے ایک کتاب شیخ مناع القطان کی بھی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری بہت سی کتابیں جو اسلامی جامعات کے طلبہ کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔

اسی طرح علوم قرآن کے کسی ایک پہلو سے متعلق بھی زمانہ قدیم سے لے کر آج تک کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ کتابیں جو 'اعجاز القرآن' کے موضوع سے متعلق ہیں۔ ان میں سے بعض کی طرف ہم اس سے پہلے اشارہ بھی کر چکے ہیں۔ اسی طرح تفسیر کے موضوع سے متعلق کتابیں ہیں۔ مثال کے طور پر 'اصول تفسیر' سے متعلق علامہ ابن تیمیہ کا رسالہ[1]۔ اور ڈاکٹر محمد حسن ذہبی کی کتاب 'التفسیر والمفسرون'۔ اسی طرح ڈاکٹر مصطفیٰ زید کی کتاب 'النسخ فی القرآن الکریم'، اس کے علاوہ 'ترجمۂ قرآن' سے متعلق موافق اور مخالف تحریریں ہیں جن میں شیخ مراغی، محمد فرید وجدی اور شیخ محمد سلیمان وغیرہ حصہ لیتے رہے ہیں۔

تفسیر: کوئی شک نہیں کہ علوم قرآن کے سلسلے میں سب سے زیادہ مہتم بالشان چیز 'تفسیر' ہے۔ کہ اسی کی بدولت کتاب اللہ کے منشا و مراد کو سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان اپنی بساط کے بقدر ہی اس کا حق ادا کر سکتا ہے۔

تفسیر قرآن کے موضوع پر سیکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں جن کا ایک اچھا بڑا حصہ افسوس کہ زمانہ کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہا۔ لیکن اس کے باوجود جو ذخیرہ ہمارے سامنے موجود ہے وہ

[1] علامہ موصوف کا یہ رسالہ اب فتاویٰ کی طبع جدید جلد/۱۳ میں شامل ہے (مترجم)

بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اگرچہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مطبوعہ مواد کے علاوہ اس کا ایک خاصا بڑا حصہ مخطوطات کی صورت میں گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا ہے۔

مطبوعہ حصے میں کچھ تفسیریں تو وہ ہیں جن میں زیادہ تر روایات پر اعتماد کیا گیا ہے۔ انھیں تفسیر ماثور کہا جاتا ہے۔ دوسری طرف تفسیر کی وہ کتابیں ہیں جن میں 'درایت' کا رنگ نمایاں ہے اور انھیں 'تفسیر بالرائ' کا نام دیا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ خصوصیات اور امتیازات ہیں! اسی طرح کچھ کمیاں اور نقائص بھی ہیں۔ تفسیر ماثور کی نمائندہ کتابوں میں زیادہ بڑا حصہ اسرائیلیات کا ہے۔ اسی طرح ان میں ضعیف بلکہ موضوع روایات بھی بھری پڑی ہیں۔

جو کتابیں 'تفسیر بالرائ' کی نمائندگی کرتے ہیں ان پر شخصی اور مسلکی رجحانات کی گہری چھاپ ہے۔ اسی طرح ان کے مولفین پر زمانی اثرات بھی نمایاں ہیں۔ یہاں تک کہ تفسیر اپنے مصنف کے رنگ میں بالکل رنگی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور لگتا ہے کہ وہ کافی گہرے طور پر اس دور کے رجحانات اور تمدنی حالات کی چھاپ قبول کئے ہوئے ہے۔ چنانچہ ایک لغوی اور نحوی کی تفسیر کا جو رنگ ہوگا وہ ایک فقیہ کی تفسیر سے بالکل جدا ہوگا۔ پھر ان دونوں سے جدا رنگ اس تفسیر کا ہوگا جو کسی متکلم کی طرف سے لکھی گئی ہو۔ اور ان میں بھی ایک معتزلی کا رنگ کچھ ہوگا۔ اور ایک اشعری کا کچھ اور اور ان سب سے جدا گانہ وہ تفسیر ہوگی جس کا لکھنے والا صوفیاء کے طبقہ سے تعلق رکھتا ہو۔

اب داعی کے لئے مناسب نہ ہوگا کہ بس تفسیر کی کسی ایک کتاب کو لے کر بیٹھ جائے اور بقیہ کتابوں سے کوئی واسطہ نہ رکھے۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ خصوصیات اور اپنے امتیازات ہیں جن کی رعایت دوسروں کے یہاں اس انداز سے نہیں ملے گی پس مناسب یہ ہوگا کہ وہ حتی المقدور ان میں سے ہر ایک سے استفادہ کرنے کی کوشش کرے۔ اور ہر تفسیر میں

سے جو کام کا حصہ ہے اسے اپنے لئے الگ کر لے۔ اس کا جو امتیازی عنصر ہے اس کے مغز کو تو وہ لے لے البتہ غلط اور کمزور باتوں سے اپنے دامن کو بچائے رکھے۔ مثال کے طور پر زمخشری کی 'کشاف' کے اندر اگرچہ اعتزال کا رنگ نمایاں ہے۔ تاہم تفسیر کے کسی طالب علم کے لئے اپنے کو اس سے دور رکھنا کسی طرح مناسب نہ ہوگا۔ اس کے نحوی اور لغوی مباحث سے آدمی کو لازماً استفادہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ اہل سنت کا قدیم سے یہی طریقہ رہا ہے۔ کشاف کا اعتزالی رنگ ان کے لئے اس سے استفادے کی راہ میں کبھی مانع نہیں رہا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگوں نے تو اس کی احادیث کی تخریج بھی کی۔ مثال کے طور پر حافظ ابن حجرؒ۔ البتہ کچھ لوگوں نے اس کے ان مقامات کا جن میں مسلک اعتزال کی وکالت کی گئی تھی، تعاقب بھی کیا۔ اس کی مثال میں ہم 'ابن منیر' کا نام پیش کر سکتے ہیں۔

البتہ اگر اپنی پسند اور انتخاب کی بات کی جائے تو میں ابن جریر اور ابن کثیر کی تفسیروں کو ترجیح دوں گا۔ اور ان دونوں کے درمیان بھی اگر کسی ایک کے حق میں میری ترجیحی رائے معلوم کی جائے تو میں ابن کثیر کی تفسیر کا نام لوں گا۔ اس لئے کہ اس میں ابن جریر کا پورا خلاصہ آگیا ہے! اس کے علاوہ انھوں نے تنقیح و تہذیب سے نسبتہً زیادہ کام لیا ہے اس پہلو سے اسے ہمارے موجودہ تفسیری سرمائے میں شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔ شاید یہی وجہ ہے جو سیوطی نے تذکرہ الحفاظ کے 'ذیل' اور علامہ زرقانی نے 'شرح المواہب اللدنیہ' میں اس کی بابت کہا ہے کہ: آج تک اس ڈھنگ کی اس جیسی کوئی تفسیر مرتب نہیں کی گئی۔ انہ لم یولف علیٰ نمطہ مثلہ [لہ] بلکہ میرے خیال میں تو تنہا یہی تفسیر ہے جو روایت اور درایت کی دوگونہ خصوصیات کی حامل ہے۔

جہاں تک تفسیر بالرائی کی رنگ کی حامل کتابوں کا سوال ہے تو ہر ایک کی کچھ خوبیاں ہیں، کچھ خامیاں اور کمزوریاں بھی۔ میرے نزدیک اس رنگ کی کتابوں میں سب سے بہتر ابن عطیہ اور قرطبی کی تفسیریں ہیں۔

[لہ] ملاحظہ ہو کتانی کا رسالہ الرسالۃ المستطرفۃ، بحوالہ التفسیر والمفسرون ۱ / ۲۴۷ طبع اول

جہاں تک نئے دور کی تفسیروں کا سوال ہے تو اس فہرست میں بھی بہیں اچھی خاصی کام کی چیزیں نظر آتی ہیں بشال کے طور پر تفسیر القاسمی، تفسیر المنار اسی طرح ابن عاشور اور ابن بادیس کی تفسیریں۔ سید قطب شہیدؒ کی شہرۂ آفاق تفسیر "فی ظلال القرآن" نیز دروزہ کی "التفسیر الحدیث" اسی طرح شیخ شلتوت کی ابتدائی بیس پاروں کی تفسیر۔ نیز ان کے علاوہ دوسری تفسیریں[1] دین کا داعی ان کتابوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ البتہ ترجیح و اختیار کا حق بہرحال باقی رہتا ہے آدمی کو بہاں افراط و تفریط نظر آئے، اپنے کو اس سے دور رکھے معصوم کوئی بھی نہیں ہے۔ اگر کسی کی دس باتیں اختیار کرنے کے قابل ہیں تو دو چار ایسی بھی ہو سکتی ہیں جنھیں چھوڑ دینا ہی زیادہ مناسب ہے۔

تفسیر کے طلبار کے لئے کچھ اہم نصیحتیں اس مقام پر میں داعی یا صحیح تر لفظوں میں حقیقت دعوت کے جویا اس شخص کے لئے جو تفسیر کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کے چشمۂ صافی سے اپنے کو سیراب کرنا چاہتا ہے، چند اہم نصیحتیں گوش گذار کرنی چاہوں گا جن تک میری تجربے اور مطالعے کی طویل منزل طے کرنے کے بعد رسائی ہو سکی ہے۔

۱۔ تفسیر کے مغز اور اس کے جوہر پر نگاہ رکھنا اس سلسلے میں میری پہلی نصیحت یہ ہے کہ وہ تفسیر کے مغز اور اس کے جوہر پر نگاہ رکھے، اور لفظی موشگافیوں، لاطائل گفتگو اور بال کی کھال نکالنے سے، جبکہ تفسیر کی کتابیں اس سے بھری پڑی ہیں، احتراز کرے۔ طول طویل لفظی بحثیں، نحوی مسائل اور بلاغت کے نکتوں کی بیجا تفصیل، کلامی جھگڑوں اور فقہی اختلافات

---

[1] اس مقام پر اردو زبان میں تفسیر کے موضوع پر جو قیمتی اور بعض پہلوؤں سے منفرد نوعیت کا کام ہوا ہے اس کی طرف ہم قارئین کی توجہ مبذول کرائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بیان القرآن، ترجمان القرآن، تفہیم القرآن، تدبر قرآن وغیرہ کے سلسلے میں پورے اطمینان کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ بعض پہلوؤں سے تفسیر کے عربی ذخیرے پر بھی یہ اضافہ پیش کرتی ہیں۔ تراجم کے ذیل میں جو شاہکار کام ہوا ہے ان کا تو خیر ذکر ہی کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس مقام پر حضرت شاہ عبدالقادرؒ کا نام لئے بغیر کیسے رہا جا سکتا ہے۔ (مترجم)

پر صفحات کے صفحات سیاہ کرتے جانا، یہ اور اسی طرح کی دوسری بہت سی چیزیں ہمارے تفسیری سرمائے کے کافی بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے عام طور پر مطالعہ کرنے والا شخص کلام اللہ کے اصل اسرار و معارف سے بے بہرہ رہ جاتا ہے۔ حالانکہ کتب تفسیر کی تصنیف کا اگر کوئی مقصد ہو سکتا تھا تو وہ یہی کہ انسان کو کلام الٰہی کے ان اسرار و معارف سے آشنا کرائیں۔ داعی کو چاہئے کہ تفسیر کے ان لاطائل مباحث سے اپنے کو بالکل دور رکھے۔ شاید اسی طرح کی موشگافیوں کو دیکھ کر ابوحیان نے امام رازی کی تفسیر کبیر کے سلسلے میں اپنا وہ مشہور جملہ کہا تھا کہ: اس میں سوائے تفسیر کے اور سب کچھ موجود ہے "فیہ کل شئی الا التفسیر"[2]

اس میں شک نہیں کہ تفسیر رازی کے سلسلے میں ابوحیان کا یہ تبصرہ مبالغہ آمیز ہے۔ اس لئے کہ اس کتاب میں جا بجا جو گراں بہا تفسیری نکتے ہمیں ملتے ہیں وہ کہیں اور نظر نہیں آتے، لیکن یہ جو انھوں نے مختلف علوم کے سلسلے میں اس میں مسائل کا طومار باندھ دیا ہے اور فقہی اور کلامی مسالک کے باب میں طول طویل بحثیں کھڑی کر دی ہیں، تو واقعہ یہ ہے کہ اس چیز نے اس کتاب کی افادیت کو بڑی حد تک کم کر دیا۔

---

[1] اسی طرح کی بات سید رشید رضا مصری نے شیخ طنطاوی جوہری کی تفسیر الجواہر کے سلسلے میں بھی کہی تھی۔ کہ جا بیجا جن موشگافیوں اور نکتہ آفرینیوں کے جوہر وہ علوم جدیدہ کے سلسلے میں دکھاتے ہیں نفس تفسیر کے سلسلے میں وہ اس سے بہت کم توجہ دیے پاتے ہیں۔ (مصنف)

[2] ابوحیان کے اس ریمارک پر علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا یہ تبصرہ قابل ذکر ہے کہ: "یہ بات وہی شخص کہے گا جس پر روایت پرستی کا غلبہ ہو۔ اور اخبار و آثار تک محدود رہ کر قرآن کے اسرار و معارف سے غافل ہو۔ ایک اور موقع پر اس کے سلسلے میں فرمایا کہ: یہ بات امام کے حق میں صریح بے انصافی ہے۔" ذالک القول ظلم فی حق الامام" (علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی قرآن فہمی، معارف مئی ۱۹۸۳ء) ابوحیان نے یہ بات بعض علماء کے حوالہ سے کہی ہے جسے سیوطی نے اتقان میں نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو، اتقان: ۲/۱۹۰ (مترجم)

معلوم ہوا کہ اصل چیز توجہ کرنے کی تفسیر کا مغز اور اس کا جوہر ہے۔ بجائے اس کے آدمی ان کے اوران کے اقوال کے پیچھے دوڑے اور اس طرح اپنا وقت ان چیزوں میں ضائع کرے جن کی کوئی خاص افادیت ہے، نہ ان سے کوئی نتیجہ ہاتھ آنے والا ہے، آدمی کو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ فی الواقع کلام اللہ کا منشا اور اس کی مراد کیا ہے ؛

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک مفسر کسی آیت کی تفسیر میں مثال کے طور پر دس اقوال نقل کرتا ہے لیکن وہ کچھ نہیں بتاتا کہ ان میں سے کس قول پر اعتماد کیا جائے۔ اسی طرح وہ کسی قول کو اپنا قول مختار بنا کر پیش کرتا ہے لیکن وہ کوئی وضاحت نہیں کرتا کہ اس نے اسے کیوں اختیار کیا ہے اور یہ جو دیگر اقوال پر اس نے اسے ترجیح دی ہے تو آخر وجہ ترجیح کیا ہے ؟

ویسے تو یہ چیز ہر عالم دین بلکہ صحیح تر لفظوں میں دین کے ہر طالب علم کے پیشِ نظر رکھنے کی ہے لیکن داعیانِ حق کے لئے اس کی رعایت بدرجہ اولیٰ مطلوب ہے۔ اس لئے کہ داعی نحوی اور لغوی بحثوں اسی طرح فقہی اور کلامی مجادلوں کے ذریعہ لوگوں کے ذہنوں اور ان کے جذبات کو متاثر نہیں کر سکتا۔ ان کو متاثر کرنے کی تو ایک ہی صورت ہے کہ وہ ان کے سامنے کلام الٰہی میں پوشیدہ اسرار و معارف اور ہدایت ربانی کی انوار و تجلیات کی جلوہ نمائی کرے۔

پس داعی کے لئے لازم ہے کہ وہ ان تفاسیر کا مطالعہ کرتے ہوئے بعض اہل دل اور صاحبِ حال لوگوں کے چھوٹے چھوٹے جملوں پر خاص طور پر نظر رکھے کہ یہ وہ گہر پارے ہیں جنھیں ہو سکتا ہے تفسیر کے بھاری بھرکم مباحث میں کچھ ہلکا تصور کیا جائے لیکن حق یہ ہے کہ انھیں 'روح تفسیر' کا نام دیا جانا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس بات کو ہم ایک مثال سے واضح کریں گے۔ قرآن کریم کی مشہور آیت ہے :

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (توبہ - ۱۱۱)

بیشک اللہ نے خرید لیا ہے مسلمانوں کی جان اور ان کا مال اس کے عوض کہ ان کے لئے جنت ہے۔

جس کے معنی بالکل واضح ہیں یعنی کہ اگر اہلِ ایمان نے اپنی جان و مال کو اللہ کے راستے میں لگایا تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے انھیں جنت عطا کرے گا۔ اور کوئی شک نہیں کہ یہ اس کا عین فضل و کرم اور سر تا سر احسان ہے کہ ایک جس چیز کا وہ خود مالک ہے اسی کو بطور عوض کے قبول کر رہا ہے۔ یقیناً اپنے بندوں پر یہ اس کی غیر معمولی نوازش کا ہی کرشمہ ہے۔

لیکن اس آیت کی تفسیر میں بعض اہل دل بزرگوں کے چھوٹے چھوٹے جملے جو تفسیر کی کتابوں میں نقل ہو گئے ہیں۔ انھیں دیکھ کر ذہن و فکر کے دریچے بالکل کھل جاتے ہیں۔ بجھے ہوئے دلوں میں حرارت پیدا ہوتی اور سرد عزائم میں نئی جان آجاتی ہے۔ اس لئے کہ یہ جملے ہیں تو چند الفاظ پر مشتمل لیکن صدق و صفا اور سوز و اخلاص میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اب ذرا لمبی چوڑی تفسیری بحثوں کے بالمقابل آیت مذکور کی تفسیر میں حضرت حسن بصریؒ اور قتادہؒ کے اس مختصر سے جملے کو پڑھئے کہ :

بایعھم واللہ فاغلیٰ ثمنھم

اللہ نے ان سے بیع کا معاملہ کیا تو بخدا ان کی کیا ہی بھاری قیمت لگائی۔

دیکھئے اس سے آتش شوق کس قدر تیز ہوئی جاتی ہے۔

حضرت حسن بصری کا ایک دوسرا قول ہے :

انفساً ھوالذی خلقھا واموالاً ھوالذی رزقھا۔

جانوں کی خرید جبکہ اللہ ہی ہے جس نے انھیں پیدا کیا، اور مالوں کی جبکہ وہی ہے جس نے انھیں

یہ عطا کیا۔

اسی طرح شمر بن عطیہ نے ایک موقعہ پر فرمایا :

ما من مسلم الا وللہ فی عنقہ بیعۃ	کوئی مسلمان نہیں جس کی گردن میں بیع وشرا کی ایک
وفی بہا او مات علیہا۔	دستاویز لٹکی ہوئی نہ ہو اب یہ اس کی پسند ہے کہ وہ

اس عقد کو پورا کرتا ہے یا اس بوجھ کو لادے ہوئے ہی اس دار فانی سے کوچ کرتا ہے۔

اور اس کے بعد انھوں نے اسی آیت مذکور کی تلاوت فرمائی۔ گویا وہ اپنے اس سوز میں ڈوبے ہوئے جملے سے اس کی تفسیر بیان کر رہے تھے۔

داعی کو چاہیے کہ اپنے نہاں خانۂ دل کو اسی طرح کے انمول موتیوں سے مالا مال کرنے کے لئے ہر وقت بے چین رہے۔ انھیں برابر تازہ رکھے۔ اور ان کی فہرست میں ہر آن اضافے کا متمنی رہے۔

۲۔ اسرائیلیات سے اجتناب | ہمارے تفسیری ثقافتی ورثے کو جس چیز نے سب سے زیادہ داغدار کیا ہے وہ اس میں اسرائیلیات کا نفوذ ہے جس نے اس چشمہ صافی کو بہت کچھ گدلا کر کے رکھ دیا۔

تفسیری سرمائے میں اسرائیلیات کے نفوذ اور اس کی آمیزش کا آغاز تو ابتداء اسلام یعنی صحابہ و تابعین کے زمانے ہی سے ہو چکا تھا جس میں زیادہ بڑا کردار کعب احبار اور وہب بن منبہ جیسے لوگوں کا رہا۔ جو اہل کتاب میں سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے۔ دوسرے مسلمانوں نے بھی یہود و نصاریٰ کی کتابوں سے متاثر ہو کر اس طرح کی بہت چیزیں اپنے یہاں شامل کر لیں۔

شروع شروع میں تو یہ آمیزش اور یہ نفوذ کم تھا، بعد میں بڑھتا گیا، اس کا دائرہ تنگ تھا، پھر وسیع ہوتا گیا۔ اپنے آغاز میں تو یہ چیز سادہ نوعیت کی تھی لیکن آگے اس نے مکر و فریب

اور حیلہ سازیوں کا نیا رنگ اختیار کر لیا۔ اور پھر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دسیسہ کاریوں کا بازار گرم ہو گیا۔

ایسا لگتا ہے کہ جب یہودیت، مدینہ و خیبر وغیرہ میں دعوت اسلامی کے سامنے محاذ جنگ پر شکست کھا گئی، تو اسلام سے اس نے اپنی اس شکست کا بدلہ ایک دوسری صورت سے لینا چاہا۔ یہ صورت تھی مسلمانوں کو فکری اور تہذیبی اعتبار سے شکست دینے کی جس کے لئے اس نے مسلمانوں کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر ان کے درمیان اسرائیلی روایات کو پوری تیزی کے ساتھ رواج دینا شروع کیا۔ نتیجہ ہوا کہ زیادہ وقت نہیں گذرنے پایا کہ اسلامی لٹریچر کا کافی بڑا ذخیرہ بے سر و پا اسرائیلیات کے طومار سے بھر گیا۔

حالانکہ قرآن نے اہل کتاب اور خاص طور پر یہود کے سلسلے میں صاف لفظوں میں خبردار کر دیا تھا کہ اپنی تحریفات کے ذریعہ انھوں نے اپنی کتابوں کے چہروں کو مسخ کر ڈالا ہے، اور اپنی نادانی سے اللہ کی ذات پر نہ جانے کیا کیا اتہامات باندھتے رہے ہیں۔ قرآن حکیم کی آیات ذیل انھی اہل کتاب کے بارے میں ہیں :

يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ	وہ اللہ کے کلام کو سنتے ہیں پھر اسے کچھ کا کچھ بدل
مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ.	ڈالتے ہیں بعد ازاں کہ وہ اسے خوب سمجھ چکے ہوتے
(بقرہ - ۷۵)	ہیں اور (یہ کام) وہ خوب جانتے بوجھتے کرتے ہیں۔

نیز :

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ	اور ان میں کچھ ان پڑھ ہیں جن کو کتاب (یعنی توراۃ)
اِلَّآ اَمَانِيَّ (بقرہ - ۷۸)	کی کچھ خبر نہیں سوائے اس کے کہ وہ اسے اپنی آرزوں
	کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

اسی طرح فرمایا :

يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۔ (بقرہ ـ ۷۹)	وہ کتاب (توراۃ) کو لکھتے تو اپنے ہاتھ سے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس سے تھوڑا نفع کمائیں۔

مزید برآں :

وَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ ۔ (مائدہ ـ ۱۳)	اور بھلا بیٹھے ایک بڑا حصہ اس (کتاب) کا جس کے ذریعہ انھیں نصیحت کی گئی تھی ۔

نیز

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ ۔ (نساء ۴۶ ، مائدہ ۱۳)	وہ کلام (الٰہی) کو ہٹاتے ہیں اس کی اصل جگہوں سے ۔

ان کے علاوہ بے شمار آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے انہی صفات بد کی وجہ سے ان کی سرزنش کی ہے۔

شاید یہی وجہ تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں تورات کا نسخہ دیکھ کر غضبناک ہو گئے تھے ۔ اور فرمایا تھا ۔

أَوَمُتَهَوِّكُونَ فِيهَا يَا ابْنَ الْخَطَّابِ لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَيْضَاءَ نَقِيَّةً وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ كَانَ مُوسَىٰ حَيًّا مَا حَلَّ لَهُ إِلَّا أَنْ يَتَّبِعَنِي ۔ [۱]	اے ابن خطاب! کیا (یہود و نصاریٰ کی طرح) تم بھی شریعت کے معاملے میں حیرانی کا شکار ہونا چاہتے ہو۔ میں اسے تمہارے پاس انتہائی صاف ستھری صورت لے کر آیا ہوں ۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے (اگر آج) موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو انھیں بجز میری پیروی کے دوسری بات روا نہ ہوتی ۔

[۱] مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ۔ الفاظ میں اختلاف ہے۔ (مترجم)

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا اور رسولؐ کی ان واضح تنبیہات کے باوجود کس طرح مسلمانوں نے اہل کتاب اور خاص طور پر یہودیوں کی روایات کو قبول کرنے میں سہل انگاری سے کام لیا۔ میرے خیال میں دو وجہوں سے اس سہل انگاری کو روا رکھا گیا ۔

پہلی غلط فہمی تو ان کو بخاری کی اس روایت کے ظاہری الفاظ سے ہوئی جسے حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے مرفوعاً بایں الفاظ نقل کیا ہے :

بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً وَحَدِّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَرَجَ وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ	مجھ سے لوگوں تک پہنچاؤ خواہ وہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔ اور بنی اسرائیل سے چیزیں بیان کرو اس میں حرج نہیں ۔ البتہ جو کوئی مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھے تو وہ جہنم میں اپنا ٹھکانا بنا لے ۔

چنانچہ حافظ ابن کثیرؒ نے اپنے تفسیر کے مقدمہ میں اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ جن چیزوں کا ہمارے دین کی رُو سے جھوٹا ہونا ثابت نہ ہو ان کے سلسلے میں اہل کتاب سے روایت کی جا سکتی ہے ۔ دوسری وجہ جو یہ لوگ ان اسرائیلیات کو بے تکلف اپنی تفسیروں میں نقل کرتے رہے وہ غالباً یہ رہی کہ ان چیزوں کے بارے میں پہلے سے کچھ پتہ نہ تھا۔ مسلمانوں کے پاس قرآن و سنت کا اپنا جو ذخیرہ تھا اس کی رو سے نہ تو وہ ان کے صحیح ہونے کا فیصلہ کر سکتے تھے۔ نہ پورے وثوق سے انھیں جھوٹا ہی قرار دے سکتے تھے ۔ اس لئے کہ ان میں انھیں خلاف واقعہ قرار دینے والی کوئی چیز صریح موجود نہ تھی ۔ پس یہ وہ چیزیں تھیں کہ نہ تو ان کی صحت کا فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔ نہ انھیں جھوٹا ہی قرار دیا جا سکتا تھا۔ اسی احتمال کی بنا پر انھیں نقل کرنے میں چنداں قباحت محسوس نہیں کی گئی ۔ اگرچہ دین کے سلسلے میں ان کا کوئی فائدہ بھی دکھائی دیتا نظر نہ آتا تھا ۔

حافظ ابن کثیر اپنے مقدمہ تفسیر میں علامہ ابن تیمیہ کے رسالۂ تفسیر کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں :

"یہی وجہ ہے جو اہل کتاب اس طرح کی چیزوں میں بہت زیادہ اختلافات کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ اصحاب کہف کے ناموں کا تذکرہ کرتے ہیں، نیز یہ کہ ان کے کتے کا کیا رنگ تھا، ان کی تعداد کیا تھی، اسی طرح مثال کے طور پر یہ بات کہ موسیٰ علیہ السلام کا عصا کس درخت کی لکڑی کا تھا؛ ان چڑیوں کے نام کیا تھے جنھیں حضرت ابراہیم نے زندہ کیا تھا؛ بنی اسرائیل کے اس مردے کو گائے کے جس 'بعض' سے مارا گیا تھا تو اس 'بعض' سے کیا مراد ہے؛ اسی طرح وہ درخت کس چیز کا تھا جس کے اوٹ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ سے کلام فرمایا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ بہت سی چیزیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مجمل رکھا ہے۔ اس لئے کہ نام لے کر اگر ان چیزوں کو بتا بھی دیا جاتا تو مخاطب کے لئے نہ تو دنیا کے لحاظ سے اس کا کوئی فائدہ تھا نہ آخرت کے لحاظ سے لیکن اس کے باوجود ان چیزوں کے باب میں اہل کتاب کے ذکر کردہ اختلافات کا بیان کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ اصحاب کہف کے بیان کے ذیل میں قرآن حکیم کی اس آیت سے واضح ہے :

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ الآيه — ان (اہل کتاب) میں کچھ کہیں گے وہ (اصحاب کہف) تین تھے اور چوتھا ان کا کتا۔ الخ

(کہف - ۲۲)

البتہ علامہ احمد شاکرؒ نے ابن کثیرؒ کے اس خیال پر گرفت کی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے بہت خوب بات کہی ہے، فرماتے ہیں :

"اہل کتاب سے ان چیزوں کو روایت کرنا جن کو پرکھنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ آیا وہ صحیح ہیں یا غلط یہ چیز اپنی جگہ، لیکن ان کا ذکر قرآن کی تفسیر میں کرنا اور ان

کو آیت کی تفسیر کے ذیل میں ایک قول یا روایت کی حیثیت سے پیش کرنا، یا ان کی بنیاد پر نامعلوم چیزوں کا تعین کرنا یا وہ باتیں جو اجمالاً بیان ہوئی ہیں ان کے ذریعہ ان کی تفصیل کرنا، یہ بالکل دوسری چیز ہے۔ کلام اللہ کے پہلو بہ پہلو ان چیزوں کو نقل کرنے سے بجا طور پر یہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی یہی شرح ہے اور یہی اس کے اجمال کو تفصیل کا قالب عطا کر رہی ہے۔ حالانکہ یہ وہ چیز ہے جس کے صحیح یا غلط ہونے کا ہمیں کوئی پتہ نہیں ہے۔ پناہ بخدا کہ اس کی کتاب ان ہفوات سے آلودہ ہو۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جو اس بات کی اجازت دی ہے کہ ہم ان کی اس طرح کی چیزوں کو بیان کر سکتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی آپ نے ہمیں اس بات کا بھی حکم دیا ہے کہ اگر ہم ان چیزوں کی تکذیب نہ کریں تو ان کی تصدیق بھی نہ کریں۔ اب بھلا ان کی ان روایتوں اور ان اقوال کی اس سے بڑھ کر اور تصدیق کیا ہو سکتی ہے کہ ہم انھیں کتاب اللہ کے پہلو بہ پہلو نقل کریں، اور اس طرح یہ تاثر دینے کی کوشش کریں کہ گویا یہی کتاب الٰہی کی تفسیر اور اس کی تشریح ہے؛ اس سے تو ہم خدا کی پناہ ہی طلب کر سکتے ہیں۔"

اسی طرح خود حافظ ابن کثیر نے بھی، سورہ کہف کی آیت پچاس کی تفسیر میں "ابلیس" کے سلسلے میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد کہ اس کا نام کیا ہے اور وہ کس جنس سے ہے اور اس کی کیا خصوصیات ہیں، یہی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں :

"اس سلسلے میں سلف سے بہت سے آثار مروی ہیں۔ جن کا تعلق اکثر و بیشتر اسرائیلیات سے ہے۔ جو محض اس لئے نقل کر دی جاتی ہیں تاکہ ان پر غور کیا جا سکے۔ ان کا صحیح حال تو بس خدا کو معلوم ہے۔ البتہ ان میں کچھ چیزیں ایسی ضرور ہیں جن کے جھوٹے ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اس لئے کہ وہ اس حق کے مخالف ہیں جو قرآن کی صورت میں ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔

زمانہ ماسبق کے سلسلے میں جو باتیں بھی بیان کی جاتی ہیں قرآن ان سے بالکل بے نیاز ہے۔ اس لئے کہ یہ بہت مشکل ہے کہ وہ کمی بیشی اور تبدیلیوں سے پاک ہوں۔ بلکہ ان کے اندر بہت سی بالکل من گھڑت باتوں کا شامل ہونا بھی یقینی ہے۔ خاص طور پر اس لئے کہ گذشتہ اُمتوں کے اندر ایسے قابل اعتماد حفاظ کا کوئی وجود نہ تھا جو ان کے دینی ذخیرے کے سلسلے میں غلو پسندوں کی تحریفات اور باطل پرستوں کی اختراعات کے غبار کو زائل کر سکتے۔ جیسا کہ ہماری اس امت کا معاملہ ہے کہ یہاں ہر دور میں ایسے ائمۂ اعلام موجود رہے ہیں جو اس کے معتمد علیہ مآخذ کے سلسلے میں ایسی ہر امکانی کوشش کے پردے کو چاک کرتے رہے ہیں[۱]

اسی طرح سورۂ ق کی تفسیر کے آغاز میں فرماتے ہیں :

" سلف میں کچھ لوگوں سے مروی ہے کہ 'ق' ایک پہاڑ کا نام ہے جو پورے کرۂ ارضی کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اور اسے 'جبل قاف' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ بھی بنی اسرائیل کے انہی خرافات میں سے ہے جسے کچھ لوگوں نے ان سے نقل کر کے بیان کر دیا ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ اس طرح کی خبریں جن کے صحیح یا غلط ہونے کے سلسلے میں قطعی طور پر کوئی بات نہ کہی جا سکے ان کا ان سے روایت کرنا جائز ہے۔ میرے نزدیک یہ اور اس طرح کی دوسری چیزیں ان کے بعض زنادقہ کی ایجاد کردہ ہیں جو اپنی ان حرکتوں سے لوگوں کے اوپر ان کے دین کو گڈمڈ کرنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ خود ہماری اس اُمت کے ساتھ معاملہ پیش آیا کہ باوجودیکہ اس میں ہر دور میں بلند پایہ علماء، حفاظ حدیث اور ائمہ اعلام کی ایک بڑی تعداد موجود رہی لیکن پھر بھی لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے من گھڑت حدیثیں بیان کرنے سے باز نہ رہے۔ جبکہ ابھی اس پر زیادہ زمانہ بھی گذرنے نہیں پایا تھا۔ پھر بھلا

[۱] ملاحظہ ہو : عمدۃ التفسیر ۱/۱۵

بنی اسرائیل کی روایت کردہ چیزوں کو جوں کا توں کیونکر قبول کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ ان کا زمانی فاصلہ کافی بڑھا ہوا ہے۔ حفاظ اور ناقدین کا وجود ان میں ہمیشہ نہ ہونے کے برابر رہا۔ شراب نوشی ان کے خمیر میں شامل۔ اور ان کے علماء کا یہ عام دستور کہ بات کو اس کے مقام سے ہٹا کر اسے کچھ کا کچھ بنا دیں اور اپنی کتابوں میں لفظی تحریفات کے ارتکاب سے بھی نہ چوکیں۔ اب اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "وَحَدِّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَرَجَ" فرما کر ان سے روایت کرنے کی اجازت دی ہے تو یہ اجازت اس سے مشروط سمجھی جائے گی کہ بات وہ ہو جو کم از کم عقل میں سماتی ہو۔ اس کا مطلب ہوا کہ اس طرح کی چیزیں جنھیں عقل کسی طرح باور نہ کرتی اور جو بادیٔ النظر میں بالکل جھوٹ اور غلط نظر آتی ہوں، یہ اجازت ان کو شامل نہ ہوگی۔ اور اس طرح کی چیزوں کا روایت کرنا کسی طرح جائز نہ ہوگا "

اسی طرح سورۂ نمل کی آیات ۲۸ تا ۴۴ کی تفسیر میں ملکۂ سبا کے قصے میں حضرت عبداللہ بن عباس سے ایک طویل اثر کو نقل کرنے کے بعد اس پر یہ تبصرہ کرتے ہوئے کہ یہ منکر اور بہت شاذ ہے "منکرٌ غریبٌ جدًا" آگے فرماتے ہیں :

" اس طرح کی چیزیں جو مختلف مقامات پر آتی رہتی ہیں ان کے متعلق زیادہ قرین قیاس بات یہی ہے کہ یہ اہل کتاب سے اخذ کردہ ہیں، اور ان کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ مثال کے طور پر ابی بن کعب اور وہب بن منبہ کی اکثر روایات، اللہ انھیں معاف کرے کہ انھوں نے بنی اسرائیل کے ان دور از کار اور اچنبھے میں ڈالنے والے اخبار و واقعات کو اس امت کے سر بھی تھوپ دیا جن کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ آیا یہ چیزیں پیش بھی آئیں یا نہیں یا یہ کہ یہ تبدیلی و تحریف کی ستم خوردہ تو نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو ان خرافات سے بے نیاز کر کے اسے وہ چیز عطا کی ہے جو صحت و صداقت میں آپ اپنی مثال ہے، جو روز روشن

کی طرح عیاں اور دوست دشمن ہر ایک کے لئے یکساں مفید ہے۔"[1]

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ایک سے زیادہ مقامات پر اس طرح کی اسرائیلی روایات کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انھیں کس قدر ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور انھیں ہاتھ لگانا روا نہیں رکھتے۔ اگرچہ اپنے پیش رو بزرگوں کی پیروی میں ان کا تذکرہ کر دیتے ہیں، لیکن کہیں کہیں تو وہ انھیں بالکل ہاتھ نہیں لگاتے۔ اور قرآن نے بات کو جس اجمال کے ساتھ بیان کیا ہے اس کو اسی صورت پر باقی رکھتے ہیں۔ اور اس کی تفصیلات کے چکر میں نہیں پڑتے جبکہ اس کے سلسلے میں کوئی صحیح چیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی نہیں۔

مثال کے طور پر وہ سورہ 'ص' کی آیت

وَهَلْ أَتَاكَ نَبَأُ الْخَصْمِ إِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ إِذْ دَخَلُوا عَلَىٰ دَاوُودَ فَفَزِعَ مِنْهُمْ (۲۱، ۲۲)	اور کیا تم تک خبر پہنچی مقدمہ کے فریقوں کی جبکہ وہ دیوار کود کر عبادت خانہ میں آئے۔ جب وہ داؤد کے پاس آ بیٹھے تو وہ ان سے گھبرایا۔

کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اس مقام پر عام طور مفسرین ایک قصہ نقل کرتے ہیں جس کا بیشتر حصہ اسرائیلیات سے ماخوذ ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کے سلسلے میں کوئی چیز ثابت نہیں ہے کہ اسے تسلیم کئے بغیر چارہ نہ ہو۔ ابن ابی حاتم نے اس مقام پر ایک حدیث جو نقل بھی کی ہے تو وہ سنداً صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اسے حضرت انسؓ سے یزید رقاشی نے روایت کیا ہے۔ رقاشی اگرچہ صالحین میں سے تھا لیکن ائمہ حدیث کے نزدیک اس کا 'ضعیف' ہونا مسلم ہے۔ پس مناسب بات یہ ہوگی کہ اس قصے کو تلاوت کی حد سے آگے نہ بڑھایا جائے۔ اور اس کی

[1] حوالہ سابق ۱/۷

[2] تفسیر ابن کثیر ۴/۳۱ مطبوعہ عیسی الحلبی

تفصیلات کے علم کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیا جائے۔ اس لئے کہ قرآن کی حقانیت و صداقت میں کوئی شبہ نہیں ہے، اسی طرح اس کی بیان کردہ چیزیں کسی شک و شبہے سے بالاتر ہیں۔

دل چاہتا تھا کہ کاش ابن کثیر اسی سورۂ 'ص' میں آگے حضرت سلیمانؑ کے قصے کے سلسلے میں بھی اپنے اسی موقف پر قائم رہتے۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَأَلْقَيْنَا عَلَىٰ كُرْسِيِّهِ جَسَدًا ثُمَّ أَنَابَ (آیت: ۳۴)	اور ہم نے سلیمان کو آزمایا اور اس کے تخت پر ایک دھڑ ڈال دیا تو وہ رجوع ہوا۔

لیکن افسوس ہے کہ اس مقام پر وہ ان عجیب و غریب روایتوں کو نقل کرنے میں خوب دراز نفسی سے کام لیتے ہیں، جو عبداللہ بن عباس، قتادہ، سدی، مجاہد اور کعب احبار وغیرہ بزرگوں سے مروی ہیں۔ اگرچہ یہ حضرات سلف میں تفسیر کے امام سمجھے جاتے ہیں اور اس پہلو سے ہم بھی ان کا احترام کرتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ اس مقام پر انھوں نے جو چیزیں بیان کی ہیں انھیں عقل باور کرنے کو تیار ہے نہ کسی نقل صحیح سے ان کی تصدیق ہوتی نظر آتی ہے۔ اسی سلسلے میں ایک روایت وہ ابن ابی حاتم سے نقل کرتے ہیں جیسے وہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں۔ موصوف اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ابن عباس تک اس کی اسناد قوی ہے، لیکن اگر ان سے یہ روایت صحیح بھی ہو تو لگتا ہے کہ یہ اہل کتاب سے ماخوذ ہوگی۔ جبکہ ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جو سرے سے حضرت سلیمانؑ کی نبوت ہی کا منکر ہے۔ جو ظاہر ہے کہ ان پر جھوٹ باندھنے سے بمشکل ہی چوک سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ آخر میں فرماتے ہیں:

"سلف کی ایک بڑی جماعت سے یہ قصہ پوری تفصیلات کے ساتھ مروی ہے مثلاً سعید بن مسیب اور زید بن اسلم نیز ان کے علاوہ دوسرے بہت سے حضرات لیکن یہ تمام تر

تفصیلات اہل کتاب کی روایت کردہ کہانیوں سے ماخوذ معلوم ہوتی ہیں"۔ [۱]

اب سوال یہ ہے کہ آخر اس طرح کی چیزوں پر وقت برباد کرنے اور صفحات سیاہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جبکہ ان سے کسی صحیح بات کا پتہ چلتا ہے، نہ کسی مستند صحیفۂ آسمانی کی ان کو توثیق حاصل ہے۔ ابن کثیر نے سورۂ انبیاء کی آیات ۵۱ تا ۵۶ کی تفسیر کرتے ہوئے کتنی اچھی بات کہی ہے:

"اس تفسیر میں ہمارا طریقہ یہ ہوگا کہ اسرائیلی روایات کے بڑے حصے سے ہم اجتناب کریں گے۔" اس میں پڑنا اپنا وقت ضائع کرنا ہے اس لئے کہ اس میں وہ جھوٹی باتیں بھی شامل ہیں جو ان کے اس رواج پکڑے ہوئے تھیں۔" کاش کہ ابن کثیر ان کے ایک بڑے حصے ہی سے نہیں بلکہ اس پورے ذخیرے سے اجتناب کی روش میں کامیاب ہوتے۔ اس لئے کہ اس کا ہر ہر جزء اپنے ساتھ فائدہ کم اور نقصان کے پہلو زیادہ رکھتا ہے۔

اسرائیلیات سے بیزاری اور ان سے ناپسندیدگی اور قرآن حکیم کو ان کی آمیزش سے پاک رکھنے کے سلسلے میں غالباً حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ان فقروں سے زیادہ بلیغ اور موثر کوئی دوسری بات نہ کہی گئی ہوگی جسے امام بخاریؒ نے اپنی 'صحیح' میں روایت کیا ہے، اور جسے حافظ ابن کثیر نے سورۂ بقرہ کی آیت ۷۹ کی تفسیر کرتے ہوئے ان لفظوں کے ساتھ نقل کیا ہے:

یَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِیْنَ کَیْفَ تَسْاَلُوْنَ اَهْلَ الْکِتَابِ عَنْ شَیْءٍ، وَکِتَابُکُمُ الَّذِیْ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی نَبِیِّهٖ اَحْدَثُ اَخْبَارِ اللّٰهِ، تَقْرَؤُوْنَهُ مَحْضًا لَمْ یُشَبْ! وَقَدْ حَدَّثَکُمُ اللّٰهُ اَنَّ اَهْلَ الْکِتَابِ قَدْ بَدَّلُوْا کِتَابَ اللّٰهِ وَغَیَّرُوْهُ وَکَتَبُوْا بِاَیْدِیْهِمُ الْکِتَابَ وَقَالُوْا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِیَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا اَفَلَا یَنْهَاکُمْ مَا جَاءَکُمْ مِنَ الْعِلْمِ عَنْ مَسْاَلَتِهِمْ لَا وَاللّٰهِ مَا رَاَیْنَا مِنْهُمْ اَحَدًا قَطُّ سَاَلَکُمْ عَنِ الَّذِیْ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ۔

اے مسلمانو! تم کیونکر اہل کتاب سے کسی چیز کی بابت دریافت کرتے ہو۔ جبکہ تمہاری کتاب جسے اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا ہے اللہ کی دی

ہوئی خبروں کا سب سے آخری ایڈیشن ہے۔ تم اسے بالکل خالص اور بے آمیز صورت میں پڑھتے ہو۔ جبکہ اللہ اہل کتاب کی بابت تم کو بتا چکا ہے کہ انھوں نے اللہ کی کتاب کو بدل دیا، اس کو کچھ کا کچھ کردیا۔ انھوں نے کتاب کو لکھا تو اپنے ہاتھ سے اور کہتے یہ کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس کے ذریعہ تھوڑا نفع کمائیں۔ تو اب جو علم تمہارے پاس آگیا ہے کیا وہ تمہیں اس سے باز رکھنے کے لئے کافی نہیں ہے کہ تم ان سے کوئی بات دریافت کرو؟ خدا گواہ ہے! ہم نے ان میں تو کسی کو نہیں دیکھا جس نے کبھی تم سے بھی اس چیز کی بابت پوچھا ہو جو تمہارے پاس نازل کی گئی ہے۔

ترجمان القرآن کی اس پرسوز اور دل میں گھر کر جانے والی نصیحت کو امام بخاری نے اپنی 'صحیح' میں تین مقامات پر نقل کیا ہے۔ [۱]

۳۔ **ضعیف اور موضوع روایات سے اجتناب** | جس طرح داعی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے کو اسرائیلی روایات و حکایات سے دور رکھے جنھوں نے اپنے زہریلے مواد کی آمیزش سے تفسیر کے چشمۂ صافی کو گدلا لیا ہے اسی طرح اس کے لئے یہ بات بھی ضروری ہے کہ ضعیف اور موضوع روایات سے دامن کشاں رہے۔ اس لئے کہ تفسیر کی اکثر کتابیں اسرائیلیات کی طرح ان سے بھی بھری پڑی ہیں۔

اس میں وہ روایتیں بھی شامل ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً نقل کی گئی ہیں اور وہ روایتیں بھی جو بعض صحابہ کرامؓ سے موقوفاً بیان کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ وغیرہ۔ یا مثلاً وہ روایتیں جو بعض تابعینؒ کی طرف منسوب ہیں جیسے مجاہد، عکرمہ، حسن بصری اور ابن جبیر وغیرہ۔ یا ان جیسے دوسرے اہل علم کی طرف جن کا زمانہ ان کے بعد ہے۔

ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور ابن جریر طبری وغیرہ حضرات کا طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ اپنی تفسیر میں صحیح، حسن، ضعیف اور منکر ہر طرح کی روایتیں جمع کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس میں موضوع روایتوں کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔ یہ روایات کبھی تو مرفوع ہوتی ہیں، کبھی موقوف اور کبھی مقطوع کے درجے سے آگے نہیں بڑھتیں۔

ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس ہی کی مثال کو پیش نظر رکھئے جن سے روایت کے مختلف طریقے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جن میں اگر کچھ قوی ہیں تو کچھ ضعیف کچھ قبول کرنے کے لائق ہیں تو دوسرے وہ ہیں جنھیں رد کیا جانا ہی مناسب ہے۔

مثلاً ایک طریقہ معاویہ بن صالح عن ابی طلحہ عن ابن عباس کا ہے۔ یہ ترجمان القرآن سے روایت کے طریقوں میں سب سے اعلیٰ ہے۔ اس کے مساوی دوسرا طریقہ 'قیس بن مسلم کوفی عن عطا ابن السائب عن سعید بن جبیر عن ابن عباس' کا بھی ہے۔

اس کے بعد 'ابن اسحاق عن محمد بن ابی احمد مولیٰ آل زید بن ثابت عن عکرمہ یا عن ابن جبیر عن ابن عباس' کا طریقہ ہے۔ جو اپنی اسناد کے لحاظ سے 'حسن' کے درجے میں ہے۔

اس کے بعد 'اسماعیل سدی الکبیر عن ابی مالک یا عن ابی صالح عن ابن عباس' کے طریقے کا نمبر آتا ہے۔ سدی کا معاملہ اگرچہ مختلف فیہ ہے۔ لیکن امام مسلم اور چاروں

ارباب سنن (یعنی داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ) ان سے روایتیں نقل کرتے ہیں۔

ایک دوسرا طریقہ 'ابن جریج عن ابن عباس' کا ہے۔ اس طریقے کی روایتوں میں بہت جانچ پرکھ اور باریک بینی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ ابن جریج نے اپنی جمع کردہ روایتوں میں صحت کا اہتمام بہت کم کیا ہے۔

اسی طرح ایک طریقہ 'ضحاک بن مزاحم الہلالی عن ابن عباس' کا ہے۔ ضحاک کے اس طریقے میں 'انقطاع' ہے۔ اس لئے کہ وہ روایت تو ابن عباسؓ سے کرتے ہیں لیکن ان کی ملاقات ان سے ثابت نہیں ہے۔ پھر ضحاک کے اسی طریقے میں ان سے روایت کرنے والے کچھ دوسرے ضعیف رواۃ بھی شامل ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر بشر بن عمارہ جو ابی روق کے واسطے سے ان سے روایت کرتے ہیں۔

ابن عباسؓ سے روایت کا ایک طریقہ عطیہ کوفی کا بھی ہے۔ یہ عطیہ ضعیف ہیں۔

دوسرا طریقہ مقاتل بن سلیمان کا ہے، انھیں بھی لوگوں نے 'ضعیف' قرار دیا ہے۔ کبھی کبھی تو یہ مجاہد اور ضحاک سے بھی روایت کرتے ہیں۔ حالانکہ ان حضرات سے ان کا سماع ثابت نہیں ہے۔ ایک سے زیادہ لوگوں نے انھیں صاف طور پر جھوٹا قرار دیا ہے۔ اور توثیق تو بہرحال کوئی بھی نہیں کرتا ہے۔

اسی طرح ایک طریقہ کلبی عن ابی صالح عن ابن عباس کا ہے۔ موصوف سے روایت کا یہ سب سے کمزور طریقہ ہے۔ پھر کلبی کے اس طریقے میں اگر محمد بن مروان السدی الصغیر کی روایت بھی شامل ہو جائے پھر تو یہ پورا سلسلہ جھوٹ ہو کے رہ جاتا ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر اور علامہ سیوطی وغیرہ نے اس کی صراحت کی ہے۔

لیکن اس کے باوجود ہمارے قدیم مفسرین روایت کے اس پورے پلندے کو

جوں کا توں نقل کرتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کا جو سب سے کمزور طریقہ ہے ثعلبی اور واحدی جیسے لوگ بھی اکثر وبیشتر اس کے حوالہ سے چیزیں نقل کرتے رہتے ہیں۔ لہ

ہمارے قدماء ان روایات کو بیان کرنے کے سلسلے میں یہ کہتے ہوئے بچ کر نکل سکتے تھے کہ وہ ان روایتوں کو ان کی سندوں کے ساتھ نقل کر دے رہے ہیں۔ سند بیان کر دینے کے بعد ان کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ یہ قول مشہور ہے کہ: مَنْ اَسْنَدَ لَكَ فَقَدْ حَمَّلَكَ یعنی جس نے تم سے سند بیان کر دی اس نے اس کی تحقیق کا بوجھ تمہارے سر ڈال دیا۔ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ اس کے راویوں کی جانچ پرکھ کرو اور یہ پتہ لگاؤ کہ عدالت اور ضبط میں ان کا کیا مقام ہے؟

اس زمانہ کے علماء عام طور پر اس کی صلاحیت رکھتے تھے کہ سند کی چھان بین اور اسے نقد وجرح کی کسوٹی پر پرکھ سکیں۔ اور یہ معلوم کر سکیں کہ اس کے راویوں کا کیا حال ہے؟ اسی بناء پر یہ لوگ عام طور پر سند کی صحت یا ضعف کے سلسلے میں کوئی فیصلہ صادر نہیں کرتے تھے۔

ان کے بعد وہ لوگ آئے جنھوں نے ان سے ان اقوال وروایات کو نقل تو کیا۔ لیکن اس کی سندوں کو حذف کر دیا۔ جس کی وجہ سے متاخرین نے ان کی بابت یہ خیال کر لیا کہ یہ ثابت روایات ہیں، جبکہ وہ ثابت نہ تھیں۔ ہمارے معاصرین میں سے بہت سے لوگ اس کی وجہ سے غلطی کا شکار ہو گئے ہیں۔ چنانچہ وہ طبری، زمخشری، نسفی، رازی اور رخازن وغیرہ ائمہ تفسیر سے بس کسی چیز کو نقل کر دینے کو بالکل کافی سمجھتے ہیں۔ گویا ان ائمہ کی طرف ان روایات کا جو انتساب ہو گیا ہے تو اب کی ان کی قدر وقیمت کو جانچنے پرکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے

لہ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو محمد حسین ذہبی کی 'التفسیر والمفسرون' ۱/۷۷-۸۱۔ نیز: الاتقان ۲/۱۸۹

کہ یہ معلوم کیا جائے کہ وہ ثبوت وصحت کے کس درجے میں ہیں، اور قوت وضعف کے لحاظ سے ان کی سندوں کا کیا مقام ہے؟

زیادہ نہیں ان میں سے اکثر مفسرین کرام نے حضرت زینبؓ اور حضرت زید بن حارثہؓ کے واقعے کے سلسلے میں جو چیزیں نقل کی ہیں انھیں دیکھ کر ہی آپ اس حقیقت کا اندازہ اچھی طرح کر سکتے ہیں۔ سورۂ احزاب میں اس واقعے کی جو تفصیل آئی ہے اور ایک خاص پہلو سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس معاملے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر جو محبت بھرا عتاب نازل ہوا ہے، آپ ذرا دیکھیں ہمارے یہ مفسرین کرام اسے کس افسانوی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔

قرآن حکیم میں اس واقعے کی تفصیل میں صرف اس قدر مذکور ہے۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِ اَمْسِكْ عَلَیْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰہَ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِكَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ وَتَخْشَی النَّاسَ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىہُ فَلَمَّا قَضٰى زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَیْ لَا یَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ اَمْرُ اللّٰہِ مَفْعُوْلًا۔ (احزاب-۳۷)	اور (اے نبیؐ) یاد کرو اس وقت کو جب تم کہہ رہے تھے اس سے (یعنی زید سے) جس پر اللہ نے احسان کیا تھا اور جس پر تم نے احسان کیا تھا کہ روکے رکھ اپنی بیوی کو اپنے پاس اور اللہ سے ڈر۔ اور تم چھپاتے تھے اپنے دل میں ایک چیز جبکہ اللہ اسے کھولا چاہتا تھا۔ اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ اللہ اس کا زیادہ حق دار تھا کہ تم اس سے ڈرتے تو جب زید نے اس سے اپنی غرض تمام کر لی تو

(بعد طلاق) ہم نے اس کا نکاح تم سے کر دیا۔ تاکہ مسلمانوں پر اپنے لے پالکوں کی بیویوں سے نکاح کر لینے پر کوئی تنگی نہ رہے جبکہ وہ ان سے اپنی غرض پوری کر چکیں۔ اور اللہ کے حکم کو تو پورا ہونا ہی ہے۔

جبکہ تفسیری روایات کی رُو سے اس آیت کا شانِ نزول جذبات سے مغلوب محبت کی ایک داستان ہے جس کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ یہ کسی بلند پرواز کی افسانہ سازی یا کسی افترا پرداز کی تہمت طرازی ہی کا نتیجہ ہوسکتی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ایک روز حضرت زینب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ کے سامنے پڑ گئیں۔ یہ بات اس وقت کی ہے جبکہ حضرت زید سے ان کی شادی ہو چکی تھی۔ آپ نے دیکھا تو آپ کا دل ان سے لگ گیا۔ اور جب آپ واپس ہوئے تو یہ کلمات آپ کی زبان پر تھے: سبحان مقلب القلوب! یعنی خدائے پاک بھی کیا خوب دِلوں کو پھیر دینے والا ہے! لیکن آپ اپنی اس محبت کو دل میں چھپائے رہے یہاں تک کہ یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ یہ قصے کا ایک مختصر خلاصہ ہے۔ تفصیلات میں اور بھی گل کھلائے گئے ہیں۔

کون کہے گا کہ اس یاوہ گوئی کے لئے آیت میں کوئی دلیل ہوسکتی ہے۔ نہ اس کے حق میں کوئی صحیح روایت موجود ہے نہ درایت کے پہلو سے اس پر کسی طرح اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مغربی مصنفین اور عیسائی مبلغین اس تفصیل سے بالکل چمٹے بیٹھے ہیں۔ اور اپنی رنگ آمیزیوں سے اسے ایک پورے افسانے کی صورت دے رکھی ہے اور اس کے ذریعہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو داغدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دلیل صرف یہ ہے کہ یہ چیز تفسیر کی بڑی بڑی کتابوں میں مذکور ہے، اس سے کچھ مطلب نہیں کہ خود قرآن کا اس سلسلے میں کیا بیان ہے اور صحیح روایات اس کی کیا تفصیل پیش کرتی ہیں۔ تعجب تو اس پر ہے کہ ہمارے اپنے زمانے کے بہت سے مسلمان اہلِ قلم بھی جو تاریخ اور سیرت وغیرہ کے موضوعات پر لکھتے ہیں وہ بھی اس طرح کی بے بنیاد روایتوں کو اپنے گلے لگا لیتے ہیں، صرف اس لئے کہ یہ تفسیر کی کتابوں میں موجود ہیں۔[۱]

---

[۱] مثال کے لئے ملاحظہ ہو، ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمٰن بنت الشاطی کی کتاب 'نساء النبی'

اللہ تعالیٰ حافظ ابن کثیر کا بھلا کرے۔ انھوں نے آیت مذکور کی تفسیر کرتے ہوئے کتنی اچھی بات کہی ہے:

"ابن ابی حاتم اور ابن جریر وغیرہ نے اس مقام پر سلفؒ سے بہت سے آثار نقل کئے ہیں، جن سے صرف نظر کرنے ہی کو ہم نے زیادہ بہتر خیال کیا۔ اس لئے کہ صحت و ثبوت کے لحاظ سے ان کا کوئی پایہ نہیں ہے۔ چنانچہ ہم یہاں انھیں نقل نہیں کریں گے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے بھی اس جگہ حماد بن زید عن ثابت عن انسؓ کے واسطے سے ایک روایت بیان کی ہے لیکن وہ بھی غرابت سے خالی نہیں ہے اس لئے ہم نے اسے بھی ذکر نہ کرنے ہی کو زیادہ مناسب سمجھا۔"[۱]

ہمارے معاصرین میں سے بہت سے لوگوں نے صرف روایات کے داخلی نقد کی بنیاد پر انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر محمد حسین ہیکل نے اپنی مشہور کتاب 'حیاۃ محمد'[۲] میں اور شیخ محمد غزالی نے 'فقہ السیرہ' میں[۳]

اسی طرح کی ایک مثال 'غرانیق' کے افسانے کی ہے[۴] جسے ہمارے مفسرین سورۂ حج کی اس

---

[۱] ملاحظہ ہو: تفسیر ابن کثیر ۳/۴۹۱ مطبوعہ حلبی۔ [۲] دیکھئے: کتاب مذکور صفحات ۱۷۵-۱۸۲ "گیارہواں" ایڈیشن۔ [۳] کتاب مذکور صفحات ۱۱۶-۱۱۸، تیسرا ایڈیشن۔ [۴] جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سورۂ نجم کی تلاوت کرتے ہوئے جب آیت: أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ (۱۹، ۲۰) پر پہنچے تو یکایک آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے۔

تلك الغرانقة العلى	وان شفاعتهن لترتجی
یہ بلند پایہ دیویاں ہیں	اور ان کی شفاعت ضرور متوقع ہے

اس کے بعد آپ آخر سورہ تک تلاوت کرتے گئے۔ یہاں تک کہ آخر میں جب آپ نے سجدۂ تلاوت کیا تو اس میں علاوہ مسلمانوں کے مشرکین مکہ بھی شریک ہوئے۔ اس خیال کے تحت کہ اب جبکہ محمدؐ نے ہمارے معبودوں کے

بقیہ ص۸۹ پر

آیت کو ذیل میں نقل کرتے ہیں۔ (جس میں وہ تمنّیٰ کے معنیٰ 'تلا' یعنی تلاوت کرنے کے لیتے ہیں)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۔ الآیہ (آیت - ۵۲)

اور تم سے پہلے ہم نے جو رسول اور نبی بھی بھیجا تو جب اس نے کوئی آرزو کی تو شیطان نے اس کی آرزو میں اپنی طرف سے کوئی بات ڈال دی۔ الخ

حالانکہ یہ قصہ سرتاسر بے بنیاد ہے جس کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس کی تائید میں کوئی صحیح روایت موجود ہے، نہ عقلی طور پر ہی اس کی کوئی توجیہ پیش کی جاسکتی ہے۔

اس کے سلسلے میں حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

"اس مقام پر اکثر مفسرین نے 'غرانیق' کا قصہ نقل کیا ہے کہ کس طرح اس کی وجہ سے مہاجرین حبشہ کی بڑی اکثریت مکہ واپس لوٹ آئی تھی۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ قریش کے مشرکین

بقیہ ۸۸ سے آگے: شفاعت دہندہ ہونے کا اقرار کرلیا ہے جبکہ یہی چیز دراصل ہمارے اور ان کے مابہ النزاع تھی تو پھر جھگڑا ہی کس بات کا باقی رہ جاتا ہے بعد میں جب آپ کو اس کا خیال آیا تو سخت پریشانی لاحق ہوئی۔ اس قصے کے قائل مفسرین کے نزدیک سورۂ اسراء کی آیت: وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ (۷۳) اسی ذیل میں نازل ہوئی۔ آپ کی یہ پریشانی برقرار رہی تاآنکہ سورۂ حج کی یہ آیت اتری

اس بے اصل قصے کو نقل کرنے والوں میں علاوہ بہت سے محدثین اور ارباب مغازی وسیر کے ابن جریر جیسے جلیل القدر مفسر بھی شامل ہیں۔ آیت کا منشا، واقعہ کی توجیہ اور اس ضمن میں ابھرنے والے دوسرے متعلقہ مسائل کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم صفحات ۲۳۸ تا ۲۴۵، جیسا کہ ذکر کیا گیا اس خیال کے قائل مفسرین 'تمنّیٰ' کے معنی 'تلا' یعنی 'تلاوت' کرنے کے بیان کرتے ہیں جبکہ کلام عرب اور لغت عرب سے اس کے حق میں کوئی ایک دلیل بھی نہیں پیش کی جاسکتی ہے۔ (مترجم)

مسلمان ہوگئے ہیں۔ لیکن یہ روایت جن طریقوں سے بھی مروی ہے وہ سب کے سب مرسل ہیں۔ میری نظر میں اس کا ایک بھی صحیح طریقہ نہیں گذرا جس کی وجہ سے اسے اسناد کا درجہ حاصل ہوسکے [1]

لیکن افسوس ہے کہ اس مقام پر موصوف کا رویہ وہ نہیں رہا جسے انھوں نے قصۂ زینبؓ کے سلسلے میں اختیار کیا تھا کہ ضعیف روایات کے ذکر ہی سے صرف نظر کیا اور انھیں بالکل ہاتھ ہی نہیں لگایا۔ اس مقام پر انھوں نے قصے کی روایتوں کے ضعیف ہونے کا فیصلہ تو کر دیا۔ لیکن انھیں ذکر کرنے سے دامن کش نہ ہوسکے۔

بیچارے مغربی مصنفین اور ارباب قلم اس طرح کی کمزور اور بے اعتبار روایتوں کو دیکھ کر پھولے نہیں سماتے، وہ ان سے اس طرح چمٹ جاتے ہیں گویا کہ ان پر کسی طرح کا کلام ہی نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ چیزیں ان کی پسند کے عین مطابق ہوتی ہیں اور ان کے من گھڑت خیالات کو ان سے تقویت حاصل ہوتی ہے۔ ان کے بالمقابل بے شمار صحیح روایات موجود ہوں لیکن یہ حضرات ان کی طرف بالکل توجہ نہیں دیں گے، اور ان سے اپنی آنکھیں یکسر بند کئے رہیں گے۔ نظر بھی کیوں ڈالیں کہ ان سے ان کا سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

۴۔ کمزور اور فاسد آراء و اقوال سے پرہیز اسی طرح تفسیر کا مطالعہ کرنے والے کے لئے کمزور اقوال اور آراء سے بھی اجتناب کرنا ضروری ہے جس کے سبب اکثر و بیشتر بڑی گڑبڑی پیدا ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ روایت کے اعتبار سے ان اقوال کی صحت میں کچھ زیادہ کلام

[1] ملاحظہ ہو: تفسیر ابن کثیر ۳/۲۲۹۔ اس کے علاوہ محدث کبیر شیخ محمد ناصر الدین البانی نے خاص اسی موضوع پر ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے 'نصب المجانیق لنسف قصۃ الغرانیق' جس میں انھوں نے انتہائی ٹھوس دلائل سے اس کہانی کے بے بنیاد ہونے کو ثابت کیا ہے۔ تفصیل کے طالب اسے ضرور دیکھیں۔ (مصنف)

نہ ہو اور جن لوگوں کی طرف ان کا انتساب ہے وہ بڑی حد تک درست ہو لیکن درایت کے پہلو سے یہ بالکل کمزور اور بے بنیاد ہوتے ہیں جنھیں کسی صورت قبول نہیں کیا جاسکتا، اور یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس پر کچھ بہت زیادہ تعجب کرنے کی ضرورت ہو۔ آخر یہ کسی پیغمبر کا کلام تو نہیں جو معصوم ہوتا ہے۔ انسان ہی کا کلام ہے جس میں صحت کے ساتھ غلطی کا امکان بھی اسی طرح موجود ہے جس کے لئے اسے بہرحال معذور ہی قرار دیا جائے گا۔ بلکہ اصول تو یہ ہے کہ کسی مسئلے میں اگر انسان اپنی بساط بھر غور و فکر کا حق ادا کر دیتا اور امکان بھر اپنی فکر و نظر کو استعمال کر لیتا ہے تو اس کے بعد اگر اس کی رائے اور اس کا نتیجۂ فکر غلط بھی رہا تو اللہ کی طرف سے وہ اجر کا مستحق قرار پائے گا۔ حق و صواب کو پالینے والے مجتہد کے لئے اگر دو اجر ہیں تو غلطی کی صورت میں وہ ایک اجر سے بہرحال محروم نہیں رہے گا۔

جب حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے رتبے کے آدمی سے بھی، جنھیں پوری امت 'ترجمان القرآن' کے لقب سے یاد کرتی اور جنھیں 'حبر الامۃ' (امت کا امام) ہونے کا اعزاز حاصل ہے، تفسیر کے سلسلے میں ایسی بہت سی رائیں صادر ہوسکتی ہیں جنھیں دیگر علمائے امت نے ضعیف اور شاذ قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ ان میں وہ عام صحابہ کرامؓ کے طریقے سے ہٹے ہوئے ہیں مثال کے طور پر میراث اور بعض دوسرے مسائل کے سلسلے میں ان سے مروی اقوال، تو پھر ظاہر ہے کہ ترجمان القرآن سے کم تر رتبے کے لوگوں کے اقوال اور ان کی رایوں کے سلسلے میں تو یہ اصول بدرجۂ اولیٰ نافذ ہوگا۔ جب ترجمان القرآن کے خیالات اور ان کی رائیں تنقید سے بالاتر نہیں تو پھر ان لوگوں کی تو بات ہی کیا ہے جو ان کے شاگردوں کے شاگردوں کے مقابلے میں بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

اس اصول کو سامنے رکھ کر اگر ہم بڑے بڑے ائمہ تفسیر کی رایوں کا جائزہ لیں تو ہر ایک

کے یہاں ہمیں کچھ نہ کچھ ایسی چیزیں ضرور مل جائیں گی جنھیں بمشکل ہی قبول کیا جاسکے گا۔ امام المفسرین علامہ ابن جریر طبری کا بحیثیت مفسرِ قرآن کے جو مرتبہ ہے اور ان کی تفسیر کو دیگر کتب تفاسیر میں جو امتیازی مقام حاصل ہے اس سے کون واقف نہیں ہے۔ لیکن بسا اوقات یہ بھی انتہائی کمزور اور دور از کار تاویلات اختیار کر لیتے ہیں۔

مثال کے طور پر آیت کریمہ :

وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ ۔ (نساء-۳۴) اور ان کا ساتھ چھوڑ دو خواب گاہوں میں

کی تفسیر وہ 'فَقَيِّدُوهُنَّ' (انھیں قید میں رکھو) سے کرتے ہیں۔ 'هَجْرُ الْبَعِيرِ' سے جس کے معنی ہیں، شَدَّهُ بِالْهِجَارِ، یعنی اس کو باندھ دیا 'ہجار' سے 'ہجار' وہ رسی جس سے اونٹ کو باندھا جاتا ہے۔ آیت کے معنیٰ یہ ہوئے کہ : ان عورتوں کو باندھ اور روک رکھو تاکہ جس چیز سے انھیں منع کیا جارہا ہے، اسے انجام دینے کی ان کے لئے کوئی صورت باقی نہ رہے۔ شاید اس تفسیر کے اسی طرح کے مقامات کو دیکھ کر موصوف کے بعض معاصرین نے اس پر کافی سخت تبصرے کئے ہیں۔

اسی طرح مثال کے طور پر وہ سورہ مائدہ کی آیات :

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔	(۴۴)	اور جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے (قانون) کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو وہی لوگ کافر ہیں۔
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ	(۴۵)	تو وہی لوگ ظالم ہیں۔
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ	(۴۷)	تو وہی لوگ فاسق ہیں۔

کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ ان کا تعلق اہل کتاب سے ہے۔ حالانکہ اعتبار الفاظ کے عموم کا کیا جانا چاہئے نہ اس خاص پس منظر کا جس میں کوئی آیت نازل ہوئی۔

حضرت حذیفہ بن یمانؓ کے سامنے ان آیات کا تذکرہ آیا تو ایک شخص نے کہا کہ یہ بنی اسرائیل کے سلسلے میں آئی ہیں۔ اس کے جواب میں انھوں نے جو بات کہی وہ غور سے سننے کے لائق ہے۔ آپؓ نے فرمایا "اچھے بھائی تم کو بنی اسرائیل ملے کہ میٹھا میٹھا تو سب تمہارے لئے اور کڑوا ان کے لئے۔ آپ کے فرمانے کا منشا یہ تھا کہ: آخر کیا وجہ ہے کہ اگر بنی اسرائیل اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو ان پر تو کفر ظلم اور فسق کا الزام آئے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنا جو قانون تم پر نازل کیا ہے اگر تم اس کے مطابق فیصلہ نہ کرو تو تم اسی طرح پاک صاف بنے رہو۔

ان مثالوں کے ذکر نے کا مقصد یہ ہے کہ کمزور اقوال اور دور از کار تاویلات سے بہر حال گریز کیا جانا چاہئے۔ خواہ اُن کا کہنے والا کتنے ہی بلند مرتبے کا حامل کیوں نہ ہو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کیا خوب بات کہی ہے کہ لوگوں کے ذریعہ حق جاننے کی کوشش نہ کرو۔ پہلے حق کو پہچانو خود ہی پتہ چل جائے گا کہ حق والے کون ہیں: لاتعرف الحق بالرجال، اعرف الحق تعرف اھلہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت

اسلامی ثقافت کا دوسرا ماخذ

داعی کی دینی ثقافت کا دوسرا ماخذ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ یہ دراصل کتاب اللہ کی تشریح ہے جو اس کے اشکالات کی وضاحت کرتی اور اس کے اجمال کو تفصیل کا قالب عطا کرتی ہے۔ بھر یہی سنت ہے جس کے آئینے میں کتاب اللہ کی نظری تفسیر و ترجمانی کے ساتھ اس کے عملی انطباق کی جلوہ نمائی بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْهِمْ۔ (نحل - ۴۴)

اور ہم نے تمہارے پاس اس یاد دہانی کو اتارا ہے تاکہ تم لوگوں کے لئے کھول دو اس چیز کو جو ان کے پاس اتاری گئی ہے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔ (نحل - ۶۴)

اور ہم نے تمہارے اُوپر اس کتاب کو اسی لئے اتارا ہے کہ تم کھول دو ان کے لئے اس چیز کو جس میں یہ باہم اختلاف کریں اور یہ ہدایت اور

رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو مانتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عائشہؓ سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو ان کا جواب تھا: آپؐ کا اخلاق سراپا قرآن کی عملی تفسیر تھا۔ کَانَ خُلُقُہُ القرآن [1]

یہاں ہم جس چیز کو سنت کہہ رہے ہیں، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال، تقریر[2] نیز آپ کے اوصاف وعادات اور سیرت وکردار تمام چیزیں شامل ہیں۔ اس طرح یہ سنت آپؐ کی پوری زندگی اور دعوت دین کی راہ میں آپ کی جدوجہد اور قربانیوں کا ایک جامع ریکارڈ ہے، اور اپنے اندر جوامع الکلم، حکمت کے جواہر پارے، معرفت کے ذخیرے، اسرار دین، وجود کے حقائق، مکارم اخلاق، بے مثال قانون سازی، مسائل کے دائمی حل، تربیت کے باریک نکات، مشکل مواقع پر اعلیٰ ترین رہنمائی اور فصاحت وبلاغت کے بلند ترین نمونوں کے ایک لازوال خزانے کو چھپائے ہوئے ہے۔ جیسے جس قدر بھی استعمال کیا جائے ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ نہ گردش لیل ونہار اس کی تروتازگی میں کوئی فرق پیدا کرتی ہے پس دعوت دین کا حق ادا کرنے کے خواہش مند کسی شخص کے لئے اس کے بغیر چارہ نہیں کہ وہ اس بے پایاں سرمائے کی طرف رجوع کرے اور اس کے چشمۂ صافی سے سیراب ہونے کی کوشش کرے۔ بلالحاظ اس کے کہ وہ کسی مدرسے کا استاد ہے یا کسی کالج یا یونیورسٹی کا لکچرر، مسجد میں

---

[1] ابن سعد: الطبقات الکبریٰ۔ ۱/۳۶۴ دار صادر بیروت (مترجم)

[2] تقریر نام ہے اس کا کہ آپ کے سامنے کوئی عمل کیا گیا ہو اور آپ کی طرف سے اس کے سلسلے میں کسی ممانعت یا ناپسندیدگی کا اظہار سامنے نہ آیا ہو۔ حضورؐ کے اقوال وافعال کی طرح یہ تقریر بھی دین میں سند کا درجہ رکھتی ہے۔ (مترجم)

خطابت کے فرائض انجام دیتا ہے یا مصنف اور صاحب قلم ہے مذاق اور صلاحیتوں کا اختلاف اپنی جگہ اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن اتنی بات طے ہے کہ جب تک وہ خود پورے طور پر اپنے کو اس چشمۂ صافی سے سیراب نہ کرے گا دوسروں کی تشنگی رفع کرنے کا اس کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جس ہدایت اور علم کی روشنی کے ساتھ مبعوث ہوئے، اس سے استفادہ کرنے اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے سلسلے میں مختلف افراد اور انسانی جماعتوں کی کیا سطح ہوگی ایک حدیث پاک میں جو بخاری ومسلم دونوں میں مذکور ہے۔ آپؐ نے اس کی بہت ہی دلکش تصویر کشی کی ہے جس سے بات پوری طرح نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَثَلُ مَا بَعَثَنِیَ اللّٰہُ بِہٖ مِنَ الْھُدٰی وَالْعِلْمِ کَمَثَلِ الْغَیْثِ الْکَثِیْرِ اَصَابَ اَرْضًا. فَکَانَتْ مِنْھَا طَائِفَۃٌ قَبِلَتِ الْمَاءَ فَاَنْبَتَتِ الْکَلَاءَ وَالْعُشْبَ الْکَثِیْرَ وَکَانَ مِنْھَا اَجَادِبُ اَمْسَکَتِ الْمَاءَ فَنَفَعَ اللّٰہُ بِھَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا مِنْھَا وَسَقُوْا وَزَرَعُوْا وَاَصَابَ طَائِفَۃً اُخْرٰی اِنَّمَا ھِیَ قِیْعَانٌ لَا تُمْسِکُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ کَلَاءً فَذٰلِکَ مَثَلُ مَنْ فَقِہَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ وَنَفَعَہٗ

اللہ نے جو ہدایت اور علم دے کر مجھے بھیجا ہے اس کی مثال اس بڑی بارش کی ہے جو کسی زمین پر ہو۔ پس اس میں ایک طرح کا ٹکڑا تو وہ رہا جس نے پانی کو اپنے دامن میں جگہ دی جس کے نتیجے میں گھاس اور بہت سارا چارہ اگا۔ دوسرا ٹکڑا نشیب (لیکن بے صلاحیت) زمین کا رہا جس نے پانی کو اپنے اندر روک لیا، سو اللہ نے اس کے ذریعہ لوگوں کو فائدہ پہنچایا، چنانچہ انھوں نے اس سے خود پیا، مویشیوں کو سیراب کیا اور کھیتوں کی سینچائی کی اور اس طرح ان کی خوب اچھی کاشت ہوئی۔ ایک دوسرا ٹکڑا

مَا بَعَثَنِيَ اللّٰهُ بِهٖ فَعَلِمَ وَعَلَّمَ وَمَثَلُ مَنْ لَّمْ يَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَاْسًا وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللّٰهِ الَّذِيْۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ۔ [1]

جہاں یہ بارش پہنچی وہ چٹیل اور ہموار زمین کا تھا جو نہ پانی کو روک سکتا ہے نہ اس کے اندر گھاس اور چارہ اگانے کی صلاحیت ہے۔ پس یہی مثال ہے اس شخص کی جس نے اللہ کے دین کے معاملہ میں سمجھ پیدا کی اور اللہ نے جو ہدایت اور روشنی، مجھے دے کر بھیجا تھا اس کے ذریعہ اس کو فائدہ پہنچا۔ چنانچہ اس نے خود اس علم (وہدایت) کو سیکھا اور دوسروں کو بھی سکھایا۔ اور اس کی جس نے اس کے لئے اپنا سر نہ اُٹھایا، اور وہ رشد وہدایت جسے دے کر میں بھیجا گیا ہوں اسے تسلیم کرنے سے باز رہا۔

حدیث پاک میں جس زمین کو زرخیز کہا گیا ہے جو پانی کو قبول کرتی اور اس سے سیراب ہوتی ہے اور پھر گھاس چارے اور پودے اگاکر دوسروں کے بھی نفع کا سامان کرتی ہے یہ مثال ہے ان اہل علم کی جو تفقہ اور درایت کی دولت سے آراستہ ہوں۔ دوسری زمین جو صرف پانی کو روک لیتی ہیں جس کی وجہ سے دوسرے لوگ اس سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں یہ ان اہل علم کی مثال ہے جن کو اللہ کی طرف حفظ وروایت کی نعمت ملی ہوئی ہے۔ رہی وہ سنگلاخ زمین جس کا ذکر آخر میں ہے تو یہ اس نادان اور گمراہ گروہ کی مثال ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کئے گئے علم اور آپ کی لائی ہوئی ہدایت سے کچھ بھی فائدہ نہ اُٹھا سکا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کو پیش کرنے والی کتابیں بہت ساری ہیں لیکن داعی کو چاہئے کہ وہ اپنے لئے مقدم ان کتابوں کو قرار دے جو ان میں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ مثلاً صحاح ستہ، مسند دارمی، موطا امام مالک اور مسند احمد بن حنبل وغیرہ۔

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح میں اس متفق علیہ روایت کے الفاظ اس سے تھوڑے سے مختلف ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ کتاب الایمان۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ (مترجم)

ان میں سے بعض کتابوں کا علماء نے 'اختصار' بھی کر دیا ہے۔ جس کے پاس وقت کی کمی ہو یا ہمت اجازت نہ دے وہ ان 'اختصارات' کے مطالعہ سے بھی بڑی حد تک کام چلا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر زبیدی کی 'التجرید الصریح' جو صحیح بخاری کا اختصار ہے۔ البتہ اس میں اس کے مکررات اور تعلیقات اور اسانید کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح صحیح مسلم کا حافظ منذری کا 'اختصار' جو محدث ناصر الدین البانی کی تحقیق کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ دوسری طرف کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جن میں ان تمام کتابوں یا ان کی بعض حدیثوں کو یکجا کرنے کا کام کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ابن اثیر کی 'جامع الاصول' جس میں انھوں نے اصول خمسہ یعنی صحیحین بخاری ومسلم نیز سنن ابو داؤد، ترمذی ونسائی کی حدیثوں کو جمع کر دیا ہے۔ البتہ چھٹے نمبر پر انھوں نے ابن ماجہ کے بجائے موطا امام مالک کو رکھا ہے۔ اس لئے کہ ابن ماجہ میں بہت سی ضعیف روایتیں بھی موجود ہیں، بلکہ کئی ایک حدیثوں کو تو موضوع بھی کہا گیا ہے۔ اسی لئے بہت سے حفاظ حدیث کی رائے یہ رہی ہے کہ صحاح ستہ کی فہرست میں اگر ابن ماجہ کی جگہ مسند دارمی ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔ ابن اثیر نے اپنی اس کتاب میں مکررات کو حذف کر دیا ہے۔

اسی طرح ہیثمی کی 'مجمع الزوائد' ہے۔ جس میں انھوں نے مسند احمد، مسند بزار اور مسند ابو یعلیٰ نیز طبرانی کی تینوں معاجم یعنی کبیر اوسط اور صغیر، ان سب کے زوائد کو جمع کر دیا ہے۔ یہ کتاب دس جلدوں میں مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔ زوائد سے مراد ان کتابوں میں ذکر کی گئی وہ حدیثیں ہیں جو صحاح ستہ کے علاوہ ہیں۔ صحاح ستہ جس میں ابن ماجہ بھی شامل ہے۔

گیارہویں صدی ہجری کے ایک عالم دین 'علامہ محمد بن محمد بن سلیمان متوفی ۱۰۹۴ھ' نے اس سلسلے میں بڑی گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔ انھوں نے ایک کتاب مرتب کی

جس میں ابن اثیر اور ہیثمی کے زوائد کو جمع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی دارمی اور ابن ماجہ کے زوائد کا بھی اضافہ کر دیا جس کی وجہ سے کوئی شک نہیں کہ ان کی یہ کتاب حدیث کا ایک انسائیکلوپیڈیا بن گئی ہے جس میں حدیث کی چودہ کتابوں میں پھیلی ہوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دس ہزار حدیثیں جمع ہو گئی ہیں۔ انھوں نے اپنی اس کتاب کا نام 'جمع الفوائد من جامع الاصول ومجمع الزوائد' رکھا ہے۔

احادیث نبوی کی اس خاص انداز سے جمع و ترتیب کے علاوہ ایک دوسرا رنگ یا ایک نیا ڈھنگ بھی پایا گیا اور وہ یہ کہ احادیث کو ان کے اوائل کے اعتبار سے حروف تہجی کی ترتیب سے جمع کیا جائے۔

حافظ سیوطی نے اپنی دو کتابوں میں یہی طرز اختیار کیا ہے۔ پہلی کتاب کا نام ہے 'الجامع الصغیر فی احادیث البشیر النذیر'۔ ایک دوسرے محدث شیخ نبہانی نے اپنی ایک کتاب میں اس پر کچھ اضافے بھی کئے ہیں جس کا نام ہے 'الفتح الکبیر بزیادۃ الجامع الصغیر'۔

سیوطی کی دوسری کتاب 'الجامع الکبیر' ہے جس میں انھوں نے حدیث کی کتابوں میں سے انھیں جو کچھ بھی مل سکا ہے ان سب کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعد میں ایک ہندوستانی عالم دین شیخ علاء الدین علی المتقی نے اسے ابواب اور موضوعات کے لحاظ سے ایک الگ کتاب میں مرتب کر دیا ہے۔ حدیث کا یہ انسائیکلوپیڈیائی ذخیرہ 'کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال' کے نام سے ضخیم مجلدات میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

اس کے علاوہ کچھ دوسری کتابیں ہیں جن کا موضوع خاص طور پر صرف ایک قسم کی حدیثوں کو جمع کرنا ہے۔ مثال کے طور پر اذکار و ادعیہ اور اس سے ملتی جلتی حدیثیں۔ اس کا نمونہ امام نووی کی کتاب 'الاذکار' ہے۔ یا مثلاً شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی 'الکلم الطیب'۔ اسی طرح مثال

کے طور پر آداب و فضائل اور ان سے ملتی جلتی احادیث کے مجموعے جس کا نمونہ ہمیں امام بخاری کی 'الادب المفرد'، امام بیہقی کی 'شعب الایمان' اور نووی کی 'ریاض الصالحین' میں ملتا ہے۔ یا مثلاً وہ مجموعے جن میں ترغیب و ترہیب کے سلسلے کی حدیثوں کو جگہ دی گئی ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ انسان خیر و طاعت کی طرف راغب ہو اور اس کے اندر ان کی انجام دہی کا شوق ابھرے۔ برائی و معصیت کے تئیں اس کے دل میں ڈر پیدا ہو اور وہ ان سے مجتنب رہے۔ حافظ منذری کی 'ترغیب و ترہیب' اسی سلسلے کی شاہکار ہے۔ اسی طرح احکام سے متعلق حدیثوں کے بھی ایک سے زائد مجموعے ہمارے سامنے ہیں۔ مثال کے طور پر حافظ مقدسی کی 'عمدۃ الاحکام' اس میں صرف صحیحین یعنی بخاری ومسلم کی احکامی احادیث شامل ہیں۔ اسی طرح ابن دقیق العید کی 'الالمام' ہے۔ اس کے علاوہ اس سلسلے کے دو اہم مجموعے اور بھی ہیں یعنی مجد ابن تیمیہ کی 'منتقی الاخبار من احادیث سید الاخیار' اور حافظ ابن حجر کی 'بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام'۔

حدیث کے ان مختلف النوع مجموعوں کے پہلو بہ پہلو شروح احادیث کا بھی ایک سلسلہ ہے۔ شرح کی یہ کتابیں بھی داعی کے لئے بیحد مفید ہیں جن سے وہ کسی صورت بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے۔ انہی شروح کی بدولت آدمی کے سامنے حدیث، فقہ، اصول شریعت، لغت، ادب، تاریخ اور اخلاق کے وہ نکتے سامنے آتے ہیں جن کی اہمیت کا بس وہی شخص انکار کر سکتا ہے جس کو عقل وفہم سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ شرح کی یہ کتابیں حدیث کے مشکل مقامات اور ان کے ظاہری تعارضات کو حل کرنے کے سلسلے میں شاہ کلید کا درجہ رکھتی ہیں۔ ایک حدیث اپنے اندر کن احکام و ہدایات کو سمیٹے ہوئے ہے اور وہ کن قانونی اور اصولی دفعات کی نشاندہی کرتی ہے اس کی واقفیت حاصل کرنے والے کے لئے یہ شرحیں چراغ راہ کا کام دیتی ہیں۔ دین کے کسی طالب علم کے لئے روا نہیں کہ وہ اس عظیم سرمائے سے اپنی آنکھیں بند کر کے آگے بڑھے

اور بالکل ایک نئی پگڈنڈی پر یکہ و تنہا اپنے سفر کا آغاز کرے۔ یہ رویہ علم کی منطق کے منافی تو ہے ہی، عقل اور تاریخ کی منطق کے بھی منافی ہے۔

شرح کی ان کتابوں میں :

۱۔ بخاری کی شروح میں مثال کے طور پر علامہ عینی کی 'عمدۃ القاری' ہے۔ اسی طرح قسطلانی کی 'ارشاد الساری' اور حافظ ابن حجر کی 'فتح الباری'۔ اور اسی موخر الذکر کے بارے میں علامہ شوکانی کا یہ مشہور جملہ ہے کہ : لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ[1] یعنی کہ 'فتح الباری کے لکھے جانے کے بعد کسی دوسری طرف کا رُخ کرنا صحیح نہیں'۔

۲۔ مسلم کی شرحوں میں سب سے نمایاں نووی کی شرح ہے۔ اس کے علاوہ ابی اور سنوسی کی شرحیں ہیں[2]۔

۳۔ ابوداؤد کی شرحوں میں مثلاً خطابی کی 'معالم السنن' اور ابن قیم کی 'تہذیب السنن' ہے۔ اسی طرح دیانوی کی 'عون المعبود' اور علامہ خلیل احمد سہارنپوری کی 'بذل المجہود'۔ اسی طرح اس کی ایک شرح محمود خطاب سبکی کی 'المنہل العذب المورود' ہے۔ اگرچہ وہ مکمل نہیں ہو سکی ہے۔

۴۔ ترمذی کی شرحوں میں مثال کے طور پر ابن عربی کی 'عارضۃ الاحوذی' ہے۔ اور علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری کی 'تحفۃ الاحوذی'۔

۵۔ نسائی کی شرح میں علامہ سیوطی اور سندی کی اس پر تعلیقات ہیں۔

---

[1] یہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث : لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَّنِيَّةٌ ۔ (متفق علیہ) سے لطیف استعارہ ہے۔ جس کی مختصر تشریح کے لئے ملاحظہ ہو: ریاض الصالحین/۲۔ (مترجم)

[2] علامہ شبیر احمد عثمانی کی 'فتح الملہم' اگرچہ وہ کتاب کے صرف نصف حصے کی شرح ہے لیکن وہ جس امتیازی حیثیت کی حامل ہے اس کے پیش نظر شروح مسلم کے ذیل میں اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ (مترجم)

۶۔ موطا کی شرحوں میں مثال کے طور پر ابوالولید باجی کی 'المنتقی'، علامہ سیوطی کی 'تنویر الحوالک'، شاہ ولی اللہ دہلوی کی 'مسوّٰی'، اور شیخ زکریا کاندھلوی کی 'اوجز المسالک' ہے[1]۔

۷۔ مسند احمد حنبل کی شرح 'الفتح الربانی' احمد بن عبدالرحمٰن البناء کے قلم سے جس میں انھوں نے اس کی احادیث کی تخریج اور اس کی شرح کے ساتھ از سرِ نو اس کی ترتیب بھی قائم کی ہے۔ اسی طرح احمد محمد شاکر کی تحقیق سے مسند کے جو اجزاء شائع ہوئے ہیں اس پر ان کی تعلیقات بھی ہیں۔

۸۔ 'مشکاۃ المصابیح' کی ایک شرح تو ملا علی قاری کی 'مرقاۃ المفاتیح' ہے جو پانچ ضخیم جلدوں میں ہے۔ اس کے مولانا عبیداللہ مبارکپوری کی 'مرعاۃ المفاتیح' ہے۔ (جس کے کئی اجزاء شائع ہو چکے ہیں، آگے سلسلہ جاری ہے)

۹۔ 'الجامع الصغیر' کی شرح علامہ مناوی کی 'فیض القدیر' ہے جو چھ ضخیم جلدوں میں ہے۔ اس کا اختصار کر کے ایک دوسری شرح انھوں نے 'التیسیر' کے نام سے لکھی جو دو جلدوں میں ہمارے سامنے مطبوعہ موجود ہے۔ اسی طرح اس کی ایک دوسری شرح عزیزی کی 'السراج المنیر' ہے جو تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

۱۰۔ 'ریاض الصالحین' کی شرح 'دلیل الفالحین' کے نام سے جو چار جلدوں میں ہے۔

---

[1] موطا کی شرحوں میں امام دہلوی کی فارسی شرح 'مصفّٰی' بھی ہے۔ اس کے علاوہ علامہ ابن عبدالبر کی جو غالباً اس کی سب سے پہلی شرح ہے 'التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید' مراکش سے اس کی آٹھ جلدیں اب تک منظر عام پر آ چکی ہیں۔ (مترجم)

۱۱۔ امام نووی کی 'الاربعین' کی مختلف شروح[1] اسی طرح حدیث کا ایک دوسرا مجموعہ 'الخمسین الرجبیہ' ہے جس کی سب سے عظیم الشان شرح بلاشبہ خود ابن رجب ہی کی ہے جس کا نام انھوں نے 'جامع العلوم والحکم فی شرح خمسین حدیثا من جوامع الکلم' رکھا ہے۔

۱۲۔ احکامی احادیث کی شروح مثلاً علامہ ابن دقیق العید کی 'الاحکام بشرح عمدۃ الاحکام' اس پر امام صنعانی کا حاشیہ بھی ہے جو 'العدۃ' کے نام سے ہے۔ اسی طرح علامہ شوکانی کی 'نیل الاوطار' جو 'منتقی الاخبار' کی شرح ہے۔ نیز علامہ صنعانی کی 'بلوغ المرام' کی شرح 'سبل السلام'۔

اس کے ساتھ ہی حدیث کے طالب علم کو 'غریب الحدیث' کی کتابوں کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس سے مراد وہ کتابیں ہیں جو حدیث کے مفرد الفاظ اور اس کے مشکل مقامات کی شرح پیش کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ابوعبید بن سلام کی 'غریب الحدیث'، جو اس موضوع پر ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ قاضی عیاض کی 'مشارق الانوار'[2] اسی موضوع سے متعلق ہے[3]

مطالعہ سنت چند ہدایات | اس موقعہ پر میں دعوت وتبلیغ کے کام میں لگے ہوئے اپنے بھائیوں اور ان فرزندان اسلام کے لئے جو دعوت دین کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں چند

---

[1] مثلاً ملا علی قاری کی 'المبین المعین لفہم الاربعین'، اور ابن حجر ہیثمی کی 'فتح المبین لشرح الاربعین' وغیرہ (مترجم)

[2] خوشی کی بات ہے کہ قاضی عیاض کی یہ کتاب بھی مراکش سے 'البلعمشی احمد یکن کی تحقیق سے شائع ہو رہی ہے۔ جس کی ایک جلد منظر عام پر آچکی ہے۔ کتاب کا پورا نام 'مشارق الانوار علی صحاح الآثار' ہے۔ (مترجم)

[3] غریب الحدیث کی اس فہرست میں علامہ محمد طاہر پٹنی کی 'مجمع بحار الانوار' کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جو کہیں کہیں ابن اثیر کی 'النہایۃ' پر اضافہ پیش کرتی ہے۔ (مترجم)

اہم ہدایات گوش گذار کرنی چاہوں گا، حدیث کا مطالعہ کرتے ہوئے جن کا پیش نظر رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

سنت پر عمل کا اہتمام | اس سلسلے میں سب سے پہلے ضرورت اس بات کی ہے کہ سنت کے عملی پہلو کی طرف خاص طور پر توجہ صرف کی جائے۔ سنت کا یہ وہ حصہ ہے جو آپؐ کی سیرت اور عملی زندگی سے متعلق ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے سامنے پیش آنے والے مختلف معاملات ومسائل میں آپؐ نے کیا موقف اختیار کئے، نیز یہ کہ دین ودنیا سے تعلق رکھنے والے جملہ امور میں آپؐ کا کیا نقطۂ نظر رہا۔

اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے اس پہلو کو پیش نظر رکھیں تو اسلام ایک انسان کی زندگی میں ہمہ تن مجسم دکھائی دیتا نظر آئے گا، اور محسوس ہوگا کہ ہمارے سامنے گویا قرآنی تعلیمات وہدایات کا ایک چلتا پھرتا نمونہ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عائشہ صدیقہؓ سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو ان کا جواب تھا:

'كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ' یعنی آپؐ مجسم قرآنی اخلاق کا پیکر تھے۔ گویا قرآن جن فضائل اور اخلاق عالیہ کی دعوت دیتا ہے آپؐ کی شخصیت اس کا ایک زندہ اور جیتا جاگتا نمونہ تھی۔

مثال کے طور پر اسلام عدل وانصاف کا علمبردار ہے، اور اسے اپنے پیش نظر زندگی کی اعلیٰ ترین قدروں اور اپنے بنیادی اصولوں میں سے ایک قرار دیتا ہے۔ ظلم وناانصافی کا وہ مخالف ہے۔ خواہ وہ کسی صورت میں پائی جاتی ہو۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور آپؐ کی عملی زندگی، زندگی کے تمام دائروں میں اس عدل وانصاف کو روبکار لانے کی ایک زندہ مثال ہے۔ اپنے نفس کے ساتھ عدل وانصاف، خاندان کے ساتھ عدل وانصاف،

---

[1] طبقات ابن سعد ۱/۳۶۴ (مترجم)

اعزہ واقارب کے ساتھ عدل وانصاف، دوستوں کے ساتھ عدل وانصاف، دشمنوں کے ساتھ عدل وانصاف، غرضیکہ اس عدل وانصاف کی جتنی بھی صورتیں اور مظاہر ہو سکتے ہیں، سیرت پاکؐ ان کے بے شمار نمونوں سے بھری پڑی ہے۔ حدیث اور سیرت کی کتابوں کا تتبع کرکے داعی ان نمونوں کو بآسانی تلاش کر لے سکتا ہے۔

اسی طرح مثال کے طور پر اسلام شورائیت کی تعلیم دیتا ہے، اور اسے اپنے نقشے کے مطابق سیاسی اور اجتماعی زندگی کی ایک اہم بنیاد تصور کرتا ہے لیکن اسلام کے اس اہم ترین اصول کا انطباق عملی زندگی میں کیونکر ہو اس کی وضاحت ہمارے سامنے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے ہوتی ہے۔ بدر واحد اور خیبر واحزاب وغیرہ کے غزوات کا مطالعہ کرکے آدمی اس حقیقت کو آسانی کے ساتھ معلوم کر سکتا ہے۔ اسی طرح مثلاً اسلام کچھ اخلاقی فضائل کا علمبردار ہے جیسے سچائی، امانت، ایفائے عہد، صبر، سخاوت، شجاعت اور رحم وغیرہ۔ اب یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ ہی ہے جس کے آئینے میں ہم ان اخلاق عالیہ کے عملی انطباق کی جلوہ نمائی کر سکتے ہیں۔

اسی طرح تمام اصول وکلیات اور حقائق اور قدریں جنھیں اسلام پیش کرتا ہے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کو الگ کرکے زندگی میں ان کی رونمائی ممکن نہیں۔ اس لئے داعی کے لئے ضروری ہے کہ کسی موضوع پر کلام کرتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر کو آیات واحادیث سے واضح کرنے کے ساتھ اس کے حق میں حیات طیبہ کے عملی شواہد کو بھی لازماً پیش نظر رکھے۔ اس کے بغیر گفتگو صرف نظریاتی رہے گی، عملی زندگی سے اس کا سر رشتہ نہیں جڑ سکے گا۔

مثال کے طور پر اگر ایک شخص 'تواضع' کے موضوع پر گفتگو کر رہا ہے تو اس کے لئے کسی طرح مناسب نہیں ہوگا کہ صرف اس سلسلے کی آیتوں اور حدیثوں کو جمع کر دے۔ اس کی گفتگو مکمل اسی وقت

ہو سکے گی جبکہ وہ یہ دکھائے کہ کس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اہل خانہ اور صحابہ کرامؓ کے درمیان خاکساری اور تواضع کا پیکر ہوتے تھے۔ اپنے جوتے خود گانٹھ رہے ہیں، اپنے کپڑوں پر پیوند خود لگا رہے ہیں، اپنی بکری خود دوہ رہے ہیں۔ اور غلام اور باندی کے ساتھ مل کر چکی پیسنے میں بھی کوئی عار نہیں ہے۔

اسی طرح صحابہ کرامؓ کے ساتھ اس طرح بیٹھتے ہیں گویا وہ بھی انہی میں سے ایک ہیں یہاں تک کہ ایک اجنبی شخص آتا ہے تو اس کے لئے ان کے درمیان آپؐ کو پہچاننا مشکل ہوتا ہے۔ سفر ہو یا حضر آپؐ کہیں بھی اپنے کو عام لوگوں سے ممتاز رکھنا گوارہ نہ کرتے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ (سفر میں) آپؐ نے اپنے ذمہ یہ کام لیا کہ لوگوں کے کھانے پکانے کے لئے لکڑیاں جمع کریں گے[1] اسی طرح غزوۂ بدر میں اس کے لئے کسی طرح آمادہ نہ ہوئے کہ آپ سواری پر چلیں اور آپ کے دونوں ساتھی پیدل چلیں، حالانکہ وہ دل کی خوشی اور پوری آمادگی کے ساتھ آپؐ کے سامنے اس کی پیشکش کرتے ہیں لیکن یہ کہہ کر آپؐ انھیں خاموش فرما دیتے ہیں کہ: مجھ سے زیادہ پیدل چلنے پر تمہیں قدرت ہے، نہ میں تمہارے مقابلے میں خدا تعالیٰ کے اجر وثواب سے بے نیاز ہوں۔ مَا أَنْتُمَا بِأَقْوَىٰ مِنِّي عَلَى الْمَشْيِ. وَمَا أَنَا بِأَغْنَىٰ مِنْكُمَا عَنِ الْأَجْرِ[2]

اس مقام پر اپنے دعوتی رفقاء کے سامنے اس بات کا ذکر کر دینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ

---

[1] خلاصۃ السیر/۲۲۔ بحوالہ: الرحیق المختوم لصفی الرحمٰن المبارکفوری/۲۴۷ (مترجم)

[2] مسند احمد ۱/۴۱۸، البتہ اس کے الفاظ ہیں: مَا أَنْتُمَا بِأَقْوَىٰ عَلَى الْمَشْيِ مِنِّي وَلَا أَنَا بِأَغْنَىٰ عَنِ الْأَجْرِ مِنْكُمَا. سفر کے یہ دونوں ساتھی ابولبابہؓ اور حضرت علی بن طالبؓ تھے۔ سواری ایک ہی تھی جس پر یہ حضرات باری باری سوار ہوتے تھے۔ حضور پاک کی پیدل باری پر ان حضرات نے یہ پیشکش کی تھی جس کے جواب میں آپؐ نے مذکورہ کلمات ارشاد فرمائے نیز ملاحظہ ہو۔ حوالہ مذکور کے صفحے ۲۱۱، ۲۲۲، ۲۴۴ (مترجم)

سیرت کی عام اور مشہور کتابوں مثلاً 'سیرت ابن ہشام' اور سہیلی کی اس کی شرح 'الروض الانف' مقریزی کی 'امتاع الاسماع' اور 'سیرۃ الحلبیہ' وغیرہ، کے علاوہ اس کے کچھ دوسرے مآخذ بھی ہیں۔ سیرت کی ان معروف کتابوں کے ساتھ ان دیگر ماخذ سے بھی حتی الامکان لازماً استفادہ کیا جانا چاہیئے۔

یہ مآخذ ہیں :

۱۔ قرآن کریم اور اس کی تفاسیر۔ خاص طور پر وہ تفسیریں جن میں روایتوں کا اہتمام ہے۔ جنھیں 'تفسیر ماثور' کا نام دیا جاتا ہے۔

۲۔ کتب احادیث جن میں نہ صرف آپؐ کے اقوال ملتے ہیں۔ بلکہ ان کے اندر آپؐ کے افعال، کن کاموں پر آپ نے اپنی رضامندی ظاہر فرمائی، آپؐ کا حلیہ مبارکہ، آپؐ کے اخلاق اوصاف وکمالات، نیز یہ کہ آپؐ کی دعوت کن کن مراحل سے ہو کر گذری، آپؐ نے کس طرح جہاد کیا اور کس طرح غزوات کو ترتیب دیا۔ اس کے علاوہ آپؐ کی زندگی میں کون سے اہم اور نمایاں موڑ پیش آئے۔ ان سب چیزوں کی تفصیل موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ کتب احادیث کا یہ سرمایہ ہمارے سامنے آپؐ کی زندگی کا پورا ریکارڈ پیش کرتا ہے۔

۳۔ آپ کے عادات وخصائل اور زندگی کے مختلف دائروں میں آپؐ کی قولی اور عملی رہنمائی کو پیش کرنے والی کتابیں جنھیں 'شمائل' اور 'ہدی نبوی' کی کتابیں کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر امام ترمذی کی 'الشمائل المحمدیہؐ' جس کی ایک سے زیادہ شرحیں لوگوں نے لکھی ہیں۔ یا مثلاً علامہ ابن قیم کی 'زاد المعاد فی ہدی خیر العباد' ہے۔ (جسے اس ذیل میں شاہکار کی حیثیت حاصل ہے۔

۴۔ تاریخ کی عام کتابیں، مثال کے طور پر تاریخ طبری، ابن اثیر کی الکامل فی التاریخ اور

حافظ ابن کثیر کی 'البدایہ والنہایہ' وغیرہ۔ کہ ان میں سے ہر کتاب میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر سیر حاصل ابواب موجود ہیں۔ خاص طور پر حافظ ابن کثیر کی کتاب اس سلسلے میں سب سے ممتاز ہے جس کا سیرت کا حصہ الگ سے بھی نئی تحقیق کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

۵۔ 'دلائل النبوۃ' کے موضوع سے متعلق کتابیں۔ جن میں ان خوارق اور معجزات کی تفصیل ہے جو آپؐ کے دست مبارک پر ظاہر ہوئے۔ نیز غیب کی ان خبروں کی جن سے آپؐ نے اُمت کو آگاہ فرمایا۔

احادیث کی جمع وترتیب | اس سے قبل قرآن کے سلسلے میں ہم جس چیز کی طرف توجہ دلا چکے ہیں کہ داعی کو چاہیئے کہ ایک موضوع سے تعلق رکھنے والی آیتوں کو جمع کرے پھر ان کا تجزیہ کر کے ان کو مختلف عنوانات کے تحت ترتیب دینے کی کوشش کرے یہاں حدیث کے سلسلے میں بھی ہم اسی بات کی طرف توجہ مبذول کرانی ضروری سمجھتے ہیں۔

پس داعی کو چاہیئے کہ جو موضوع اس کے پیش نظر ہو اس سے مناسبت رکھنے والی حدیثوں کو ان کے امکانی مآخذ (مظان یعنی حدیث کے مختلف مجموعوں سے ایک ایک کر کے چننے کی کوشش کرے۔ اس سلسلے میں خاص طور پر حدیث کے ان مجموعوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے جن میں موضوع کی مناسبت سے ابواب اور فصلوں کی ترتیب پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر صحاح ستہ (بخاری، مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) موطا امام مالک، مسند دارمی، سنن بیہقی، مستدرک حاکم، اور مجمع الزوائد وغیرہ۔ یہی انداز امام نووی کی ریاض الصالحین اور حافظ منذری کی ترغیب و ترہیب' وغیرہ کا بھی ہے۔ البتہ اس چیز سے احتیاط برتنے کی ضرورت ہے کہ اس ذیل میں کمزور اور موضوع حدیثیں شامل نہ ہونے پائیں۔ جیسا کہ ہم آگے اسے وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔

حدیثوں کی اس جمع و تفتیش کے بعد ان کے تجزیے اور ترتیب کا نمبر آتا ہے۔ یہ چیز بڑی ذہانت اور اعلیٰ درجے کی قوت اخذ و استنباط کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس لئے کہ اس کا کچھ زیادہ فائدہ نہیں کہ محض مختلف موضوعات سے متعلق حدیثوں کا انبار لگا دیا جائے۔ فائدہ تو اصلاً اس وقت ہوگا جبکہ موضوع کا اچھی طرح تجزیہ کر کے اپنی بساط بھر اس کے ایک ایک جزء کے متعلق دلائل و شواہد فراہم کئے جائیں۔

مثال کے طور پر ایک شخص 'علم' کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے نقطۂ نظر کو واضح کرنا چاہتا ہے، جبکہ آج کے دور میں تمام زبانوں پر اس کا چرچا ہے اور ہر شخص یہ کہتا نظر آتا ہے کہ علم ہی وہ خشت اول ہے جس پر کسی عظیم تمدن کی عمارت کھڑی ہو سکتی ہے، اور سنت کی نظر میں علم کا کیا مرتبہ و مقام ہے اس کے سلسلے میں وہ دلائل و شواہد فراہم کرنا چاہتا ہے تو اس ذیل میں قرآن کے نقطۂ نظر کو معلوم کرنے کے سلسلے میں اس سے پہلے ہم نے جس طریقۂ کار کی نشاندہی کی ہے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ضمن میں بھی ہمیں وہی طریقۂ کار اختیار کرنا پڑے گا۔ پس اس موضوع سے متعلق حدیثوں کو جمع کر لینے دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس باب میں خرمن حدیث سے اپنے جی بھر خوشہ چینی کر لینے کے بعد اس کو درج ذیل اجزاء میں تقسیم کر کے ہم اس کا ایک بہتر تجزیہ پیش کر سکتے ہیں۔

۱۔ ہر نفع بخش علم کے حصول پر ابھارنا اور پڑھنے اور پڑھانے کی ترغیب و تشویق۔ اس سلسلے میں بے شمار حدیثیں ہیں جن کے ماخذ عام طور پر معلوم ہیں۔ کوئی بھی شخص انھیں آسانی سے تلاش کر سکتا ہے۔

۲۔ جہالت کے خلاف جنگ اور اس کے لئے تمام ممکن ذرائع کو استعمال کرنے کی تاکید، یہاں تک کہ غزوۂ بدر کے موقعہ پر آپ نے قریش کے خواندہ قیدیوں کا فدیہ یہ قرار دیا

کہ ایک قیدی دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔ (جس کے بعد اسے آزادی مل جاتی تھی)

۳۔ عربی کے علاوہ دوسری زبانوں کو سیکھنے کی حوصلہ افزائی جیسا کہ آپ نے زید بن حارثہؓ کاتب وحی کو باقاعدہ (عبرانی زبان سیکھنے) کا حکم دیا۔

۴۔ اعداد و شمار فراہم کرنے کے طریق کا استعمال، چنانچہ بخاری کی روایت ہے کہ آپ نے ہجرت کے بعد مسلمانوں کی تعداد کو شمار کرنے کا حکم دیا۔ لوگوں نے شمار کیا تو یہ کل ڈیڑھ ہزار تھے۔

۵ ہر وہ علم جس سے اسلام اور مسلمانوں کو فائدہ پہنچنے کی توقع ہو اسے اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی تاکید، جیسا کہ ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت ہے:

اَلْحِکْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ ، اَنّٰی وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا۔ حکمت مومن کی گم شدہ متاع ہے، جہاں کہیں وہ اسے پائے وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔

۶۔ دنیاوی معاملات میں تجربہ و مشاہدہ کی رہنمائی پر عمل پیرا ہونے کی تاکید جیسا کہ تابیر نخل[1] کے مسئلے میں آپ کے طرز عمل سے عیاں ہے۔ آپ نے صحابہ کرام کے سامنے ایک رائے پیش کی، لوگوں نے اس پر عمل کیا تو اس کا نتیجہ نقصان کی صورت میں برآمد ہوا۔ سمجھے کہ کہیں یہ وحی و ایمان کی قبیل سے نہ ہو۔ آپ نے صاف طریقے پر فرما دیا کہ یہ میرا اپنا خیال ہے۔ وحی الٰہی سے اس کا تعلق نہیں ہے، اور اپنے دنیوی معاملات کا فیصلہ تم خود بہتر کر سکتے ہو اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاکُمْ[2]

---

[1] نر کھجور کو مادہ کھجور کے ساتھ قلم لگانے کا عمل جس سے پھل عمدہ آتے اور فصل اچھی ہوتی تھی عرب میں اس کا عام رواج تھا۔ یَاْبُرُوْنَ النَّخْلَ یُلَقِّحُوْنَ النَّخْلَ۔ یُلَقِّحُوْنَهٗ، یَجْعَلُوْنَ الذَّکَرَ فِي الْاُنْثٰی فَتَلْقَحُ۔ الخ۔ مسلم جلد ۲۔ کتاب الفضائل۔ باب وجوب امتثال ما قالہ شرعاً۔ الخ نیز ملاحظہ ہو: شرح نووی برحدیث مذکور (مترجم)

[2] رواہ مسلم جلد ۲۔ کتاب الفضائل۔ باب وجوب امتثال ما قالہ شرعاً۔ الخ (مترجم)

۷۔ اپنے فن کے ماہر اور واقف کار لوگوں کی رائے کے مطابق عمل کرنا، جیسا کہ آپ نے غزوۂ بدر کے موقعہ پر (مورچہ لگانے کے سلسلے میں) حباب بن منذر کی رائے پر عمل کیا اور غزوۂ خندق میں حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے خندق کھودنے کا حکم دیا۔

۸۔ دجل و فریب اور خرافات و شعبدہ بازی کے خلاف اعلان جنگ اور شعبدہ بازوں اور فریب کاروں سے دور رہنے کی تلقین مثال کے طور پر کاہن عرافہ شناس، نجومی اور جادوگر وغیرہ تاکہ خلق خدا کے معاملات میں محض سنت الٰہی کا عمل دخل رہے، اور اللہ تعالیٰ نے کائنات کے اندر سبب اور مسبب کا جو نظام جاری فرمایا ہے وہ سبوتاژ ہونے سے محفوظ رہے۔ اس باب میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بے شمار حدیثیں موجود ہیں۔

نیت و ارادے کی اہمیت | ایک دوسری مثال سے یہ بات مزید واضح ہو جائے گی۔ جس کے لیے ہم اسلام میں نیت کا مقام کے موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اس موضوع پر روشنی ڈالنا چاہتا ہے۔ اور قرآن کے علاوہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے بھی مدلل کرنا چاہتا ہے۔ تو اس کے مختلف اجزاء کو درج ذیل طریقے پر تقسیم کیا جا سکتا ہے:-

۱۔ اسلام نیت کو عمل کا معیار قرار دیتا ہے۔ وہ انسان کے ظاہری عمل سے زیادہ اس کی قلبی کیفیات کو پیش نظر رکھتا ہے۔ انسان ایک کام کس جذبے کے تحت کر رہا ہے اصلاً اس کے نزدیک دیکھنے کی چیز یہ ہوتی ہے۔ اس کی ظاہری شکل و صورت کو وہ چنداں اہمیت کا حامل قرار نہیں دیتا۔ یہ جو ہم عام طور پر واعظوں اور قصہ گویوں کو صرف ظاہری اعمال کی انجام دہی پر لمبی لمبی بشارتیں اور جنت میں اعلیٰ مقامات کی خوشخبریاں سناتے دیکھتے ہیں تو یہ معاملے کی بالکل الٹی صورت ہے جس کا صحیح فہم دین سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن و حدیث کے درج ذیل نصوص سے اس

حقیقت کا اندازہ اچھی طرح کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ ۔ (ق - ۳۳)	جو بن دیکھے رحمٰن سے ڈرے اور وہ دل لے کر آئے جس میں رجوع ہو ایسے ہی لوگوں کے لئے جنت کی بشارت ہے۔
۲۔ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۔ (شعراء - ۸۹)	مگر وہ جو کھوٹ سے پاک دل لے کر آئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایسا ہی شخص بامراد ہوگا۔
۳۔ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (بقرہ - ۱۷۷)	نیکی یہ نہیں کہ تم (نمازمیں) اپنا منہ پورب یا پچھم کی طرف کرو۔ (بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی سچائی کے ساتھ خدا اور بندوں کے حقوق ادا کرے۔
۴۔ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۔ (حج - ۳۷)	قربانی کے جانوروں کا گوشت اور ان کا خون اللہ کو نہیں پہنچتا بلکہ اصل تمہارے دل کا ڈر ہے جو اس تک پہنچتا ہے۔

اسی طرح حدیث میں ہے:

۱۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَاَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَّنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَاَعْمَالِكُمْ ۔ (مسلم)	اللہ تمہاری صورتوں اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا ہے بلکہ وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے۔
۲۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰى [۱]	اعمال کا دارومدار تمام تر نیت پر ہے اور ہر شخص کو بس وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہوگی۔

[۱] متفق علیہ بحوالہ ریاض الصالحین ۔ متر جم

ان حدیثوں اور خاص طور پر اس آخری حدیث کی شرح و تبیین میں علماء نے جو تفصیل بخشیں کی ہیں انھیں دیکھ کر ہی صحیح معنوں میں ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ اگر نیت صحیح ہو تو جو کام آدمی بطور عادت کے کرتا ہے اسلام اسے بھی عبادت قرار دیتا ہے، جسے وہ مباح سمجھ کر کرتا ہے اسلام اسے اطاعت تصور کرتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر آدمی بھلائی کی نیت سے قضائے شہوت کرتا ہے تو اسلام اسے بھی اجر و ثواب کا باعث گردانتا ہے۔ اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث ہیں۔ ایک حدیث میں بیوی کو کھلانے پلانے کو باعث ثواب قرار دیتے ہیں:

۱۔ حَتّٰى فِي اللُّقْمَةِ يَضَعُهَا فِي فَمِ امْرَأَتِهِ۔ [1]	یہاں تک کہ اس لقمے میں بھی جو آدمی اپنی بیوی کے منہ میں رکھتا ہے (اس کے لئے اجر ہے بشرطیکہ اس سے رب کی رضا مقصود ہو۔)

قضائے شہوت کے سلسلے میں فرمایا:

۲۔ وَفِي بُضْعِ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ۔ [2]	قضائے شہوت بھی ایک طرح کا صدقہ ہے (اگر اس

[1] بخاری جلد ۲۔ کتاب النفقات۔ باب فضل النفقۃ علی الاہل۔ البتہ اس میں الفاظ یہ ہیں:

وَمَهْمَا أَنْفَقْتَ فَهُوَ لَكَ صَدَقَةٌ	اور تم جو کچھ بھی خرچ کرو تمہارے صدقہ ہے یہاں تک کہ
حَتَّى اللُّقْمَةَ تَرْفَعُهَا فِي فِي امْرَأَتِكَ۔	وہ لقمہ جو تم اُٹھا کر اپنی بیوی کے مُنہ میں رکھتے ہو۔

دوسرے مقام پر اس کے یہ الفاظ ہیں:

وَإِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً إِلَّا أُجِرْتَ عَلَيْهَا	اور تم جو خرچ بھی کرو گے اس پر تمہیں اجر ملے گا یہاں تک کہ
حَتَّى اللُّقْمَةَ تَرْفَعُهَا إِلَى فِي امْرَأَتِكَ۔	وہ لقمہ بھی جو تم اپنی بیوی کے منہ میں دیتے ہو۔

بخاری جلد ۲۔ کتاب الفرائض، باب میراث البنات (مترجم)

[2] مسلم جلد ۱۔ کتاب الزکوٰۃ باب ان اسم الصدقۃ یقع علی کل نوع من المعروف۔ (مترجم)

سے نیت خدا کی خوشنودی کا حصول ہے)

گھوڑا پالنا بظاہر صرف ایک مباح کام ہے۔ لیکن اگر اس سے انسان کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے اجر و ثواب کا باعث قرار دیتے ہیں۔ فرمایا:

۳۔ اَلْخَيْلُ ثَلَاثَةٌ: فَفَرَسٌ لِلرَّحْمٰنِ، وَفَرَسٌ لِلْإِنْسَانِ، وَفَرَسٌ لِلشَّيْطَانِ۔ (ترغیب و ترہیب)	گھوڑے تین طرح کے ہیں۔ ایک گھوڑا رحمٰن کی رضا کے حصول کے لئے ہے، دوسرا انسان (کی ضرورت) کے لئے ہے۔ تیسرا شیطان کے لئے ہے۔ (جبکہ اس سے مقصود نام و نمود اور اپنی بڑائی کا اظہار ہو)

۳۔ نیت میں اگر کھوٹ ہو تو ہجرت، جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ جیسے بڑے بڑے طاعت و بندگی کے کام بھی بالکل رائگاں اور اکارت جاتے ہیں۔ مہاجر ام قیس کی روایت ہے:

مَنْ غَزَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَهُوَ لَمْ يَنْوِ إِلَّا عِقَالًا فَلَهُ مَا نَوَى۔ (نسائی) [1]	جو کوئی اللہ کے راستے میں جنگ کرے اور اس کی نیت بس اسی قدر ہو کہ (غنیمت میں) باندھنے کی ایک رسی ہی مل جائے تو اسے بس وہی کچھ ہاتھ آئے گا جس کی اس نے نیت کی ہے۔

اسی طرح وہ مشہور قصہ جس میں ان تین بڑے بڑے لوگوں، عالم دین، بظاہر بھلائی کے کاموں میں بہت زیادہ خرچ کرنے والے اور میدان جنگ میں اپنی بہادری کے جوہر دکھانے والے، کا تذکرہ ہے۔ لیکن چونکہ ان کے کاموں میں خلوص کے بجائے ریاکاری اور دکھاوا شامل تھا اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن یہ لوگ سب سے پہلے جہنم کی آگ میں جھونکے جائیں گے۔ (مسلم)

[1] مشکوٰۃ المصابیح میں نسائی کی یہ روایت "ھو" کے بغیر ہے۔ ولم ینو الا عقالاً۔ ملاحظہ ہو کتاب الجہاد فصل ثالث۔ (مترجم)

۴۔ آدمی کی نیت درست ہوگی جبھی اس کا کوئی کام اجر وثواب کا مستحق قرار پاسکے گا۔

الف ۔ اس صورت میں اگر وہ کسی کام کی نیت کرتا ہے تو اگر اسے مکمل نہ کر سکے تاہم اجر وثواب کا مستحق ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ۔ (نساء۔ ۱۰۰)

اور جو کوئی اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کے ارادہ سے نکلے پھر (اس بیچ) اسے موت آجائے تو اللہ پر اس کا اجر ثابت ہوگیا۔

ب ۔ اسی طرح اگر آدمی کوئی کام غلطی سے کر جائے لیکن اس کی نیت درست ہے تو اسلام اسے اجر وثواب کا مستحق گردانتا ہے۔ اس کی دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث ہے :

لَكَ مَا نَوَيْتَ يَا يَزِيْدُ، وَلَكَ مَا اَخَذْتَ يَا مَعْنُ (بخاری[1])

تمہیں وہ اجر وثواب مل گیا اے یزید! جس کی تم نے نیت کی تھی اور معن جو تم نے لے لیا وہ اب تمہارا ہے!

ج ۔ اگر کوئی شخص دل میں کسی کام کی نیت لئے ہوئے ہے لیکن عملاً اسے انجام نہیں دے سکا

---

[1] یہ حدیث شریف کا آخری ٹکڑا ہے۔ واقعے کی تفصیل اس طرح ہے کہ حضرت یزیدؓ صحابی رسولؐ نے صدقے کی غرض سے کچھ دینار نکالے اور انھیں مسجد میں ایک شخص کے پاس رکھ دیا کہ وہ کسی مناسب شخص کو جسے وہ ضرورت مند سمجھتے ہوں انھیں دیدیں۔ حضرت یزیدؓ کے صاحبزادے حضرت معنؓ جو خود بھی صحابی ہیں انھیں ان کا پتہ لگ گیا اور انھوں نے انھیں اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اور معاملے کو لے کر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے تو حضرت یزید نے بیٹے کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ میں نے تمہیں دینے کی نیت سے تو انھیں اس شخص کے پاس نہیں رکھا تھا۔ لیکن حضرت معن اپنے دعویٰ سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس پر آنحضورؐ کی زبان مبارک سے وہ الفاظ ادا ہوئے جو اوپر مذکور ہیں : لَكَ مَا نَوَيْتَ يَا يَزِيْدُ وَلَكَ مَا اَخَذْتَ يَا مَعْنُ ۔ ملاحظہ ہو : بخاری جلد ۱۔ کتاب الزکوٰۃ۔ باب اذا تصدق علی ابنہ وہو لا یشعر (مترجم)

تو اسلام اسے بھی اجر وثواب کا مستحق گردانتا ہے۔ مختلف امور کی نشاندہی کرتے ہوئے اس ذیل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد احادیث ہیں۔ جہاد کے سلسلے میں فرماتے ہیں :

اِنَّ اَقْوَامًا خَلْفَنَا بِالْمَدِيْنَةِ مَا سَلَكْنَا شِعْبًا وَّلَا وَادِيًا اِلَّا وَهُمْ مَعَنَا حَبَسَهُمُ الْعُذْرُ۔ (بخاری)

ہمارے پیچھے مدینہ میں بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ ہم کسی گھاٹی اور کسی وادی میں نہیں چلے مگر یہ کہ (ثواب کے لحاظ سے) وہ ہمارے ساتھ رہے۔ اس لئے کہ واقعی عذر تھا جس کی بنا پر وہ ہمارا ساتھ نہیں دے پائے۔

مقام شہادت کے سلسلے میں فرمایا :

مَنْ سَاَلَ الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ، بَلَّغَهُ اللّٰهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَآءِ وَاِنْ مَّاتَ عَلٰى فِرَاشِهٖ۔ (مسلم)

جو کوئی صدق دل سے شہادت کا آرزو مند ہوگا اللہ اسے شہیدوں کے درجات تک پہنچا دے گا خواہ اسے بستر ہی پر موت کیوں نہ آئی ہو۔

ایک شخص کا قیام لیل (یا کسی دوسرے عمل خیر مثلاً تلاوت قرآن اور اوراد و وظائف وغیرہ) کا معمول ہے لیکن کسی مجبوری سے وہ اسے پورا نہیں کر پا رہا ہے، اس کے حق میں فرمایا :

اِذَا مَرِضَ الْعَبْدُ اَوْ سَافَرَ كُتِبَ لَهٗ مِنَ الْعَمَلِ مَا كَانَ يَعْمَلُ وَهُوَ صَحِيْحٌ مُقِيْمٌ۔ (بخاری ۔ احمد)

جب بندہ بیمار ہوتا یا حالت سفر اختیار کرتا ہے تو اس کے (نوشتہ حساب میں) وہ عمل برابر لکھا جاتا رہتا ہے جس پر اس کا معمول تھا دریں حالیکہ وہ صحت مند اور حالت اقامت میں تھا (اگرچہ بر وقت وہ بیماری اور سفر کی وجہ سے اسے نہیں کر پا رہا ہے)

اسی طرح انفاق کے سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث :

اِنَّمَا الدُّنْيَا لِاَرْبَعَةِ نَفَرٍ ۔ الخ

دنیا تو بس چار طرح کے آدمیوں کے لئے ہے۔ الخ

جس میں بھلائی کے کاموں میں خرچ کرنے والے اور دوسرا شخص جس کے اندر اس کی استطاعت تو نہیں ہے لیکن وہ دل سے اس کا متمنی ضرور ہے، اجر و ثواب کے لحاظ سے آپ ان دونوں کو برابر قرار دیتے ہیں[1]

اسی کے بالمقابل اگر ایک شخص کی نیت برائی اور گناہ کی ہے تو اگرچہ وہ اسے کر سکے یا نہ کر سکے اسلام کی نظر میں سزا کا مستحق ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

إِذَا الْتَقَى الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفَيْهِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ فِي النَّارِ[2]	اگر دو مسلمان تلواریں لے کر ایک دوسرے کے مدمقابل ہوتے ہیں تو قتل کرنے والا اور قتل ہونے والا دونوں ہی جہنم کے مستحق ہیں۔

اسی طرح حدیث بالا کا دوسرا ٹکڑا جس میں آپ نے برائی کے کام میں مال خرچ کرنے والے اور دوسرا شخص جس کے اندر اگرچہ اس کی صلاحیت تو نہیں ہے لیکن اس کی نیت یہی ہے اور دل سے ارادہ وہ اسی کا رکھتا ہے، اپنے انجام کے لحاظ سے آپ نے ان دونوں یکساں قرار دیا۔ فرمایا کہ : عذاب میں یہ دونوں بالکل برابر ہوں گے۔ (فَهُمَا فِي الْوِزْرِ سَوَاءٌ)[3]

[1] رواہ احمد والترمذی وصححہ۔ [2] بخاری جلد ا کتاب الایمان۔ باب المعاصی من امر الجاہلیۃ (مترجم)

[3] اس حدیث کا متعلقہ متن اور اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :

إِنَّمَا الدُّنْيَا لِأَرْبَعَةِ نَفَرٍ عَبْدٌ رَزَقَهُ اللهُ مَالًا وَعِلْمًا فَهُوَ يَتَّقِي فِيهِ رَبَّهُ وَيَصِلُ رَحِمَهُ وَيَعْمَلُ لِلّٰهِ فِيهِ بِحَقِّهِ فَهٰذَا بِأَفْضَلِ الْمَنَازِلِ وَعَبْدٌ رَزَقَهُ اللهُ عِلْمًا وَلَمْ يَرْزُقْهُ مَالًا فَهُوَ صَادِقُ النِّيَّةِ يَقُولُ لَوْ أَنَّ لِي مَالًا	دُنیا پانے والے تو بس چار طرح کے ہوتے ہیں ایک شخص تو وہ ہے جسے اللہ نے مال اور علم دونوں دیا ہے پس وہ ان کے تئیں اپنے رب سے ڈرتا ہے اور مال اور علم دونوں کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اللہ کے لئے کام کرتا ہے، تو یہ سب سے (بقیہ ۱۳۷ پر)

۵۔ اچھی نیت کی برکت :

الف۔ آدمی کی نیت اگر اچھی ہے تو اسے اللہ کی مدد حاصل ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

مَنْ أَدَانَ أَمْوَالَ النَّاسِ وَهُوَ يُرِيدُ أَدَاءَهَا أَدَّى اللهُ عَنْهُ۔ (بخاری)	جو کوئی لوگوں کے مالوں میں سے کوئی چیز بطور قرض لے اور دل سے اس کی نیت اس کے ادا کرنے کی ہو تو اللہ تعالیٰ اس سے اس قرض کی ادائگی کا سامان کر دے گا۔

اسی طرح قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

إِنْ يَعْلَمِ اللهُ فِي قُلُوبِكُمْ خَيْرًا يُؤْتِكُمْ	اگر اللہ تمہارے دلوں میں بھلائی دیکھے گا تو جو کچھ تمہارے

(بقیہ ۱۳۶ سے آگے) لَعَمِلْتُ بِعَمَلِ فُلَانٍ فَأَجْرُهُمَا سَوَاءٌ وَعَبْدٌ رَزَقَهُ اللهُ مَالًا وَلَمْ يَرْزُقْهُ عِلْمًا فَهُوَ يَخْبِطُ فِي مَالِهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ لَا يَتَّقِي فِيهِ رَبَّهُ وَلَا يَصِلُ فِيهِ رَحِمَهُ وَلَا يَعْمَلُ فِيهِ بِحَقٍّ فَهٰذَا بِأَخْبَثِ الْمَنَازِلِ وَعَبْدٌ لَمْ يَرْزُقْهُ اللهُ مَالًا وَلَا عِلْمًا فَهُوَ يَقُولُ لَوْ أَنَّ لِي مَالًا لَعَمِلْتُ فِيهِ بِعَمَلِ فُلَانٍ فَهُوَ نِيَّتُهُ وَوِزْرُهُمَا سَوَاءٌ۔ رواہ الترمذی وقال هٰذا حدیث صحیح	اونچے درجے پر ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے جسے اللہ نے علم تو دیا ہے لیکن مال نہیں دیا ہے، پس اس کی نیت سچی ہے۔ کہتا ہے کہ اگر میرے مال ہوتا تو میں فلاں شخص کے سے کام کرتا، تو یہ دونوں ملنے والے بدلے کے لحاظ سے برابر ہیں۔ تیسرا شخص وہ ہے جسے اللہ نے مال تو دیا ہے لیکن علم نہیں دیا ہے، پس وہ کچھ سوچے سمجھے بغیر جہاں تہاں حرام و حلال جگہ اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ اس کے تئیں اللہ سے ڈرتا ہے نہ صلہ رحمی کرتا ہے اور نہ کوئی دوسرا صحیح کام کرتا ہے۔ تو یہ شخص ہے

جس کا حال سب سے بدتر ہے۔ چوتھا شخص وہ ہے۔ جسے اللہ نے نہ مال دیا ہے نہ علم پس وہ کہتا ہے کہ اگر میرے مال ہوتا تو فلاں شخص کے سے کام کرتا تو جیسی اس کی نیت ہوگی ایسا ہی اس کو بدلہ ملے گا۔ نیت بری ہوگی تو دونوں کو سزا بھی برابر کی ملے گی۔

مشکوۃ، کتاب الرقاق، باب استحباب المال والعمر للطاعۃ۔ (مترجم)

خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ۔ ہاتھ سے چلا گیا ہے اس سے بہتر تم کو دے گا اور تمہارے لئے معافی کا سامان کرے گا۔ (انفال ۔ ۷۰)

ب ۔ نیت درست ہو تو آدمی کو اپنے مقصد میں کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ شوہر اور بیوی کے سلسلے میں قرآن کہتا ہے :

اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اگر وہ دونوں اصلاح حال کے آرزومند ہوں گے تو اللہ ان کے درمیان سازگاری پیدا فرما دے گا۔ (نسا ۔ ۳۵)

اسی طرح وہ حدیث جس میں اس شخص کا قصہ مذکور ہے جو چور، زانی عورت اور ایک مالدار شخص پر اپنا مال خرچ کرتا تھا چونکہ وہ یہ کام اچھی نیت سے کر رہا تھا اس لئے اس نے ایک شخص کو خواب میں اس کے اس عمل کی تصویب کرتے ہوئے دیکھا جو اس سے یہ کہہ رہا ہے :

اَمَّا صَدَقَتُكَ عَلٰى سَارِقٍ فَلَعَلَّهٗ اَنْ يَّسْتَعِفَّ عَنْ سَرِقَتِهٖ، وَاَمَّا صَدَقَتُكَ عَلٰى زَانِيَةٍ فَلَعَلَّهَا اَنْ تَسْتَعِفَّ عَنْ زِنَاهَا وَاَمَّا صَدَقَتُكَ عَلٰى غَنِيٍّ فَلَعَلَّهٗ يَعْتَبِرُ فَيُنْفِقُ مِمَّآ آتَاهُ اللّٰهُ۔ (بخاری)

جہاں تک چور پر تیرے صدقہ کرنے کا سوال ہے تو شاید کہ وہ پاکی کی راہ پکڑے اور چوری سے باز نہ آجائے، جہاں تک زانی عورت پر تیرے صدقہ کرنے کا سوال ہے تو شاید کہ وہ پاک دامنی اختیار کرے اور زناکاری سے باز آجائے اور جہاں تک مالدار پر تیرے صدقہ کرنے کا سوال ہے تو شاید کہ اسے کچھ سوچ آئے اور وہ اس مال سے کچھ خرچ کرنے لگے جو اللہ نے اسے دے رکھا ہے۔

۶ ۔ لیکن دو صورتیں ایسی ہیں کہ ان میں نیت کی درستگی کا کچھ فائدہ نہ ہوگا :

پہلی چیز گناہ کے کام اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام کردہ معاملات ہیں۔ اب اگر کسی کی نیت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو لیکن گناہ کا کوئی کام طاعت و بندگی نہیں بن سکتا، نہ تو

اس کی وجہ سے اللہ کی حرام کردہ کوئی چیز حلال بن سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص سود کھانے کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور اس سے اس کی نیت یہ ہے کہ اس کی آمدنی سے مسجد تعمیر کرائے گا۔ تو اس کی اس اچھی نیت سے یہ حرام کام حلال نہ ہو سکے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے:

اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ اِلَّا طَيِّبًا۔ (مسلم) اللہ پاک ہے وہ صرف پاک بات اور پاک طریق ہی کو شرف قبولیت عطا کرتا ہے۔

پس اسلام کے نزدیک جس طرح یہ چیز ضروری ہے کہ آدمی کے مقاصد بلند اور پاکیزہ ہوں اسی طرح ان کے حصول کے لئے پاک وصاف وسائل کا اختیار کرنا بھی ضروری ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر کوئی شخص شریعت سے ہٹ کر عبادت و اطاعت کے دوسرے طریقے ایجاد کرتا ہے تو خواہ اس کی نیت کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو اور اپنے دل میں وہ ثواب کی کتنی ہی تمنا کیوں نہ رکھتا ہو، لیکن خدا تعالیٰ کی نظر میں اس کا یہ عمل کسی بھی درجے میں قبولیت نہ کر سکے گا۔ اس لئے کہ دین میں اسی طرح کے اضافوں کا نام بدعت ہے جو انجام کار اس کی پوری عمارت کو ڈھا کے رہتی ہے۔ اسی لئے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے اندر اس طرح کے ہر اضافے کو قابل رد قرار دیا ہے : مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ[۱] (جو کوئی دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ کرتا ہے جو اس میں سے نہیں تو ایسا ہر اضافہ قابل رد ہے)

احادیث کو غلط معنیٰ پہنانے اور ان سے غلط طریقے سے استدلال کرنے سے اجتناب

اسی طرح داعی کے لئے لازم ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو غلط معنیٰ پہنانے سے احتراز کرے۔ خاص طور پر کتب احادیث میں مذکور صحیح اور حسن احادیث جنھیں ہر دور میں علمائے امت قبول کرتے آئے ہیں، لیکن بہت سے لوگ ان میں معنوی تحریف کرنے سے باز

---

[۱] متفق علیہ بحوالہ مشکوۃ المصابیح۔ کتاب الایمان : باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ (مترجم)

نہ رہے چنانچہ انھوں نے ان کو ان کے اصل موقعہ ومحل سے ہٹا کر ان کی بیجا تاویلات کیں اور انھیں ان کے واقعی منشا ومفہوم سے دور ڈال دیا جو خدا اور اس کے رسولؐ کی مرضی کے عین برعکس تھا۔

امت کے جادۂ اعتدال سے ہٹے ہوئے فرقوں نے ہر دور میں اس طرح کی احادیث کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنے کے سلسلے میں چابکدستی کا مظاہرہ کیا ہے۔ تاکہ ان کے ذریعہ اپنے پسندیدہ مسالک کی تائید کرسکیں، اور اپنے باطل افکار ونظریات کو ان سے غذا فراہم کرنے کی کوشش کریں۔ اصل حیثیت تو انھوں نے اپنے مزعومہ مسالک کو دی اور دینی نصوص کو ان کے تابع بنا دیا۔ یہی معاملہ انھوں نے قرآن کے ساتھ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ساتھ بھی ان کا یہی طرز عمل رہا۔ اہل سنت والجماعۃ اور پیروان سلف کو چھوڑ کر امت کا شاذ ونادر ہی کوئی فرقہ ایسا ہوگا جو اس کھڈ میں گرنے سے محفوظ رہا ہو۔

اور بات صرف قدما کی نہیں جو اس کھڈ میں گرے نئے زمانے کے لوگ بھی اس میں گرے بغیر نہیں رہ سکے ہیں۔ یہی وجہ ہے جو ہم آج بہت سے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ 'تابیر نخل' والی حدیث جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے (اور جس کا تذکرہ اس سے قبل ہو چکا ہے) اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ کہ "اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاکُمْ" (اپنے دنیا کے معاملات کو تم زیادہ بہتر جانتے ہو) اس سے استدلال کرتے ہیں کہ شریعت کو سیاسی معاشی اور اسی طرح زندگی کے دوسرے دائروں سے بالکل دور رکھنا چاہئے۔ ان کے خیال میں اس حدیث کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دنیاوی معاملات اور اسی طرح زندگی کے دیگر امور ومسائل کی تنظیم کا کام ہمارے سپرد کر دیا ہے۔ (کہ ہم اپنی پسند وناپسند کے مطابق اس کا خاکہ تیار کریں اور اس میں رنگ بھریں۔ اس دائرے میں خدا ورسولؐ کی مرضی کو معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔)

حالانکہ حدیث میں جن امور دنیا کو ہمارے سپرد کئے جانے کی بات کہی گئی ہے اس کا

تعلق فنی اور تکنیکی امور ومسائل سے ہے۔ جس میں ذرائع ووسائل کا معاملہ پیش نظر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر کھیتی باڑی اور تجارت وصنعت کے مسائل۔ ان تکنیکی مسائل میں بیشک شریعت انسان کو آزاد رکھنا چاہتی ہے کہ وہ ان کے سلسلے میں اپنی عقل کو استعمال کرے اور ان کے نت نئے طریقے ایجاد کرنے میں اپنی فکر ونظر کو بہتر سے بہتر طریقے پر کام میں لائے۔ ورنہ اگر اس حدیث سے اسلام کا منشا دنیوی معاملات کی تنظیم کو سرے سے آزاد کر دینا ہوتا تو قرآن کے اندر ایک خالص دنیاوی معاملے کی تنظیم کے سلسلے میں اس کی سب سے طویل آیت نازل ہوتی۔ ہماری مراد 'آیت دین' سے ہے، جس میں آپسی قرضوں کو لکھ لینے کے سلسلے میں تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں[1] اسی طرح قرآن وحدیث کے وہ سیکڑوں نصوص موجود نہ ہوتے جو لوگوں کی دنیوی زندگی سے متعلق معاملات ومسائل سے براہ راست بحث کرتے ہیں۔ مثلاً بیع وشراء اور ہبہ اور اجارہ وغیرہ کے مسائل۔

اسی طرح کا معاملہ ان احادیث کے ساتھ رہا ہے جن کا تعلق دور فتن اور آخری زمانے کے فساد اور بگاڑ سے ہے۔ بہت سے لوگ ان کا یہ مطلب سمجھتے ہیں یا انھیں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ان کا یہ مطلب باور کیا جائے کہ اب ہر چہار سو برائی کا دور دورہ ہوگا اور سیل فساد اب کسی طرح ختم نہیں سکتا۔ اور معاملات بد سے بدتر صورت اختیار کرکے رہیں گے۔ بھلائی اور بہتری کی توقع رکھنا اب بالکل عبث ہے۔ یہاں تک کہ اسی حال میں قیامت آجائے گی۔ اکثر وبیشتر واعظوں اور خطیبوں کو سنا جاتا ہے کہ وہ دور فتن اور علامات قیامت اور اسی طرح کی دوسری حدیثوں کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ آدمی کے لئے مایوسی کے سوا کوئی چارہ نہ رہے جس کا نتیجہ ہے کہ لوگ صورت حال کا مداوا اور اس کی اصلاح کرنے اور فساد پر بندش لگانے کے بجائے

---

[1] بقرہ - ۲۸۲ (مترجم)

گوشۂ عافیت کی تلاش میں لگ جاتے ہیں اور اپنے کو اس ذمہ داری سے بالکل دستبردار سمجھنے لگتے ہیں ۔ اکثر و بیشتر عوام الناس کے ذہن میں یہ بات بالکل رچ بس گئی ہے ۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ بہت سے خواص بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ گئے ہیں ۔ چنانچہ اگر انھیں آپ کسی اجتماعی مہم میں شرکت کی دعوت دیں جس کے ذریعہ امت اپنے اوپر عائد ہونے والے کسی فرض کفایہ کی ادائیگی کرسکے اور اس سے کوتاہی کی صورت میں اسے جو گناہ ملنے والا ہے اس سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے، تو وہ آپ کے سامنے ان حدیثوں کو ایسا فر فر سنانا شروع کریں گے کہ آپ بس ان کا منہ دیکھتے رہ جائیں گے ۔

غالباً اس کی سب سے عمدہ مثال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ مشہور حدیث ہوگی جسے امام مسلم کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی روایت کیا ہے ۔

بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ غَرِيبًا كَمَا بَدَأَ فَطُوبَى لِلْغُرَبَاءِ ۔	اسلام اجنبی شروع ہوا تھا اور عن قریب وہ پھر اجنبی ہوجائے گا جیسا کہ شروع میں تھا ۔ تو مبارک ہو (ان) اجنبیوں کے لئے

بہت سے لوگ اس حدیث کو اپنے حق میں اس کے لئے دلیل تصور کرتے ہیں کہ اب ان کے اوپر سے دعوت دین کی ذمہ داری ساقط ہوگئی اور ان کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی چنداں ضروری نہیں ۔ روئے زمین پر حکومت اسلامی کے قیام یا دوسرے لفظوں میں دنیا کے اوپر قرآن کی حکمرانی قائم کرنے کے سلسلے میں جب بھی انھیں دعوت دی جاتی ہے، اس حدیث کا سہارا لے کر وہ اس سے کترانے کی کوشش کرتے ہیں ۔

کیا کوئی شخص تصور کر سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث اس لئے

بیان فرمائی تھی کہ وہ اُمت کے عزائم کو بالکل سرد کریں جس کے بعد اسے دین کی دعوت اور اس کی راہ میں جد وجہد سے کوئی واسطہ نہ رہے اور اس کے اندر امید کی کوئی ہلکی کرن بھی باقی نہ رہ جائے ۔

نہیں ہرگز نہیں ۔ اس حدیث میں آپ نے امت کو جو ڈرایا ہے تو اس کا منشا صرف یہ ہے کہ وہ خبردار رہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ آپ نے اسے آگاہی دیدی ہے تاکہ وہ چوکنی رہے ۔ یہ فرما کر گویا آپ نے اُمت کے سامنے سُرخ روشنی (Red Light) جلادی ہے، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ چلنے والے کسی کھڈ میں گرنے یا آپس میں ایک دوسرے سے ٹکرانے سے محفوظ رہیں ۔ (یہ نہیں کہ وہ جہاں ہیں بس وہیں کھڑے رہیں اور اپنی جگہ سے ٹس سے مس ہونے کا نام نہ لیں) ۔

یہ حدیث اس لئے نہیں آئی کہ بھلائی چاہنے والوں کے لئے امید کے تمام دریچوں کو بند کر دے اور جہد و عمل کی راہوں کو یکسر مسدود کر دے ! حدیث سے یہ بات کیونکر نکل سکتی ہے جبکہ اس کے آخر میں یہ الفاظ موجود ہیں : "فَطُوبَى لِلْغُرَبَاءِ" "خوش خبری ہو ان اجنبیوں کیلئے" جس کا منشا ظاہر ہے کہ انھیں جہد و عمل کے لئے مہمیز کرنا ہی ہو سکتا ہے) یہ الفاظ امام مسلم کے ہیں ترمذی میں اس کے جو الفاظ ہیں اس سے یہ حقیقت اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے ۔ آپ سے دریافت کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ! یہ اجنبی لوگ کون ہیں ؟ قِيلَ وَمَنِ الْغُرَبَاءُ يَا رَسُولَ اللهِ آپ نے فرمایا :

اَلَّذِينَ يُصْلِحُونَ مَا أَفْسَدَ النَّاسُ بَعْدِي مِنْ سُنَّتِي ۔ (ترمذی)	یہ لوگ ہوں گے کہ میرے بعد جب لوگ میرے طریقے میں بگاڑ پیدا کر دیں گے تو یہ اس کی درستگی کا کام انجام دیں گے ۔

آپ کے یہ الفاظ توصاف طور پر اس کی دعوت دے رہے ہیں کہ انبیائی طریق کو چھوڑ کر

لوگوں نے اپنے اندر جو بگاڑ پیدا کر لیے ہیں اس کی اصلاح کی جانی ضروری ہے۔ اور کج روی اختیار کرنے والوں کو دین کی سیدھی راہ پر لگانے کے لئے مسلسل اور پیہم جد و جہد ہوتی رہنی چاہئے۔

اسی طرح دوسری حدیث میں ہے کہ آپ سے سوال کیا گیا کہ: مَنِ الْغُرَبَاءُ؟ یہ اجنبی لوگ ہیں؟ اس کی تشریح میں آپ نے فرمایا: اَلنُّزَّاعُ مِنَ الْقَبَائِلِ. یعنی قبیلوں سے الگ ہو جانے والے لوگ جنھوں نے اپنے کو اپنے اہل و عیال اور اپنے خاندان سے دور کر لیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جسمانی طور پر ہجرت اختیار کر لی، یا اگر وہ ان کے درمیان میں بھی ہوں تو اس کیفیت کے ساتھ کہ انھیں ذہنی اور قلبی مہاجر کا نام دیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح ایک دوسرے موقعہ پر آپ سے دریافت کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول! یہ اجنبی لوگ کون ہیں؟ وَمَنِ الْغُرَبَاءُ يَا رَسُولَ اللهِ. آپ نے فرمایا! یہ انسانوں کی بڑی بڑی جماعتوں کے بالمقابل تھوڑے سے نیک لوگ ہوں گے۔ ان کی بات ماننے والوں کی تعداد بہت تھوڑی اور نافرمانی کرنے والوں کی کثرت ہوگی۔ نَاسٌ صَالِحُونَ قَلِيلٌ فِي نَاسٍ كَثِيرٍ. مَنْ يَعْصِيهِمْ أَكْثَرُ مِمَّنْ يُطِيعُهُمْ.

پس ان اجنبیوں کا حوالہ دینے سے حدیث کا مقصد مسلمانوں کو یاس و قنوطیت کا شکار بنانا نہیں بلکہ ان اجنبیوں کی عظمت بڑھانا اور ان کے بلند رتبے کی نشاندہی مقصود ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے کہ جب لوگوں میں فساد پیدا ہو جائے گا تو یہ ان کی اصلاح کا فریضہ انجام دیں گے۔ یا یہ کہ دوسرے انسانوں کی طرف سے جو گڑبڑیاں پھیلائی گئی ہوں گی ان کے ہاتھوں ان کی درستی عمل میں آئے گی۔ اس کا مقصد تو ہر مسلمان کو اس کے لئے مہمیز کرنا ہے کہ وہ اپنے کو ان اجنبیوں میں شامل کرنے کی کوشش کرے۔ یا اگر وہ یہ نہیں کر سکتا تو کم از کم یہ کہ وہ اس کام میں ان کا معاون بنے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پاک ایک مثبت اور تعمیری عمل کی نشاندہی کرتی

ہے، نہ اس بات کی تلقین کہ آدمی مایوس ہو اور میدان سے راہ فرار اختیار کرے، اس دعوی کے ساتھ کہ زمانہ بہت خراب آگیا ہے (اور اب اصلاح حال کی کسی کوشش کے کامیاب ہونے کا سوال نہیں پیدا ہوتا)

نعیب زماننا والعیب فینا — وما لزماننا عیب سوانا

(ہم زمانہ کو برا کہتے ہیں، حالانکہ برائی خود ہمارے اندر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زمانے کی پیشانی کا اگر کوئی بدنما داغ ہے تو وہ ہم ہی ہیں)

اسی سلسلے میں وہ مشہور روایت بھی بیان کی جاتی ہے جسے امام ابوداؤد حضرت ثوبان کے واسطے سے نقل کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يُوشِكُ أَنْ تَدَاعَى عَلَيْكُمُ الْأُمَمُ كَمَا تَدَاعَى الْأَكَلَةُ إِلَى قَصْعَتِهَا قَالُوا: أَمِنْ قِلَّةٍ نَحْنُ يَوْمَئِذٍ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: بَلْ أَنْتُمْ يَوْمَئِذٍ كَثِيرٌ، وَلَكِنَّكُمْ غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ. وَلَيَنْزِعَنَّ اللهُ مِنْ صُدُورِ عَدُوِّكُمُ الْمَهَابَةَ مِنْكُمْ وَلَيَقْذِفَنَّ فِي قُلُوبِكُمُ الْوَهْنَ، قَالُوا: وَمَا الْوَهْنُ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ.

قریب ہے کہ دیگر قومیں تم پر ٹوٹ پڑیں جس طرح کہ (بھوک سے بے چین) کھانے والے دسترخوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ایسا اس وجہ سے ہوگا کہ اس وقت ہماری تعداد کم ہوگی۔ آپ نے فرمایا: نہیں بلکہ تم تعداد میں بہت زیادہ ہوں گے۔ لیکن تم سیلاب کی جھاگ کے مانند جھاگ (بے حقیقت) ہوگے۔ اور اللہ دشمن کے سینوں سے تمہاری ہیبت کو زائل کر دے گا اور تمہارے دلوں میں "وھن" (یعنی کمزوری) ڈال دے گا۔ صحابہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ وھن (کمزوری) کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: دنیا کی محبت اور موت سے نفرت۔

اس حدیث کے ذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امت کو یہ آگاہی دینا چاہتے ہیں کہ مستقبل میں اس کے خلاف جن بین الاقوامی سازشوں کا جال بچھایا جانے والا ہے اس کے سلسلے میں وہ چوکنی رہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے سامنے سے سازش کے ان تمام پردوں کو اٹھا دیا تھا۔ اور آپؐ انھیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اور امت کے پہلو بہ پہلو ان کی تلخی کو خود اپنے کام و دہن میں محسوس کر رہے ہیں۔ اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ امت دشمنوں کی چالوں کے مقابلے میں مایوس ہو کر بیٹھ جائے، اور اس کے ہاتھ پاؤں بالکل ڈھیلے پڑ جائیں۔ نہیں بلکہ باہر کی دنیا میں امت کے خلاف دشمنوں کی طرف سے جو سازشیں کی جا رہی ہیں اور جس طرح اسے جڑ پیڑ سے اکھاڑنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں، اس حدیث کے ذریعہ آپؐ امت کو اس کی طرف متوجہ کرنا چاہ رہے ہیں تاکہ وہ آپ اپنی طرف توجہ کرے اور اس کا جائزہ لے کہ اس کے داخل میں کمزوری کے وہ کون سے عوامل ہیں جن کی وجہ سے فی نفسہٖ اس کا معنوی وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔ حالانکہ وہ تعداد کے لحاظ سے کم نہیں بلکہ بہت زیادہ ہے۔ آپؐ نے یہ آگاہی اس لئے دیدی تاکہ وہ ان کمزوریوں کا پتہ لگا کر ان پر قابو پانے کی کوشش کرے۔ اس لئے کہ مرض کے علاج کا پہلا درجہ یہ ہے کہ اس کے اسباب کا پتہ معلوم ہو۔

اس کے علاوہ اس مقام پر ہم ایک دوسری حقیقت کی نشاندہی بھی ضروری سمجھتے ہیں جس کی طرف سنت کا مطالعہ کرنے والے کو دھیان دینے کی ضرورت ہے، اور وہ یہ کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دورِ فتن کے سلسلے میں اس طرح کی حدیثیں مذکور ہیں جن کا ایک نمونہ آپ نے اوپر دیکھا۔ تو اسی کے ساتھ ساتھ بشارت سنانے والی اور خوش خبری کے مضامین پر مشتمل آپؐ کی دوسری بے شمار حدیثیں بھی ہیں جو ہمارے دلوں میں امید کی کرن پیدا کرتی ہیں، اور جن کو دیکھ کر آئندہ کے لئے توقع بندھتی ہے کہ ان شاء اللہ

اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل تاریک نہیں ہے۔ ذیل میں اسی طرح کی چند حدیثوں کو ایک ترتیب سے پیش کیا جا رہا ہے:

۱۔ لَيَبْلُغَنَّ هٰذَا الْأَمْرُ (یعنی ھذا الدین) مَا بَلَغَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ، وَلَا يَتْرُكُ اللّٰهُ بَيْتَ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللّٰهُ هٰذَا الدِّيْنَ بِعِزِّ عَزِيْزٍ أَوْ بِذُلِّ ذَلِيْلٍ، عِزًّا يُعِزُّ اللّٰهُ بِهِ الْإِسْلَامَ وَذُلًّا يُذِلُّ بِهِ الْكُفْرَ۔ (ابن ماجہ)

یہ معاملہ (یعنی یہ دین) پہنچ کر رہے گا جہاں تک کہ رات اور دن کی گردش کی رسائی ہے۔ اور اللہ ڈھیلے پتھر اور بھیڑ بکریوں کے بال کا کوئی گھر نہیں چھوڑے گا مگر یہ کہ اس کے اندر اس دین کو داخل کر کے رہے گا۔ زبردست ترین عزت کے ساتھ یا رسوا کن ذلت کے ساتھ، عزت جس کے ذریعہ اللہ اسلام کو سربلند کرے گا اور ذلت وہ جس کے ذریعہ وہ کفر کو رسوا کرے گا۔

۲۔ حضرت ثوبان کی روایت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ زَوَىٰ لِيَ الْأَرْضَ فَرَأَيْتُ جَمْعَهَا وَضَمَّهَا، فَرَأَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا وَأَنَّ أُمَّتِيْ سَيَبْلُغُ مُلْكُهَا مَا زُوِيَ لِيْ مِنْهَا۔ (احمد، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہؒ)

اللہ نے میرے لئے اس زمین کو سمیٹ دیا تو مشرق کے ایک سرے سے لے کر مغرب کے دوسرے سرے تک میں نے اسے دیکھ لیا، نیز یہ کہ یہ زمین جہاں تک میرے لئے سمیٹی گئی میری امت کا اقتدار وہاں تک پہنچ کر رہے گا۔

۳۔ ابوقبیل کی روایت جسے احمدؒ، دارمی، ابن ابی شیبہ اور حاکم نے اپنے یہاں نقل کیا اور اسے صحیح قرار دیا ہے[۲]۔ فرماتے ہیں کہ ہم عبداللہ بن عمرو بن عاص کی مجلس میں تھے کہ ان سے سوال

---

[۱] نیز ملاحظہ ہو مشکوٰۃ المصابیح کتاب الفتن۔ باب فضائل سید المرسلین (مترجم)

[۲] امام ذہبی کی بھی یہی رائے ہے۔ اسی طرح مقدسی نے اپنی کتاب العلم میں اس کی اسناد کو (بقیہ صفحہ ۱۴۸ پر)

کیا گیا کہ دونوں میں پہلے کون سا شہر فتح ہوگا قسطنطنیہ یا روم؟ اس پر عبداللہ بن عمرو نے ایک صندوق منگایا جس میں بہت سے خانے تھے۔ اس میں ایک خانے سے انھوں نے اپنا ایک نوشتہ نکالا۔ اس کے بعد فرمایا کہ اسی طرح ہم بھی ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد بیٹھے ہوئے آپؐ کے فرمودات لکھ رہے تھے کہ اتنے میں کسی نے آپؐ سے سوال کر دیا کہ دونوں شہروں میں سے پہلے کونسا شہر فتح ہوگا قسطنطنیہ یا روم؟ آپؐ نے فرمایا: ہرقل کا شہر یعنی قسطنطنیہ پہلے فتح ہوگا۔ رومیہ 'روم' کا عربی تلفظ ہے جسے سب جانتے ہیں کہ اٹلی کی راجدھانی ہے۔ شروع شروع میں اس کا تلفظ اسی طرح تھا جیسا کہ معجم البلدان وغیرہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ قسطنطنیہ تو فتح ہو چکا۔ روم کا فتح ہونا باقی ہے۔ ہمارے صادق و مصدق صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کی خوشخبری سنادی ہے وہ بھلا پوری ہوئے بغیر کیسے رہ سکتی ہے؟

۴۔ ابو داؤد اور حاکم کی ذکر کردہ روایت جسے بیہقی نے اپنی کتاب 'المعرفۃ' میں صحیح قرار دیا ہے۔ اس کے راوی حضرت ابوہریرہ ہیں۔ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ عَلٰى رَأْسِ كُلِّ مِائَةِ سَنَةٍ مَنْ يُجَدِّدُ لَهَا دِيْنَهَا۔

اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر سو سال بعد ایسے لوگوں کو اٹھاتا رہے گا جو اس کے لئے اس کے دین کے احیاء اور اس کی تجدید کا فریضہ انجام دیں گے۔

حافظ عراقی وغیرہ نے بھی اس کی سند کو صحیح بتایا ہے۔ سیوطی نے بھی 'جامع الصغیر' میں اس پر 'صحیح' کی علامت بنائی ہے۔

۵۔ امام احمد اور ترمذی کی روایات حضرت انس سے۔ مسند کی دوسری روایت حضرت عمار

(بقیہ صفحہ ۱۴۷ سے آگے) 'حسن' کہا ہے۔ ہمارے زمانے کے عظیم محدث ناصر الدین البانی نے اپنے 'سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ' میں اسے نقل کیا ہے۔ (مصنف)

یاسر سے ہے۔ اسی طرح عبدالرزاق نے بھی اپنی تصنیف میں حضرت علیؓ سے اور طبرانی نے حضرت عبداللہ بن عمرو سے اس کی روایت کی ہے جس کی اسناد حسن ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

مَثَلُ أُمَّتِيْ مَثَلُ الْمَطَرِ، لَا يُدْرٰى أَوَّلُهُ خَيْرٌ أَمْ آخِرُهٗ۔

میری امت کی مثال بارش کی سی ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی پہلی کڑی زیادہ خیر و برکت کی حامل ہوگی یا آخری۔

آپؐ کے فرمانے کا منشا یہ ہے کہ جس طرح ہر بارش کے بعد زمین رنگ برنگ کے پودوں سے لہلہا اٹھتی ہے اور ہر برسنے والی گھٹا اپنی الگ الگ تاثیر رکھتی ہے۔ یہی حال میری امت کا بھی ہے کہ اس کی ہر نسل امتیازی خصوصیات کی حامل ہوگی جو زندگی میں اس کے لئے خیر و برکت کی ضمانت فراہم کرے گی، اور اسی کی مناسبت سے وہ ہر دور میں اپنا امتیازی کردار ادا کرے گی۔

۶۔ حذیفہ بن الیمان کی روایت جسے احمد اور بزار نے نقل کیا ہے۔ اس میں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ ملتے ہیں:

تَكُوْنُ النُّبُوَّةُ فِيْكُمْ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ تَكُوْنَ، ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ، ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةٌ عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ، فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ تَكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا، ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا عَاضًّا، وَفِيْ رِوَايَةٍ: عَضُوْضًا (یعنی فیہ عض و

تمہارے درمیان نبوت کا زمانہ رہے گا جب تک اللہ چاہے گا کہ وہ رہے پھر اللہ اسے اٹھالے گا جب چاہے گا، پھر اس کے بعد نبوت کے طور پر خلافت کا زمانہ ہوگا، پھر وہ رہے گا جب تک کہ اللہ چاہے گا کہ وہ رہے، پھر اللہ اسے اٹھالے گا جب وہ چاہے گا کہ اسے اٹھالے۔ اس کے بعد بیہمانہ اور ظالم بادشاہت

ظُلْمٌ، فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَرْفَعَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ مُلْكًا جَبْرِيًا (مُلْكٌ فِيْهِ قَهْرٌ وَ جَبَرُوْتٌ) فَتَكُوْنُ مَا شَاءَ اللّٰهُ اَنْ تَكُوْنَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا اِذَا شَاءَ اَنْ يَرْفَعَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ خِلَافَةً عَلٰى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ ثُمَّ سَكَتَ [۱]

کا زمانہ ہوگا۔ پھر وہ رہے گا جب تک اللہ چاہے گا کہ وہ رہے پھر اللہ اسے اٹھالے گا جب چاہے گا کہ اسے اُٹھالے۔ پھر اس کے بعد جبر و استبداد پر عمل پیرا بادشاہت کا زمانہ ہوگا پھر وہ رہے گا جب تک اللہ چاہے گا کہ وہ رہے پھر اللہ اُٹھالے گا جب وہ چاہے گا کہ اسے اُٹھالے پھر آخر میں نبوت کے طرز پر خلافت کا زمانہ ہوگا اس کے بعد آپؐ خاموش ہو گئے۔

اس حدیث پاک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن امور کی نشاندہی کی ہے اس کا بیشتر حصہ صحیح ثابت ہو چکا ہے اور امت اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہے۔ خلافت راشدہ کا زمانہ، اس کے بعد ظالم بادشاہت اور پھر جبری حکومت ان تینوں چیزوں کا مشاہدہ امت کر چکی ہے۔ دورِ آخر میں آپؐ نے جس خلافت کی نشاندہی کی ہے جسے آپؐ نے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نام دیا ہے، بس اس کا دیکھنا باقی ہے۔ صرف یہی ایک چیز ہے جو ابھی ہمارے سامنے نہیں آسکی ہے۔ لیکن جب آپؐ نے فرمایا ہے تو آج نہیں تو کل ان شاء اللہ وہ معرضِ وجود میں آکر رہے گی۔ البتہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں اور یہ سارا کام خود بخود انجام پا جائے گا۔ نہیں بلکہ ہمیں اسے روبکار لانے اور اس خواب کو حقیقت کے روپ

---

[۱] حذیفہ بن یمان کی اس روایت کو بزار اور احمد نے دوسری جگہ مزید تفصیل کے ساتھ اور طبرانی نے 'اوسط' میں اس کے ایک حصے کو نقل کیا ہے۔ صاحب 'مجمع الزوائد' نے اس کے رواۃ کو ثقہ کہا ہے۔ ورجالہ ثقات۔ علامۂ العصر ناصر الدین البانی نے بھی اسے اپنے مشہور 'سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ' میں نقل کیا ہے (مصنف)

میں دیکھنے کے لئے جان توڑ کوشش کرنی پڑے گی۔ روئے زمین پر ہر جگہ اللہ کی جو سنت جاری ہے یہ واقعہ بھی اسی کے مطابق ظہور پذیر ہو سکے گا یعنی کہ اہل ایمان اپنی محنت و کوشش اور جدوجہد کا حق ادا کریں پھر ان شاء اللہ نتیجہ سامنے آکر رہے گا۔

اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور بہت سی حدیثیں ہیں جن میں یہی مضمون بیان ہوا ہے۔ مثال کے طور پر آپؐ کی درج ذیل احادیث:

۷۔ لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِيْ قَائِمَةً بِاَمْرِ اللّٰهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ حَتّٰى يَاْتِيَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ ظَاهِرُوْنَ لِلنَّاسِ۔ (احمد۔ بخاری)

میری امت کا ایک گروہ اللہ کے اس معاملے (یعنی دین) کو برابر تھامے لئے کھڑا رہے گا، اس کا کچھ نقصان نہ کر سکیں گے وہ لوگ اسے چھوڑیں گے یا اس کی مخالفت کریں گے۔ یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ (یعنی قیامت) آجائے گی درین حالیکہ وہ لوگوں پر غالب ہوں گے۔

۸۔ لَنْ يَبْرَحَ هٰذَا الدِّيْنُ قَائِمًا تُقَاتِلُ عَلَيْهِ عِصَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ۔ (مسلم)

یہ دین برابر قائم رہے گا، مسلمانوں کی ایک جماعت اس کے لئے برابر لڑتی رہے گی یہاں تک کہ قیامت برپا ہو جائے۔

۹۔ لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِيْ يُقَاتِلُوْنَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِيْنَ عَلٰى مَنْ نَاوَاهُمْ حَتّٰى يُقَاتِلَ آخِرُهُمُ الْمَسِيْحَ الدَّجَّالَ۔ (ابو داؤد)

میری امت کا ایک گروہ حق کے لئے برابر لڑتا رہے گا اور وہ ان لوگوں پر غالب رہے گا جو اس کی مخالفت کریں گے یہاں تک کہ آخر میں یہ لوگ مسیح دجال سے جنگ کریں گے۔

۱۰۔ لَيُدْرِكَنَّ الْمَسِيْحَ اَقْوَامًا اِنَّهُمْ لَمِثْلُكُمْ اَوْ خَيْرٌ ثَلَاثًا وَلَنْ يُخْزِيَ اللّٰهُ

(آخر زمانہ میں) مسیح کو وہ لوگ ملیں گے جو تم جیسے ہوں گے یا تم سے بھی بہتر ہوں گے۔ یہ بات

أُمَّةٌ أَنَا أَوَّلُهَا وَالْمَسِيحُ آخِرُهَا۔ (رواہ ابن ابی شیبہ)

آپ نے تین بار فرمائی اور اللہ ہرگز اس امت کو رسوا نہیں کرے گا جس کے شروع میں میں ہوں اور جس کے آخر میں مسیح ہوں گے۔

۱۱۔ بَشِّرْ هٰذِهِ الْأُمَّةَ بِالسَّنَاءِ وَالدِّينِ وَالرِّفْعَةِ وَالنَّصْرِ وَالتَّمْكِينِ فِي الْأَرْضِ [له]

اس امت کو بشارت دو اوج واقبال، دین (کی سربلندی)، عظمت و رفعت دشمنوں پر فتح اور زمین میں غلبہ واقتدار کی۔

۱۲۔ لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَكْثُرَ الْمَالُ وَيَفِيضَ، حَتّٰى يُخْرِجَ الرَّجُلُ زَكَاةَ مَالِهِ فَلَا يَجِدُ أَحَدًا يَقْبَلُهَا مِنْهُ، وَحَتّٰى تَعُودَ أَرْضُ الْعَرَبِ مُرُوجًا وَأَنْهَارًا۔ (مسلم)

قیامت برپا نہیں ہوگی یہاں تک کہ لوگوں میں مال کی ریل پیل اور بہتات ہو جائے، یہاں تک کہ آدمی اپنے مال کی زکوٰۃ نکالے گا تو اسے کوئی اس کا لینے والا نہ ملے گا اور یہاں تک کہ عرب کی سرزمین میں سرسبزی و شادابی آجائے اور اس میں نہریں جاری ہو جائیں۔

۱۳۔ لَا تَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى تُقَاتِلُوا الْيَهُودَ فَيَخْتَبِئَ الْيَهُودِيُّ وَرَاءَ الْحَجَرِ فَيَقُولُ الْحَجَرُ: يَا عَبْدَ اللّٰهِ أَوْ يَا مُسْلِمُ هٰذَا يَهُودِيٌّ وَرَائِي فَاقْتُلْهُ۔ (بخاری)

قیامت برپا نہیں ہوگی یہاں تک کہ تمہاری یہودیوں سے جنگ ہو اور حالت یہ ہوگی کہ اگر کوئی یہودی پتھر کے پیچھے چھپ کر (اپنی جان بچانی) چاہے گا تو پتھر بول اٹھے گا: اے اللہ کے فلاں بندے یا اے فلاں مسلمان! یہ میرے پیچھے یہودی (چھپا) پڑا ہے، تو اس کا کام تمام کر دے۔

۱۴۔ لَوْ لَمْ يَبْقَ مِنَ الدُّنْيَا إِلَّا يَوْمٌ لَطَوَّلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ الْيَوْمَ حَتّٰى يَبْعَثَ اللّٰهُ

اگر دنیا کی مدت وجود میں ایک دن بھی باقی رہے گا تو اللہ تعالیٰ اسے دراز کر دے گا یہاں تک کہ

[له] رواہ احمد وابن حبان فی صحیحہ والحاکم والبیہقی۔

فِيهِ رَجُلًا مِنِّي، يَمْلَأُ الْأَرْضَ عَدْلًا كَمَا مُلِئَتْ ظُلْمًا وَجَوْرًا۔ (ابوداؤد)

اللہ اس کے اندر میرے (گھرانے) سے ایک آدمی پیدا کرے جو زمین کو عدل وانصاف سے بھر دے گا جیسا کہ وہ اس سے پہلے ظلم وجور سے بھری ہوئی تھی۔

اس مضمون کی ان بے شمار حدیثوں کو دیکھ لینے کے بعد کسی شخص کے لئے جائز نہیں رہ جاتا کہ وہ دور فتن کی ایک یا چند حدیثوں کا حوالہ دے کر، جبکہ ان کا ایک مخصوص سیاق اور ایک خاص موقعہ و محل ہے، اصلاح احوال کی کوششوں سے یکسر صرف نظر کرتے ہوئے بالکل ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے۔

عصمت حدیث کی حفاظت اسی طرح داعی کے لئے ضروری ہے کہ دشمنان اسلام نے، خواہ وہ مسیحی مبلغین ہوں یا مستشرقین یورپ یا خدا بیزار فلاسفہ اور اہل قلم، شکوک وشبہات ڈالنے کی صورت میں حدیث وسنت پر جو حملے کئے ہیں ان کے بالمقابل وہ پوری طرح چوکنا رہے۔ اس حملے کی سنگینی کا اندازہ اس سے کیجئے کہ بہت سے لوگ جو صبح سے شام تک اسلام کا دم بھرتے ہیں، اس کے اثر سے محفوظ نہیں رہ گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اس فکری حملے نے ان کے ذہن کے سانچے کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے، چنانچہ ان میں بہت سے لوگ ہیں جو حضرات صحابہ کرامؓ پر سب وشتم کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ کچھ اور لوگ ہیں جنھیں حدیث کے بنیادی مآخذ تک پر اعتبار نہیں، اور تو اور صحیح بخاری کا استناد بھی ان کے نزدیک محل نظر ہے۔ کچھ دوسرے لوگ ہیں کہ جہاں کوئی حدیث ان کی اپنی پسند کے خلاف نظر آئی فوراً اس کے قابل رد ہونے کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں۔ خواہ وہ صحت وشہرت کے کتنے ہی اعلیٰ مقام پر فائز کیوں نہ ہو۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جو حدیثوں کے حقیقی منشا کے علی الرغم ان کی اپنی بالکل من مانی تشریحیں کرتے ہیں۔ پھر انھیں کی بنیاد ان کو طرح طرح سے

مطعون کرتے اور لوگوں میں اس کا اشتہار دیتے پھرتے ہیں۔ اسی فہرست میں بعض عقل کے کورے وہ لوگ بھی ہیں جو مغربی مصنفین کے پھیلائے ہوئے اس طرح کے شکوک وشبہات کو بالکل طوطے کی طرح رٹے ہوئے ہیں اور کچھ سوچے سمجھے بغیر موقعہ ہو نہ ہو ان کے دہرانے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ بعض ایسے خیانت کار بھی ہیں جو ان وسوسہ اندازیوں کی خامیوں اور کمزوریوں کو اچھی طرح سمجھنے کے باوجود جہاں موقعہ پاتے ہیں انھیں دھرانے سے باز نہیں آتے۔

افسوس ہے کہ عالم اسلام پر یہ مشنری اور استشراقی حملہ ایسے وقت میں ہوا جبکہ وہاں اسلام، اس کے مآخذ اور اس کی تہذیب وثقافت کی نسبت سے ایک طرح کا تہذیبی خلا موجود تھا اور یوں کہنا چاہئے کہ گویا پورا عالم اسلام فکری پسماندگی کے سائے تلے سانس لے رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مشن اور استشراق کو اپنی جڑیں مضبوط جمانے اور پوری طرح پر پرزے نکالنے کا موقعہ ملا۔ علم کے نام پر جہل کی خوب گرم بازاری ہوئی اور جرأتیں ایسی بڑھیں کہ وہ حدیثیں جن پر ابتدائے اسلام ہی سے امت کا اتفاق چلا آتا تھا اور جنھیں ہر دور اور ہر زمانے میں قبول عام حاصل رہا، اس طرح کی احادیث کو بھی قابل رد قرار دینے میں لوگوں کو کوئی باک نہ رہا۔

یہاں تک کہ بعض لوگ یہ تک خیال رکھتے ہیں کہ بنی الاسلام علی خمس[۱] (اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے) والی حدیث بھی جبکہ ذخیرۂ حدیث میں اسے شامل کئے بغیر چارہ نہیں کہ

---

[۱] یہ بخاری ومسلم کی متفق علیہ حدیث ہے جس کا متن اور ترجمہ حسب ذیل ہے:

بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ۔	اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، اس بات کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنے زکوٰۃ دینے اور حج اور رمضان کے روزے پر۔
(بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان)	(مترجم)

امت میں ہر دور میں یہ زبان زد خواص وعوام رہی ہے، اور اسلامی معاشرے کا ہر فرد چھوٹا بڑا مرد عورت لازمی طور پر اس سے آشنا رہا ہے، لیکن ان کا خیال یہ ہے کہ یہ حدیث اہل استعمار کی ایجاد کردہ ہے۔ اچنبھا آپ کو اس پر جس قدر بھی ہو صورت واقعہ یہی ہے۔ یہ الزام اس پر کیوں ہے؛ اس لئے کہ ان کے خیال کے مطابق اس میں جہاد کا تذکرہ نہیں ہے۔ (اس لئے کہ اسی تصور جہاد کا فقدان تھا جس کے سبب بیرونی استعمار عالم اسلام پر اپنے پنجے گاڑنے میں کامیاب ہو سکا اور ایک عرصہ دراز تک ملکی عوام کو حکومت واقتدار سے محروم کرکے انھیں غلامی کی زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور کئے رہا۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی حدیث میں اسلام کی بنیادوں کا تذکرہ ہو اور وہ جہاد کے ذکر سے خالی ہو۔ بس ہو نہ ہو کہ اہل استعمار نے مسلمانوں کو بے ضرر بنانے کی غرض سے اس حدیث کو وضع کرکے ان میں رائج کر دیا ہو۔ بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست)

اسی طرح کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کو کہ جس کا ذکر ابھی تھوڑی دیر پہلے ہو چکا ہے: "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک کہ یہودیوں سے تمہاری جنگ نہ ہو، یہاں تک کہ یہودی پتھر کی اوٹ میں چھپے گا تو پتھر آواز دے گا کہ: اے اللہ کے فلاں بندے یا اے فلاں مسلمان! یہ میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے۔ آ اور اس کا کام تمام کر دے"۔ قابل رد تصور کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ حدیث مسلمانوں کو خواب خرگوش میں پڑے رہنے کی تلقین کرتی ہے کہ وہ بس خاموش پڑے انتظار کی گھڑیاں گنتے رہیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت آئے جبکہ پتھر ان سے ہم کلام ہو اور ان کے سامنے یہودی کی نشاندہی کرے۔ لیکن یہ مہمل اعتراض اٹھاتے ہوئے وہ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ اس حدیث پاک میں پتھر کے ہمکلام ہونے کی جو بات کہی گئی ہے اس کا مطلب لازمی طور پر یہی تو نہیں کہ اس کی گفتگو زبان قال سے ہو بلکہ

ہوسکتا ہے کہ اس کی ہمکلامی زبان حال سے ہو پس آپ کی اس تلمیح کا منشا یہ ہے کہ اس وقت زمین کا ایک ایک ذرہ مسلمانوں کی بھلائی کے لئے سرگرم کار ہوگا بشرطیکہ یہ ہے کہ یہود کے ساتھ یہ جنگ اسلام کے جھنڈے تلے لڑی جائے اور اس کا مقصد پورے زمین پر خدائے واحد کی بندگی کا علم بلند کرنا ہو۔ اس لئے کہ اسی صورت میں ایک مسلمان اے اللہ کا بندہ، یا عبداللہ! یا اے مسلمان' یا مسلم' کے لقب سے یاد کئے جانے کا مستحق ہوگا۔ (جبکہ حدیث کے اندر اس کی صراحت موجود ہے)

اسی طرح کچھ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کا قابلِ رد ہونا ضروری خیال کرتے ہیں جس کے مطابق آپ نے ایک کج فہم درشت خو اور بدکردار شخص کے ساتھ انتہائی نرم لہجے میں بات کی اور اس سے انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ ملے حالانکہ ملاقات سے قبل آپ اس کے بارے میں فرما چکے تھے کہ: کیا ہی برا آدمی ہے یہ، 'بئس اخو العشیرۃ، ان کے نزدیک اس حدیث کو قابلِ رد قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے خیال کے مطابق خدا نا کردہ آپ کا یہ طرز عمل چاپلوسی و مداہنت اور دورخے پن کی آئینہ داری کرتا ہے۔ (جبکہ نبی کی ذات سے اس کی کسی طرح توقع نہیں کی جاسکتی ہے) پتہ نہیں یہ اعتراض کرتے ہوئے وہ اس بات کو کیسے فراموش کر جاتے ہیں کہ چاپلوسی و مداہنت کے علاوہ ایک چیز دلجوئی اور خاطر داری' مداراۃ' بھی ہوتی ہے۔ مداہنت تو بیشک کمزوری کا شکار اور نفاق زدہ انسانوں کا شیوہ ہے۔ لیکن دلجوئی اور خاطر داری تو ہر شریف النفس اور سمجھ دار انسان کے کردار کا ایک لازمی جزو ہے۔ (پھر بھلا ایک نبی اس سے کیونکر بے نیاز ہو سکتا ہے) آدمی اگر دین کے فائدے کی خاطر کسی دنیوی ناگواری کو انگیز کرے تو اس کا نام' مداہنت (چاپلوسی) نہیں' مداراۃ (دلداری) ہے۔

'مداہنت' کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب آدمی اپنی دنیا بنانے کی خاطر دین کو داؤں پہ لگا کر زبان سے کچھ کہے اور اس کا عملی مظاہرہ کچھ اور ہو۔

حدیث پاک پر اس تبشیری اور استشراقی حملے کا مقابلہ اس کی کمزوریوں کو بے نقاب اور اس کے کھوکھلے پن کو طشت از بام کرنے کے سلسلے میں مسلمان اہلِ قلم کی درج ذیل کتابوں سے استفادہ کیا جاسکتا ہے:

السّنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلام (ڈاکٹر مصطفٰی سباعی)، السّنۃ قبل التدوین (عجاج الخطیب)، الانوار الکاشفۃ (فی الرد علی کتاب أبی ریۃ) (عبدالرحمٰن بن یحییٰ المعلمی الیمانی)، الحدیث والمحدثون (ڈاکٹر محمد ابوزہو)، دفاع عن ابی ہریرۃ (ڈاکٹر عجاج الخطیب)، دراسات فی الحدیث النبوی (انگریزی میں) (ڈاکٹر محمد مصطفٰی الاعظمی)، دفاع عن السنۃ (ڈاکٹر محمد ابوشہبہ)۔

عوام کے سامنے مشکل حدیثوں کو پیش کرنے سے اجتناب اسی طرح داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ عوام النّاس کے سامنے مشکل حدیثیں پیش کرنے سے اجتناب کرے جن کا مضمون آسانی سے ان کی گرفت میں نہ آسکتا ہو۔ اس لئے کہ اس کی تشریح و تاویل میں جو کچھ کہا جائے گا ان کی سمجھ سے بالاتر ہوگا، اور وہ اسے کسی صورت ہضم نہ کرسکیں گے، اور جتنی بھی کوشش کی جائے بات ان کی حلق سے نیچے نہ اتر سکے گی۔ مثال کے طور پر مکھی والی حدیث (جسے کھانے وغیرہ میں ڈوب جانے کی صورت میں اس کے ایک پر کے ساتھ دوسرے پر کو بھی ڈبو دینے کی تاکید کی گئی ہے اس تعلیل کے ساتھ کہ اگر اس کے ایک پر میں زہر ہے تو دوسرے میں تریاق ہے) یا مثلاً سورج کے سجدہ کرنے والی حدیث جس میں آتا ہے کہ وہ ہر روز

عرشِ الٰہی کے نیچے سجدہ کرتا ہے۔ نیز انہی کے مشابہ دوسری احادیث۔

دین کے کسی داعی کے لئے یہ بات سمجھداری کی نہ ہوگی کہ ضرورت بلاضرورت اور موقعہ بے موقعہ لوگوں کو اس طرح کی حدیثیں سناتا چلا جائے۔ سمجھدار داعی وہ ہے جو خاص طور پر ان حدیثوں سے مطلب رکھے جو انسان کی عملی زندگی سے تعلق رکھتی ہوں' وہ حدیثیں جو متشابہات کی قبیل سے ہیں، یا جن کا مضمون مشکل ہے اور جن کی عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں سمائی نہیں ہوتی ہے، داعی کو چاہئے کہ ان میں اُلجھنے اور دوسروں کو اُلجھانے کے بجائے حتی الامکان انھیں چھوڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔

امام نوویؒ نے تقریب، میں محدث کے لئے درس حدیث کے آداب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو چیزیں طالب علموں کے فہم سے بالاتر ہوں اور آسانی کے ساتھ ان کی سمجھ میں نہ آسکتی ہوں محدث کو چاہئے کہ ان کے سامنے انھیں بیان کرنے سے اجتناب کرے۔

امام سیوطی اس کی شرح 'التدریب علی التقریب' میں اس کی تفصیل پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں' مثلاً صفات باری تعالیٰ سے متعلق احادیث، اس لئے کہ طالب علموں کے لئے اس موقعہ پر غلطی کر جانا کچھ بعید نہیں، وہ دھوکے میں پڑ کر تشبیہ و تجسیم کے مسئلے میں الجھ سکتے ہیں [1]

---

[1] ہمارے خیال میں علامہ سیوطیؒ کے اس فرمانے کا منشا یہ ہے کہ صفات باری سے متعلق متفرق حدیثوں کو (باقاعدہ ایک موضوع کی صورت میں) یکجا بیان نہ کیا جائے۔ اور عوام الناس کے سامنے موقعہ بے موقعہ اس صورت میں ان کی تکرار نہ کی جائے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مقام پر انھیں باقاعدہ ایک موضوع کی صورت میں اکٹھا بیان نہیں کیا ہے۔ موقعہ کی مناسبت سے آپؐ نے اِکّا دُکّا صفات ہی کا بیان فرمایا ہے۔ (مصنف)

شاید حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اسی طرح کے موقعہ کے لئے فرمایا ہے کہ: کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کی جائے؛ لوگوں سے وہی باتیں بیان کرو جو ان کی سمجھ میں آجائیں۔ جن چیزوں پر انھیں اچنبھا ہو انھیں بیان کرنے سے احتراز کرو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے بھی ہمیں اسی کی رہنمائی ملتی ہے۔ جسے بیہقی نے 'شعب الایمان' میں مقداد بن معدیکرب کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

إِذَا حَدَّثْتُمُ النَّاسَ عَنْ رَبِّهِمْ فَلَا تُحَدِّثُوهُمْ بِمَا يَغْرُبُ أَوْ يَشُقُّ عَلَيْهِمْ۔	جب تم لوگوں سے ان کے رب کی بابت کوئی چیز بیان کرو تو کوئی ایسی چیز ان سے بیان نہ کرو جس کے اندر اچنبھا ہو یا جس کا سہارنا ان کے لئے مشکل ہو۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود کا قول ہے جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے:

مَا أَنْتَ بِمُحَدِّثٍ قَوْمًا حَدِيثًا لَا تَبْلُغُهُ عُقُولُهُمْ إِلَّا كَانَ لِبَعْضِهِمْ فِتْنَةً۔	جب بھی تم لوگوں سے کوئی ایسی بات بیان کرو گے جس تک ان کی عقل کی رسائی نہ ہو تو ان میں سے کچھ لوگوں کے لئے یہ چیز ضرور فتنہ کا باعث بن کر رہے گی۔

خطیب بغدادی نے بھی ایک موقعہ پر اسی طرح کی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں: "محدث کو چاہئے کہ عوام الناس کے سامنے رخصت کی حدیثوں کو بیان کرنے سے اجتناب کرے۔ اسی طرح مشاجرات صحابہؓ اور اسرائیلیات کی روایت سے بھی اسے اجتناب کرنا چاہئے"۔ اس زمانے میں لوگوں کا علم دین اور اس کے مطالب کے فہم کا

جو اعلیٰ معیار تھا اور آج اس پہلو سے امت جس حالت زار کا شکار ہے، اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے تو اس قول کی معنویت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔

علامہ سیوطی اور خطیب بغدادی نے اس ذیل میں جو مثالیں پیش کی ہیں اس کے سلسلے میں تو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک اس قاعدہ کلیہ کا سوال ہے اس میں کلام کی گنجائش نہیں۔ عوام الناس کے سامنے کوئی چیز بیان کرنے سے پہلے اس کی اچھی طرح تحقیق کر لینی چاہئے کہ آیا وہ چیز بیان کرنے کی ہے بھی یا نہیں۔ اس لئے کہ ہر چیز جسے آدمی جانتا ہو ضروری نہیں کہ اسے ہر جگہ بیان بھی کیا جائے پھر یہ کہ جو بات ایک شخص سے کہی جا سکتی ہے ضروری نہیں دوسرے شخص سے بھی اس کا کہنا مناسب ہو۔ اسی طرح کوئی چیز ایک خاص ماحول کے لئے موزوں اور دوسرے ماحول کے لئے اسی قدر ناموزوں ہو سکتی ہے۔ اسی پر قیاس کرتے ہوئے اگر ایک چیز ایک زمانے کے لئے موزونیت رکھتی ہے تو ضروری نہیں کہ دوسرے زمانے کے لئے بھی وہ اسی طرح موزوں ہو پس داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی بات کہتے ہوئے موقعہ و محل اور حالات و زمانہ کی پوری طرح رعایت ملحوظ رکھے۔ اس معاملے میں اس کی ذمہ داریاں ایک مفتی کے مقابلے میں بھی زیادہ بڑھی ہوئی ہیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس باب میں ہماری رہنمائی کے لئے صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث کافی ہے: جسے امام مسلم کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی اپنے یہاں نقل کیا ہے:

كَفَىٰ بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ۔

آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے کافی ہے کہ ہر وہ بات جو اس کے کان میں پڑ جائے اسے بیان کرتا پھرے۔

اسی کی رہنمائی ہمیں امام مالکؒ کے اس قول سے بھی ملتی ہے:

اِعْلَمْ أَنَّهُ لَيْسَ يَسْلَمُ رَجُلٌ حَدَّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ، وَلَا يَكُونُ إِمَامًا وَهُوَ يُحَدِّثُ بِكُلِّ مَا سَمِعَ۔

خوب سمجھ لو! وہ شخص صحیح معنوں میں مسلمان نہیں ہو سکتا جو ہر اس چیز کو بیان کرتا پھرے جو اس کے کان میں پڑ جائے۔ اسی طرح (حدیث میں) اسے امامت کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا اگر وہ ہر اس چیز کو جو اس کے کان میں پڑ جائے بیان کرتا پھرتا ہے۔

اسی کی نشاندہی حضرت ابوہریرہ کی درج ذیل روایت بھی کرتی ہے جسے امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے:

حَفِظْتُ مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وِعَاءَيْنِ فَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ فِيكُمْ وَأَمَّا الْآخَرُ فَلَوْ بَثَثْتُهُ قُطِعَ هَذَا الْبُلْعُومُ۔

میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے دو طرح کی باتیں محفوظ رکھی ہیں۔ ان میں ایک طرح کی چیز تو میں نے تمہارے درمیان عام کر دی، اگر دوسری بات کو بھی اسی طرح عام کر دوں تو میری یہ گردن کاٹ دی جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت معاذ بن جبلؓ سے ایک سفر میں جو گفتگو ہوئی تھی اس سے بھی اسی حقیقت کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔ حضرت معاذؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سواری پر بیٹھے ہوئے تھے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حال میں ان کے سامنے بڑے وجد انگیز انداز میں اس حقیقت کی وضاحت فرمائی کہ بندوں پر اللہ کا کیا حق ہے اور اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے[1] حضرت معاذؓ اسے سن کر پھولے نہیں سما رہے تھے۔ کہنے لگے کیا میں لوگوں کو اس کی خوشخبری نہ سنا دوں؟ آپ نے فرمایا: نہیں اگر تم انھیں یہ خوشخبری سنا دو گے

[1] اس گفتگو میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بندوں پر اللہ کا حق یہ بتایا تھا کہ (بقیہ صفحہ ۹۲ پر)

تو وہ بالکل اطمینان کر کے بیٹھ جائیں گے اور عمل سے ہاتھ اٹھالیں گے۔ چنانچہ حضرت معاذؓ نے اسے اس وقت بیان کیا جبکہ ان پر نزاع کا عالم طاری تھا کہ مبادا وہ اسے اپنے سینے ہی میں لئے دنیا سے چلے جائیں، اور اس طرح کتمان علم کا گناہ ان کے سر آئے۔ اس کی پوری تفصیل بخاری میں موجود ہے۔ (سلف کے مذکورہ بالا اقوال اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ احادیث ہر ایک سے یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ ضروری نہیں کہ آدمی کو جو کچھ معلوم ہو وہ اسے ہر جگہ اور ہر موقعہ پر بیان بھی کرتا رہے۔ اس کے بجائے اسے موقعہ ومحل کی رعایت اور مخاطب کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کرنی چاہئے۔)

کمزور اور موضوع احادیث سے اجتناب | اسی طرح داعی کے لئے ضروری ہے کہ موضوع ہی نہیں بلکہ ضعیف اور منکر حدیثوں سے بھی اپنے کو دور رکھے۔ علمائے امت نے موضوع حدیثوں کی روایت سے سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔ جواز کی صرف ایک صورت ہے جبکہ اس کا مقصد لوگوں کو ان کے خلاف آگاہی دینا ہو اور وہ ساتھ ہی صاف صاف بتا تا جائے کہ یہ روایت 'موضوع' ہے تاکہ اس کو پڑھنے اور سننے والے اپنے کو اس سے بچا کر رکھیں۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ: موضوع حدیث کی روایت حرام ہے اگر آدمی کو اس کا پتہ ہے قطع نظر اس سے کہ اس کا مضمون کیا ہے۔ وہ احکام سے متعلق ہے یا واقعات اور قصص سے یا ترغیب و

بقیہ صفحہ ۱۶۱ : وہ صرف اس کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اللہ پر بندوں کا حق آپؐ نے یہ قرار دیا تھا کہ جو لوگ اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہیں کریں گے۔ انھیں وہ (دائمی) عذاب کا شکار نہیں بنائے گا۔ حضرت معاذؓ لوگوں کو اسی کی خوشخبری سنانے کے لئے نکلے تھے۔ آں جنابؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے خچر پر سوار تھے اور دونوں کے بیچ صرف کجاوہ حائل تھا۔ (بخاری ومسلم)، بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح : کتاب الایمان (مترجم)

ترہیب وغیرہ سے اس کے جواز کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ روایت بیان کرنے کے ساتھ ہی وہ اس کے موضوع ہونے کی وضاحت کر دے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث ہے جس کی روایت امام مسلم نے حضرت سمرۃ بن جندب سے کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

مَنْ حَدَّثَ عَنِّيْ بِحَدِيْثٍ يَرَىٰ اَنَّهٗ كَذِبٌ فَهُوَ اَحَدُ الْكَاذِبِيْنَ۔ [۱]

جو شخص میرے حوالہ سے کوئی حدیث بیان کرے جو صاف دکھائی دیتی ہو کہ جھوٹ ہے تو وہ جھوٹوں میں وہ بھی ایک جھوٹا ہے۔

علمائے امت میں بہت سے لوگوں نے خاص انھی احادیث کو اپنا موضوع بنایا۔ انھوں نے ان کی کمزوریوں کو بے نقاب کیا اور ان کے باطل اجزاء کی ایک ایک کر کے نشاندہی کی، اور واضعین حدیث اور حدیث کے چشمۂ صافی میں اپنی طرف سے کھوٹ کی آمیزش کرنے والوں کی ناپاک حرکتوں کا انھوں نے بالکل پردہ چاک کر کے رکھ دیا۔ حضرت عبداللہ بن مبارک سے کسی شخص نے سوال کیا کہ: (آپ لوگوں کے بعد) ان موضوع حدیثوں سے کون عہدہ برآ ہوگا؟ آپ نے فرمایا: "ان سے نمٹنے کے لئے انشاء اللہ ہر دور میں کچھ قدآور لوگ زندہ رہیں گے"۔ اسی طرح علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں: "گمراہی پھیلانے والوں نے جب یہ دیکھا کہ قرآن کے اندر کسی قسم کی ترمیم وتحریف پر ان کا بس نہیں چلتا ہے تو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں اپنی طرف سے اضافے کرنے شروع کر دیئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فتنے کا مقابلہ کرنے کے لئے امت کے اندر ایسے علماء پیدا کئے جو حدیث پاک کے دفاع کے لئے سینہ سپر ہو گئے، اور انھوں نے صحیح احادیث کو غلط حدیثوں سے بالکل چھانٹ کر الگ کر دیا، اور امید ہے کہ ان شاء اللہ کوئی زمانہ ایسے

[۱] یُرٰی یا کے پیش کے ساتھ بصیغۂ مجہول اور کاذبین ذ کے زیر اور ن کے زبر کے ساتھ بصورت جمع، یہی مشہور روایت ہے اور شرح مسلم میں امام نووی نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ ملاحظہ ہو نووی بر مسلم ۱/۷ (مترجم)

لوگوں سے خالی نہیں رہے گا۔ یہ ضرور ہے کہ اس زمانے میں یہ جنس گراں بہا بہت کمیاب ہوگئی ہے۔ ہزاروں لاکھوں میں دو چار لوگ بھی اس کام کے بمشکل ہی نکل سکیں گے۔ غالباً حال وہ ہوگیا ہے جس کی طرف شاعر نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

وقد کانوا اذا عدوا قلیلا   فقد صاروا اعتزمن القلیل

تعداد تو ان کی پہلے بھی کم ہی تھی   لیکن اب تو وہ کہیں خال خال ہی نظر آتے ہیں

ابن جوزی کا انتقال ۵۹۷ھ میں ہوا ہے۔ بھلا جب چھٹی صدی ہجری کے سلسلے میں ان کا یہ تاثر تھا تو آج اگر وہ ہمارے زمانے کو دیکھتے تو پتہ نہیں ان کے تاثرات کیا ہوتے؟

بہر حال اس میں دو رائے نہیں کہ ضعیف اور موضوع احادیث نے اسلامی ثقافت کے چشمۂ صافی کو بہت کچھ گدلا کیا ہے اسلامی ثقافت کے مختلف اجزا میں انھیں نفوذ حاصل ہوا جس کے اثرات تفسیر و تصوف اور فضائل کی مختلف کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں یہاں تک کہ فقہ و احکام کی کتابیں بھی ان کی آمیزش سے نہ محفوظ رہ سکیں۔ یہی نہیں بلکہ حدیث کے بہت سے متداول مجموعے بھی اپنے کو ان کی زد سے بچانے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ نتیجہ ہے کہ اور لوگوں کو تو چھوڑتے بہت سے وہ لوگ جو اپنے کو دین کا داعی کہتے ہیں ان کے اوپر بھی یہ چیز اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہی۔ خاص طور پر ان میں وہ لوگ جن کے اندر قومیت و وطنیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس طرح کی حدیثوں سے استشہاد کرنا ان حضرات کا عام معمول ہے[۱] اس لئے کہ ان کے اندر

---

[۱] غالباً اس مقام پر مصنف کا اشارہ اس طرح کی حدیثوں کی طرف ہے جن میں متعین طور پر کچھ مقامات، افراد اور گروہوں کی منقبت بیان کی گئی ہوتی ہے جنھیں قومیت و وطنیت کے علمبردار حضرات اپنے افراد و جماعات کو بھڑکانے اور ان کے اندر ایک طرح کے احساس برتری کے پروان چڑھانے کے لئے آسانی سے استعمال کرتے اور کر سکتے ہیں۔ ائمہ حدیث اس طرح کی حدیثوں کو عام طور پر کمزور بلکہ موضوع قرار دیتے ہیں (مترجم)

اعجوبہ پن اور مبالغہ آمیزی کے وہ مضامین ہوتے ہیں جن سے عوامی ذوق کو تسکین ملتی ہے۔ اور عجائب پسند طبیعتوں کو ایک طرح کی راحت نصیب ہوتی ہے، جمعہ کا خطیب ہو یا مسجد میں درس دینے والا یا وہ عالم دین جس کے ذمہ ریڈیو پر حدیثیں سنانے کی خدمت سپرد ہے، آپ ان میں سے کسی کو سن لیں یہ جب کوئی حدیث بیان کریں گے، اس کا تعلق مردود و منکر احادیث کے ذخیرہ سے ہوگا۔ بلکہ اکثر و بیشتر رسائل اور مجلات کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی ایسی حدیثیں سامنے آتی ہیں جو خلاف عقل ہونے کے علاوہ نقل صحیح سے متصادم اور شریعت کے مسلمہ اصولوں سے ہٹی ہوئی ہوتی ہیں، اور رسائل ہی پر کیا موقوف بہت سے معاصرین کی تصنیفات بھی ان کی زد سے محفوظ نہیں ہیں۔ اگر یہ حدیثیں موضوع نہ ہوں تو ان میں کمزوری کے ایسے بے شمار پہلو ہوتے ہیں جو انھیں پایۂ اعتبار سے گرا دیتے ہیں۔

عام طور پر ان حضرات کی بنائے استدلال یہ چلتا ہوا خیال ہے کہ ترغیب و ترہیب، فضائل اور واقعات و قصص وغیرہ کے باب میں ضعیف اور کمزور سے کمزور حدیثوں کا نقل کرنا جائز ہے۔ یہاں ہم اس رائج خیال کے سلسلے میں چند باتوں کی نشاندہی ضرور سمجھتے ہیں:

۱۔ پہلی چیز تو یہ کہ یہ کوئی ایسی رائے نہیں جس پر پوری اُمت کا اتفاق ہو۔ بہت سے بلند پایہ علما کسی باب میں ضعیف اور بے اصل حدیثوں سے استدلال کو روا نہیں رکھتے۔ خواہ بات فضائل کی ہو یا کسی اور سلسلے کی۔ یحیی بن معین اور ائمہ حدیث کی ایک بڑی جماعت کی یہی رائے ہے۔ امام بخاریؒ کا مسلک بھی اس کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا جبکہ حدیث کے قبول کرنے کے سلسلے میں انھوں نے انتہائی کڑی شرطیں عائد کی ہیں۔ امام مسلم کو بھی اس کے علاوہ کسی دوسری صف میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لئے کہ انھوں نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں ضعیف اور منکر حدیثوں کی روایت کرنے والوں پر بڑی سخت تنقید کی ہے کہ یہ

بدقسمت صحیح حدیثوں کی روایت کرنے کے بجائے اس نامبارک کام میں کیوں لگ گئے۔ یہی خیال قاضی ابوبکر بن عربی کا بھی ہے، جو اپنے زمانے میں مالکیہ کے سرخیل تھے۔ ابوشامہ جو اپنے زمانے میں شوافع کے سرخیل تھے وہ بھی اسی خیال کے حامی ہیں۔ علامہ ابن حزم اور دوسرے بہت سے علمائے ظاہر کا بھی یہی مسلک ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ جب صحیح اور حسن حدیثوں کا خود اتنا بڑا ذخیرہ موجود ہے جو لوگوں کی تعلیم و تذکیر کے لئے بالکل کافی ہے تو پھر انھیں چھوڑ کر کمزور اور بے سند حدیثوں کا رُخ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جب اللہ نے ہمیں اعلیٰ و ارفع چیز دے رکھی ہے تو پھر گھٹیا اور بے وزن چیزوں کے لئے طبیعت میں اضطراب کیوں رہے؟ دین و اخلاق کا کوئی مسئلہ نہیں نہ فکر و نظر کا کوئی ایسا دائرہ پایا جاتا ہے جس کے لئے صحیح اور حسن احادیث کے ذخیرے میں کافی وافی مواد موجود نہ ہو لیکن ہمتیں ایسی گھٹیں اور مذاق اس قدر بگڑ گیا ہے، اور تحقیق و تفتیش کی زحمت اٹھائے بغیر بس جو چیز ہاتھ میں آجائے اسے لے لینے کا رجحان ایسا بڑھ گیا ہے کہ لوگ ضعیف اور بے اصل حدیثوں کے نقل کرنے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتے اور بے تکان ان کے حوالوں پر حوالے دیتے چلے جاتے ہیں۔

۳۔ تیسری چیز دھیان دینے کی یہ کہ ضعیف اور کمزور حدیثوں کو جزم کے صیغے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں۔ علامہ سیوطی "تدریب شرح تقریب" میں فرماتے ہیں:

"جب تم کسی ضعیف روایت کو بغیر سند کے بیان کرنا چاہو تو یہ نہ کہو کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمایا ہے: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَذَا اسی طرح جزم کا کوئی اور صیغہ بھی استعمال نہ کرو۔ بلکہ اس طرح کہو کہ: آپ سے یہ مروی ہے 'رُوِیَ عَنْهُ كَذَا' یا ہم تک آپ سے یہ بات پہنچی ہے۔ 'بَلَغَنَا عَنْهُ كَذَا' یا یہ کہ آپ سے یہ بات

آئی ہے 'وَرَدَ عَنْهُ' یا یہ کہ آپ سے یہ بات نقل کی گئی ہے۔ 'جَاءَ اَوْ نُقِلَ عَنْهُ' یا اسی کے مانند دوسرے اور صیغے جو اپنے اندر بجائے جزم کے احتمال رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ بعض لوگ اس طرح روایت کرتے ہیں 'رَوٰی بَعْضُهُمْ' پس یہ جو خطیبوں اور واعظوں نے عادت بنا لی ہے کہ کمزور اور ضعیف سے ضعیف حدیثوں کے سلسلے میں بھی اس سے کم ان کی زبان سے کوئی بات نکلتی ہی نہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے، 'قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔ اور اسے بلاتاخیر ترک کیا جانا چاہئے۔

۴۔ چوتھی بات یہ کہ جن علمائے امت نے ترغیب و ترہیب وغیرہ کے باب میں ضعیف اور کمزور روایتوں پر عمل کی اجازت دی ہے انھوں نے اس دروازے کو چوپٹ نہیں کھول دیا ہے، بلکہ اس کے لئے کچھ شرطیں لگائی ہیں۔ یہ شرطیں تین ہیں:

۱۔ اوّل یہ کہ حدیث بہت زیادہ ضعیف نہ ہو۔

۲۔ دوم یہ کہ وہ کسی اصل شرعی کے ذیل میں آتا ہو۔ یعنی قرآن اور صحیح احادیث کی روشنی میں عمل کرنا ثابت ہو۔

۳۔ سوم یہ کہ اس پر عمل کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے ثابت ہونے کا اعتقاد نہ رکھا جائے بلکہ یہ خیال رکھتے ہوئے عمل کیا جائے کہ معاملہ صرف احتیاط کا ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہے کہ علمائے امت نے کسی قید اور شرط کے بغیر کمزور اور ضعیف حدیثوں کے دروازے کو چوپٹ نہیں کھول دیا ہے، بلکہ اس کے لئے انھوں نے کچھ شرطیں عائد کی ہیں۔ جن میں مذکورہ بالا تین شرطوں کے علاوہ ایک دوسری بنیادی شرط بھی شامل ہے کہ حدیث فضائل اور ترغیب و ترہیب وغیرہ کے ذیل سے ہو جس پر کوئی حکم شرعی مرتب نہ ہوتا ہو۔

ہماری رائے میں مذکورہ بالا ان شرطوں کے ساتھ دو مزید شرطوں کا اضافہ کیا جانا چاہئے۔

۱۔ اول یہ کہ حدیث مبالغہ آمیز اور گھبرا دینے والے مواد پر مشتمل نہ ہو جسے عقل کسی طرح باور کرتی ہو نہ شریعت سے اس کی کسی صورت تائید ہوتی ہو۔ اسی طرح اس کی زبان کا غرابت سے پاک اور اہل عرب کے معروف انداز بیان سے ہم آہنگ ہونا بھی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے جو ائمہ حدیث نے موضوع حدیث کا پتہ لگانے کے لئے راوی کے علاوہ روایت کے داخلی شواہد کو کافی اہمیت دی ہے۔

روایت کے انہی داخلی شواہد میں سے ایک چیز جو موضوع احادیث کا پتہ لگانے کے سلسلے میں بھی دلیل راہ کا کام دیتی ہے یہ ہے کہ: روایت ایسے مواد پر مشتمل ہو جو سراسر عقل کے خلاف ہو، اور کسی صورت سے اس کی توجیہ ممکن نہ ہو۔ اسی سے ملتی ہوئی بات یہ ہے کہ اس کا مضمون تجربہ و مشاہدہ سے کھلے طور پر متصادم ہو یا پھر یہ کہ وہ قرآن و سنت کے صریح اور قطعی نصوص سے ٹکراتی ہو یا اجماع امت کے خلاف پڑتی ہو۔ واضح رہے کہ ان تمام صورتوں میں یہ بات اسی وقت کہی جا سکے گی جبکہ دو باتوں میں کسی طرح تطبیق ممکن نہ ہو کسی صورت سے تطبیق ہو سکے اور تعارض رفع ہو جائے تو پھر بات یہ نہیں رہ جائے گی۔ علاوہ ازیں وہ حدیث بھی قابل قبول قرار نہ پائے گی جو متعلق تو ہو کسی مہتم بالشان امر سے جسے عوام کے بڑے مجمع کے سامنے بیان کیا جانا ضروری ہو لیکن اس کو نقل کرنے والا تنہا ایک آدمی ہو۔

موضوع حدیث کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ ایک چھوٹے معاملہ پر بہت بڑی وعید سنائی گئی ہو یا کسی معمولی کام پر بہت بڑے اجر کی بشارت دی گئی ہو۔ واعظوں اور قصہ گو

حضرات کے یہاں عام طور پر ہمیں اسی قبیل کی خبریں سننے کو ملتی ہیں۔

افسوس ہے کہ ہمارے زمانے میں حدیث سے اشتغال رکھنے والے بہت سے لوگ بھی ترغیب و ترہیب اور اس ذیل کے دیگر موضوعات کے سلسلے میں روایتوں کو نقل کرتے ہوئے ان اصولوں کا خاطر خواہ لحاظ نہیں رکھتے۔ گذشتہ ادوار میں تو یہ بات کسی حد تک چل جاتی تھی۔ لیکن ہمارے زمانے میں ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کا جو رجحان پیدا ہو گیا ہے اس کے پیش نظر اس طرح کی مبالغہ آمیز چیزیں لوگوں کے لئے قابل قبول قرار نہیں پاتیں اور آسانی کے ساتھ ان کے حلق سے نیچے نہیں اترتی ہیں۔ بلکہ یہ بات بھی چنداں تعجب انگیز نہ ہوگی کہ حقائق سے دور اس طرح کی بے اصل حدیثوں کے سننے کے نتیجے میں بہت سے لوگ نفس دین کے سلسلے ہی میں شک و تردد کا شکار ہو جائیں۔ اور اس پر اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کر دیں۔

اہل عرب کے معروف انداز بیان سے ہٹی ہوئی اور زبان و ادب کے پہلو سے استغراب کی حامل روایتوں کی مثال، جنھیں ذوق سلیم کسی طرح قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں، وہ حدیثیں پیش کرتی ہیں جو مثلاً دراج ابی السمح جیسے قصہ گویوں سے قرآن کریم کے بعض الفاظ کی تشریح و تفسیر کے سلسلے میں مذکور ہیں۔ جبکہ زبان و لغت کی روشنی میں ان کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ لیکن روایتوں کی صورت میں وہ ان کی ایسی تشریحات پیش کرتا ہے جو غرابت کا شکار اور لفظ کے لغوی مفہوم سے اتنی دور ہیں کہ اس سے زیادہ دوری کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر یہی دراج ابو الہیثم سے اور وہ ابو سعید سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرتے ہوئے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ: "ویل (جبکہ قرآن میں یہ لفظ متعدد بار آیا ہے) جہنم کی ایک وادی کا نام ہے جس میں کافر چالیس برس تک مسلسل گرتا چلا جائے گا، تب کہیں جا کر وہ اس کی تہ تک پہنچ پائے گا۔" یہ روایت احمد اور ترمذی نے نقل کی ہے۔

بلکہ ترمذی میں 'چالیس' کے بجائے 'ستر سال' سبعین خریفاً کے الفاظ ہیں۔ حالانکہ ہر شخص کو معلوم ہے لفظ 'ویل' ہلاکت و بربادی کے لئے بولا جاتا ہے۔ اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد ہمیشہ یہ لفظ اسی معنیٰ کے لئے مشہور و معروف چلا آتا ہے۔

اسی کے مانند وہ روایت بھی ہے جسے طبرانی اور بیہقی حضرت عبداللہ بن مسعود کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ کے اس قول فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا [1] کے سلسلے میں لفظ 'غی' کی تشریح میں نقل کرتے ہیں۔ کہ یہ 'جہنم کی ایک وادی کا نام ہے یا یہ کہ جہنم میں ایک دریا اسی نام سے موسوم ہے۔ (حالانکہ 'غی' کے معنی سرکشی کے معروف ہیں۔ اور آیت کریمہ کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ (کافر) اپنی سرکشی کے انجام سے دوچار ہوں گے)۔

اسی طرح بیہقی وغیرہ اللہ تعالیٰ کے اس قول وَجَعَلْنَا بَيْنَهُم مَّوْبِقًا [2] کے سلسلے میں حضرت انس کے واسطے سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ یہ 'خون اور پیپ کی ایک وادی کا نام ہے'۔ (جبکہ 'موبق' کے معنی صاف 'جائے ہلاکت' کے ہیں۔ روایت کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ (اور ہم ان کے بیچ ایک جائے ہلاکت لاکھڑی کریں گے)

اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب ابن ابی الدنیا کی روایت ہے جسے وہ شفی بن مانع کے واسطے سے نقل کرتے ہیں کہ جہنم میں ایک وادی ہے جس کا نام 'اثام' ہے۔ جو سانپ اور بچھوؤں سے بھری ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا [3] میں 'اثاماً' سے یہی وادی مراد ہے۔ (حالانکہ آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے گناہ کے انجام سے دوچار ہوں گے۔ 'اثام' کے معنی گناہ عربی زبان کا ہر طالب علم جانتا ہے)

[1] مریم : ۵۹ (مترجم)، [2] کہف : ۵۲ (مترجم)، [3] فرقان : ۶۸ (مترجم)

ہمارے محدثین کی طرف سے اس طرح کی روایتوں کو سند قبول عطا کرنے کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے حافظ منذری جیسے ناقد حدیث نے بھی ان تمام روایتوں کو اپنی 'ترغیب و ترہیب' میں جگہ دی ہے۔

۲۔ حدیث کے قابل قبول قرار دیئے جانے کے سلسلے میں دوسری شرط جس کا اضافہ

ہم ضروری خیال کرتے ہیں وہ یہ کہ کمزور حدیث اپنے سے صحیح تر احادیث سے ٹکراتی ہو اس کی مثال میں ان کمزور حدیثوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے سلسلے میں مروی ہیں کہ " وہ (دنیا میں اپنی مالداری کے سبب جنت میں گھٹنوں کے بل داخل ہوں گے "۔

اس طرح کی احادیث کے سلسلے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ کسی اصل شرعی سے ٹکراتی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ دین کے اس مسلّمہ اصول کے تحت ہیں کہ انسان کو مال کے فتنہ سے ڈر کر رہنا چاہئے اور بڑھی ہوئی مالداری اپنے ساتھ جو سرکشی اور نافرمانی لے کر آتی ہے اس کے پیش نظر اس سے دامن کشاں ہی رہنا مناسب ہے۔ لیکن یہاں صورت یہ ہے کہ مذکورہ حدیث ان بے شمار صحیح حدیثوں سے ٹکراتی ہے جن میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو عشرہ مبشرہ میں شامل قرار دیا گیا ہے۔ دیگر مستند واقعات اور وہ مشہور و مستفیض روایات مزید برآں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آں موصوف کا شمار اسلامی جماعت کے اعلیٰ ترین لوگوں میں سے تھا اور دینداری اور تقویٰ کے لحاظ سے وہ گنے چنے لوگوں میں شامل تھے۔ دراصل آپؓ کی ذات گرامی 'غنی شاکر' یعنی شکر و سپاس کے پیکر مالدار کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھی۔ (دین میں جس کے مرتبہ و مقام سے ہر شخص واقف ہے) حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے داعی اجل کو لبیک کہا در یں حالیکہ وہ آپ سے پوری طرح

البتہ ترمذی میں 'چالیس' کے بجائے 'ستر سال' سبعین خریفاً' کے الفاظ ہیں۔ حالانکہ ہر شخص کو معلوم ہے لفظ 'ویل' ہلاکت و بربادی کے لئے بولا جاتا ہے۔ اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد ہمیشہ سے یہ لفظ اس معنیٰ کے لئے مشہور و معروف چلا آتا ہے۔

اسی کے مانند وہ روایت بھی ہے جسے طبرانی اور بیہقی حضرت عبداللہ بن مسعود کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ کے اس قول 'فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيّاً'[1] کے سلسلے میں لفظ 'غی' کی تشریح میں نقل کرتے ہیں۔ کہ یہ جہنم کی ایک وادی کا نام ہے یا یہ کہ جہنم میں ایک دریا، اسی نام سے موسوم ہے۔ (حالانکہ 'غی' کے معنی سرکشی کے معروف ہیں۔ اور آیت کریمہ کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ (کافر) اپنی سرکشی کے انجام سے دوچار ہوں گے)۔

اسی طرح بیہقی وغیرہ اللہ تعالیٰ کے اس قول 'وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَوْبِقاً'[2] کے سلسلے میں حضرت انس کے واسطے سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ 'یہ خون اور پیپ کی ایک وادی کا نام ہے'۔ (جبکہ 'موبق' کے معنی صاف 'جائے ہلاکت' کے ہیں۔ روایت کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ: (اور ہم ان کے بیچ ایک جائے ہلاکت لا کھڑی کریں گے)

اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب ابن ابی الدنیا کی روایت ہے جسے وہ شفی بن مانع کے واسطے سے نقل کرتے ہیں کہ جہنم میں ایک وادی ہے جس کا نام 'اثام' ہے۔ جو سانپ اور بچھوؤں سے بھری ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول 'وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَاماً'[3] میں 'اثاماً' سے یہی وادی مراد ہے۔ (حالانکہ آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے گناہ کے انجام سے دوچار ہوں گے۔ 'اثام' کے معنی گناہ عربی زبان کا ہر طالب علم جانتا ہے)

---

[1] مریم : ۵۹ (مترجم)، [2] کہف : ۵۲ (مترجم)، [3] فرقان : ۶۸ (مترجم)

ہمارے محدثین کی طرف سے اس طرح کی روایتوں کو سند قبول عطا کرنے کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے حافظ منذری جیسے ناقد حدیث نے بھی ان تمام روایتوں کو اپنی 'ترغیب و ترہیب' میں جگہ دی ہے۔

۲۔ حدیث کے قابل قبول قرار دیئے جانے کے سلسلے میں دوسری شرط جس کا اضافہ ہم ضروری خیال کرتے ہیں وہ یہ کہ کمزور حدیث اپنے سے صحیح تر احادیث سے ٹکراتی ہو اس کی مثال میں ان کمزور حدیثوں کو پیش کیا جا سکتا ہے جو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے سلسلے میں مروی ہیں کہ "وہ (دنیا میں اپنی مالداری کے سبب جنت میں گھٹنوں کے بل داخل ہوں گے"۔

اس طرح کی احادیث کے سلسلے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ کسی اصل شرعی سے ٹکراتی نہیں ہیں۔ بلکہ یہ دین کے اس مسلمہ اصول کے تحت ہیں کہ انسان کو مال کے فتنہ سے ڈر کر رہنا چاہئے اور بڑھی ہوئی مالداری اپنے ساتھ جو سرکشی اور نافرمانی لے کر آتی ہے اس کے پیش نظر اس سے دامن کشاں ہی رہنا مناسب ہے۔ لیکن یہاں صورت یہ ہے کہ مذکورہ حدیث ان بے شمار صحیح حدیثوں سے ٹکراتی ہے جن میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو عشرہ مبشرہ میں شامل قرار دیا گیا ہے۔ دیگر مستند واقعات اور وہ مشہور و مستفیض روایات مزید برآں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آں موصوف کا شمار اسلامی جماعت کے اعلیٰ ترین لوگوں میں سے تھا اور دینداری اور تقویٰ کے لحاظ سے وہ گنے چنے لوگوں میں شامل تھے۔ دراصل آپؓ کی ذات گرامی 'غنی شاکر' یعنی شکر و سپاس کے پیکر مالدار کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھی۔ (دین میں جس کے مرتبہ و مقام سے ہر شخص واقف ہے) حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے داعی اجل کو لبیک کہا دریں حالیکہ وہ آپ سے پوری طرح

راضی اور خوش تھے۔ اسی طرح لسان حق ترجمان حضرت عمرؓ نے اپنے انتقال سے چند دن پہلے اگلے خلیفہ کے انتخاب کے لئے جن چھ حضرات پر مشتمل شوریٰ کمیٹی تشکیل دی تھی اس میں آپ کا نام نامی بھی شامل تھا۔ اس امتیازی حیثیت کے ساتھ کہ اگر جانبین سے رائیں مساوی ہوں تو ترجیحی ووٹ کا حق آں جناب کو حاصل ہوگا۔

اسی لئے حافظ منذری نے 'ترغیب وترہیب' میں کہا ہے کہ: اگرچہ مختلف طریقوں سے جس میں صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت بھی شامل ہے، یہ بات نقل کی گئی ہے کہ "حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ جنت میں گھٹنوں کے بل داخل ہوں گے اور اس کی وجہ (دنیا میں) ان کی بڑھی ہوئی مالداری ہوگی۔ موصوف فرماتے ہیں:" لیکن اس کا بہتر سے بہتر کوئی ایک بھی طریق روایت ایسا نہیں جس پر کچھ نہ کچھ کلام نہ ہو۔ اور ان مختلف طریقوں میں ایک بھی نہیں جو تنہا 'حسن' کے درجہ تک پہنچتا ہو۔ اگر وہ مالدار تھے تو ان کی یہ مالداری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا مصداق تھی کہ: نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ؛ (یعنی خدا ترس اور نیک طینت انسان کے لئے مال کیا ہی بہترین چیز ہے) پھر سوال یہ ہے کہ اس مالداری کے سبب آں جناب کے درجات آخرت میں کم کیوں ہوں؟ نیز یہ کہ اُمت کے تمام مالداروں میں صرف آں موصوف ہی کے ساتھ یہ روش اپنائے جانے کی کیا وجہ ہے جبکہ کسی اور مالدار کے سلسلے میں ہمیں اس طرح کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ البتہ یہ بات صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ اس امت کے فقراء اغنیاء کے مقابلے میں جنت میں پہلے داخل ہوں گے۔ لیکن یہ بات علی الاطلاق تمام مالداروں کے لئے ہے۔ کسی ایک شخص کے لئے اسے خاص کرلینا صحیح نہیں ہوسکتا ہے[1]

[1] الترغیب والترہیب ۵/۳۰۸ ۔ طبع السعادۃ

داعیان حق کے یہاں ضعیف اور موضوع روایات کس طرح راہ پالیتی ہیں؟

عام طور پر داعیان حق کے یہاں ضعیف اور غیر معتبر روایات اس لئے راہ پالیتی ہیں کہ ان کا تمامتر انحصار حدیث کے ان مجموعوں پر ہوتا ہے جن میں حدیثوں کی چھان پھٹک اور ان کی تحقیق وتفتیش کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا ہے۔ ان کا حال تو یہ ہے کہ اکثر وبیشتر ان میں اس کا بھی ذکر نہیں ہوتا کہ حدیث کی تخریج کس امام حدیث نے کی ہے۔ حالانکہ اگر یہ چیز معلوم بھی ہو جب بھی صرف اتنی سی بات کسی حدیث پر اعتماد کرنے کے لئے کافی نہیں ہوسکتی۔ اس لئے کہ اکثر مؤلفین حدیث نے اپنی کتابوں میں اس کا اہتمام نہیں کیا ہے کہ وہ صرف 'صحیح' اور 'حسن' حدیثیں ہی بیان کریں گے۔

چنانچہ ان میں سے بہت سے لوگوں کو آپ دیکھیں گے کہ وہ وعظ وتذکیر، تصوف اور تفسیر وغیرہ کی کتابوں سے بے تکلف حدیثیں نقل کرتے جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی حدیث کی صحت اور اس پر اعتماد کرنے کے لئے حدیث کے نام سے کسی کتاب میں صرف اس کے اندراج کو کافی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ کسی حدیث کے قابل اعتماد ہونے کے لئے کم سے کم یہ بات ہے کہ حدیث کے مقبول ہونے کا جو کمتر سے کمتر معیار ہے وہ اس پر پوری اترتی ہو، بہرحال جو لوگ (آج) وعظ وتذکیر کے مجموعوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کو میرا مشورہ ہے کہ وہ صرف ان کے اعتماد پر کبھی کسی حدیث کی روایت نہ کریں اس لئے کہ ان میں رطب ویابس ہر طرح کی روایتیں بھری پڑی ہیں۔ احادیث وآثار کا معاملہ ہو یا قصص وواقعات کا کسی چیز کے سلسلے میں ان کے اندر ادنیٰ درجے میں بھی تحقیق وتفتیش کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ دلیل صرف یہ ہے کہ ان سے کوئی حکم شرعی تو وابستہ نہیں ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ وعظ وتذکیر کے فن کی خاصیت ہی کچھ ایسی ہے۔ چنانچہ حدیث کے

عام مؤلفین کو چھوڑیئے جب ناقدین حدیث بھی اس موضوع کو ہاتھ لگاتے ہیں تو وہ بھی ڈھیل اور سہل انگاری کو راہ دیئے بغیر نہیں رہتے اور بسا اوقات تو بات اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اسے سوائے کوتاہی اور عدم توجہی کے کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔

یہاں تک کہ علامہ ابن جوزی جیسا ناقد حدیث بھی جس نے اس موضوع پر 'الموضوعات' اور 'العلل المتناہیہ' جیسی کتابیں لکھی ہیں لیکن یہی ابن جوزی جب وعظ و تذکیر کے میدان میں قدم رکھتے ہیں اور 'ذم الہویٰ' نامی کتاب تصنیف کرتے ہیں تو ان کے ناقدانہ تعقل پر واعظانہ جذبہ غالب آجاتا ہے۔ اور وہ بڑی حد تک سہل انگاری سے کام لینے لگتے ہیں۔ یہی حال حافظ ذہبی کا ہے کہ وہ اپنی واعظانہ تصنیف 'الکبائر' میں حدیثوں کے انتخاب کے سلسلے میں بالکل ڈھیلے نظر آتے ہیں۔

جو لوگ تفسیر کی کتابوں سے کسی حدیث کو نقل یا بیان کرنا چاہیں ان کو میرا مشورہ ہے کہ ابن کثیر کی طرف رجوع کریں۔ اس لئے کہ یہ مفسر کے ساتھ بلند پایہ حافظ حدیث بھی ہیں، اور روایتوں کے سلسلے میں نقد و جرح کا اہتمام کرتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب میں جو حدیث بھی نقل کرتے ہیں اس کے سلسلے میں بالعموم یہ رائے دیدیتے کہ یہ روایت قابل اعتماد ہے اور اس میں یہ ضعف پایا جاتا ہے۔

اسی طرح تصوف کی نمائندہ غزالیؒ کی 'احیاء العلوم' سے جو شخص کوئی روایت نقل یا بیان کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ حافظ عراقی نے اس کی حدیثوں کی جو تخریج کی ہے اس کی طرف رجوع کرے۔ یہ تخریج 'احیاء' کے ساتھ ہی چھپی ہوئی ہے جو شخص اصل کتاب کا مطالعہ کرنا چاہے اس کے لئے بھی اس تخریج کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے چہ جائیکہ وہ شخص جو اس سے کسی حدیث کو نقل یا بیان کرنا چاہے کہ اس کے لئے تو اس کی ضرورت بدرجہ اولیٰ ہے۔

اس کے بغیر کچھ پتہ نہیں چل سکتا کہ غزالی جو حدیث بیان کر رہے ہیں وہ کس پائے کی ہے۔

جو شخص حافظ منذری کی 'ترغیب و ترہیب' کے حوالہ سے کوئی حدیث بیان کرے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے مقدمہ کا ضرور مطالعہ کرے جس میں انھوں نے اپنی کتاب میں بیان کردہ حدیثوں کی نوعیت سے بحث کی ہے، اور ان اصطلاحوں کی وضاحت کی ہے جنھیں وہ کسی حدیث کے قوی یا ضعیف ہونے کے سلسلے میں استعمال کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ وہ قوی یا ضعیف ہے تو اس کا یہ قوت یا ضعف کس درجے کا ہے۔ تاکہ وہ بہت زیادہ کمزور حدیثوں کو نقل کرنے سے محفوظ رہے۔ مصنف کی اصطلاح سے واقف نہ ہونے کی صورت میں وہ کسی حدیث کے ساتھ صرف اس پر 'حسن' یا 'صحیح' لکھا ہوا دیکھ کر اسے بے کھٹکے بھروسے کے قابل تصور کرلے گا۔ حالانکہ مصنف کا منشا اس سے مختلف ہوتا ہے۔

اسی طرح جو شخص سیوطی کی 'جامع الصغیر' سے کوئی حدیث نقل یا بیان کرنا چاہے اس کے لئے میرا مشورہ ہے کہ اسے علامہ مناوی کی اس کی مطول شرح 'فیض القدیر' یا اس کے اختصار 'التیسیر' کی طرف ضرور مراجعت کرلینی چاہئے۔ سیوطی نے حدیثوں پر 'صحیح'، 'حسن' اور 'ضعیف' کے لئے 'ص'، 'ح'، اور 'ض' کی جو علامتیں بنادی ہیں صرف ان علامات پر اکتفا نہ کرے۔ اس لئے کہ نقل و طباعت کی اغلاط سے ان میں بڑا ہیر پھیر ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ 'جامع الصغیر' کی ان شرحوں کا اس لئے بھی دیکھنا ضروری ہے کہ شارح نے اصل کتاب پر جو گرفتیں کی ہیں اور ان کی جن خامیوں کی نشاندہی کی ہے ان سے فائدہ نہ اٹھانا یقیناً محرومی کی بات ہوگی۔ ہمارے زمانہ کے عظیم محدث علامہ محمد ناصر الدین البانی نے 'جامع الصغیر' اور اس پر مصنف کا بعد کا اضافہ جو 'الفتح الکبیر' کے نام سے، ان کی صحیح حدیثوں کو ضعیف حدیثوں سے چھانٹ کر الگ کرنے کا بیڑا اٹھایا، ان کی یہ عظیم کاوش کئی جلدوں میں

مطبوعہ صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے[1]۔ کوئی شک نہیں کہ موصوف نے اس کام
کا حق ادا کر کے خدمت حدیث کا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے، جس سے واقعہ یہ ہے کہ حدیث
کا کوئی طالب علم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ حدیث کی ایک دوسرے طرز کی کتابیں ہیں جن سے بھی بہر حال
استفادہ کیا جانا چاہئے۔ یہ اپنے فن کی بعض مشہور کتابوں کی احادیث کی تخریج ہیں جن کے
مصنفین نے اپنی روایت کردہ حدیثوں کی تخریج کا اہتمام خود نہیں کیا ہے۔ مثال کے طور پر
تفسیر کی مشہور کتاب 'الکشاف' کی حدیثوں کی تخریج حافظ ابن حجر کی طرف سے، تصوف کی
نمائندہ 'احیاء العلوم' کی روایت کردہ احادیث کی تخریج حافظ عراقی کی طرف سے یا کتب فقہ
مثلاً 'ہدایہ' کی احادیث کی تخریج حافظ زیلعی کی طرف سے[2] یا اسی طرح 'الاختیار' کی حدیثوں کی
کی تخریج جو علامہ محمد قاسم کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ یا مثلاً 'الرافعی الکبیر' کی حدیث پر نقد و نظر حافظ
ابن حجر کی طرف سے جس کا نام 'تلخیص الجبیر[3]' معروف ہے۔

---

[1] غالباً اس سے مصنف کا اشارہ علامہ موصوف کی 'سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ' اور سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ کی طرف ہے، جسے امت کے ہر طبقے میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا ہے اور جس سے اس میں شک نہیں کہ 'اسلامیات' کے میدان کا ایک بہت بڑا خلا پر ہوا ہے۔ (مترجم)

[2] حافظ ابن حجر کی 'الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ' بھی ہدایہ کی احادیث کی تخریج میں ہے۔ جو چار جلدوں میں ہدایہ کے ساتھ ہی مطبوعہ ہے۔ زیلعی کی تخریج کا نام 'نصب الرایہ لاحادیث الہدایہ' ہے۔ (مترجم)

[3] تلخیص الجبیر فی تخریج احادیث الرافعی الکبیر کا نیا ایڈیشن سید عبداللہ ہاشم یمانی مدنی کی تصحیح و تعلیق کے ساتھ اب ہمارے سامنے ہے۔ (مترجم)

اسی طرح حدیث کی ایک دوسری نوعیت کی کتابیں ہیں جن کا موضوع وہ مشہور
اور پھیلی ہوئی احادیث ہیں جو ہر شخص کی زبان زد ہیں، ان میں اس بات کی تفصیل
ہوتی ہے کہ حدیث کس امام کی تخریج کردہ ہے، نیز یہ کہ وہ 'صحیح' ہے یا 'حسن'، یا
کہیں 'ضعیف' اور 'موضوع' تو نہیں ہے۔ اس نوع کی کتابوں میں حافظ سخاوی
کی 'المقاصد الحسنۃ' سرفہرست ہے۔ یہی موضوع ابن دیبع شیبانی کی تمییز الطیب
من الخبیث فیما یدور علی السنۃ الناس من الحدیث، اور عجلونی کی کشف الخفاء و
مزیل الالباس، فیما اشتہر من الحدیث علی السنۃ الناس، کا بھی ہے، جیسا کہ ان
کے ناموں ہی سے ظاہر ہے۔ البتہ موخر الذکر زیادہ جامع اور موضوع پر حاوی ہے
اس کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے۔

ان کے علاوہ کتابوں کا ایک اور سلسلہ ہے جس سے حدیث کا کوئی طالب علم
بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ ہماری مراد کتب 'موضوعات' سے ہے۔ جن میں بے سروپا
اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب من گھڑت حدیثوں کا
پردہ چاک کیا گیا ہے۔ علامہ ابن جوزی کی 'الموضوعات'، اس سلسلے میں سرفہرست
ہے۔ اسی طرح علامہ سیوطی کی 'اللآلی المصنوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ'، نیز انہی کی
'تحذیر الخواص من اکاذیب القصاص'، علامہ ابن قیم کی 'المنار المنیف فی الصحیح
والضعیف'، ملا علی قاری کی 'الموضوعات الکبریٰ'، نیز انہی کی 'الموضوعات الصغریٰ'
جس کا دوسرا نام 'المصنوع فی معرفۃ الموضوع' بھی ہے۔ ابن عراق کی 'تنزیہ الشریعۃ
المرفوعۃ من الاحادیث الشنیعۃ الموضوعۃ'، شوکانی کی 'الفوائد المجموعۃ فی الاحادیث
الموضوعۃ'، علامہ عبدالحی لکھنوی کی 'الاسرار المرفوعۃ' اور محدث عصر

محمد ناصر الدین البانی کی ' الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ وأثرہا فی الامۃ' وغیرہ بھی اسی موضوع سے متعلق ہیں۔ حدیث کے ہر طالب علم کے لئے ان کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

فقہ اسلامی سے مناسبت

داعی کے لئے کسی حد تک فقہی ثقافت سے بھی واقفیت بہم پہنچانی ضروری ہے۔ عبادات و معاملات اسی طرح زندگی کے عام امور و آداب کے سلسلے میں اسے شریعت کے موٹے موٹے مسائل سے بہرحال واقف ہونا چاہئے اور جن کی واقفیت نہ ہو یا وہ مستحضر نہ ہوں تو اس کے اندر اس کی صلاحیت ہونی چاہئے کہ ان کے مراجع اور امکانی مآخذ (مظان) کی طرف رجوع کر کے متعلقہ احکام کو معلوم کر سکے۔ داعی کے لئے یہ چیز مختلف پہلوؤں سے اہمیت کی حامل ہے۔ پہلی چیز تو یہی کہ اس کے بغیر وہ حلال وحرام اسی طرح عبادات اور خاندان وغیرہ سے متعلق امور و مسائل کے سلسلے میں سوالات کرنے والوں کو متعین جواب دینے سے قاصر رہے گا۔ جبکہ یہ وہ مسائل ہیں جن کے سلسلے میں اکثر و بیشتر لوگوں کو سوال کرنے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ فطری طور پر ان کے تئیں شریعت کے فیصلے کو معلوم کے لئے وہ انہی ارباب دعوت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اب اس پہلو سے جس کی تیاری نہ ہوگی اس کے لئے خاموشی کے سوا چارہ نہ ہوگا یا پھر وہ بچ نکلنے کی راہ تلاش کرے گا۔ یہ چیز اس کی شخصیت کے وزن کو گھٹائے بغیر نہ رہے گی اور اس کا دائرہ اثر دن بدن سکڑتا جائے گا۔

اور اگر اس نے واقفیت کے بغیر فتویٰ صادر کر دیا تو پھر اس سے بڑی محرومی کا تو تصور نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ وہ چیز ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر اپنے اُمتیوں کو ڈرایا ہے۔ بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے جسے حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِنَّ اللهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنْ صُدُوْرِ النَّاسِ، وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ حَتّٰى إِذَا لَمْ يَبْقَ عَالِمٌ اتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُسًا جُهَّالًا، فَسُئِلُوْا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَأَضَلُّوْا۔

(اللہ تعالیٰ (دنیا سے) علم (دین) کو اس طرح نہیں اُٹھائے گا کہ اسے یکبارگی لوگوں کے سینوں سے کھینچ نکالے بلکہ وہ علماء کو اُٹھائے گا جس سے یہ علم خود بخود اُٹھ جائے گا یہاں تک کہ جب کوئی عالم باقی نہیں رہ جائے گا لوگ جاہل انسانوں کو اپنا مرجع قرار دے لیں گے۔ لوگ ان سے سوال کریں گے تو علم کے بغیر ہی وہ فتوے دیں گے۔ اس طرح وہ خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

دوسری بات یہ کہ جب تک احکام شریعت کی اس کی گہری واقفیت نہ ہوگی، سماج میں وہ اپنے سامنے جن خرابیوں کو دیکھے گا اور شریعت کے خلاف جو رجحانات اور سرگرمیاں اس کے سامنے آئیں گی وہ صحیح ڈھنگ سے ان کی اصلاح و درستگی کا فرض انجام نہ دے سکے گا۔ چنانچہ اگر وہ دیکھتا ہے کہ کچھ بدعتیں ہیں جو ہر جگہ پھیلی ہوئی ہیں کچھ برائیاں ہیں جو سماج میں فروغ پائے ہوئے ہیں اسی طرح بہت سی خرابیاں ہیں جو دین کے نام پر لوگوں میں قبول عام حاصل کئے ہوئے ہیں، تو ان سے کامیاب طور پر عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہوگا کہ اسے تفقہ فی الدین اور احکام شریعت کی گہری واقفیت حاصل

ہو۔ مجرد غیظ و غضب اور خالی خولی جذباتیت سے اس کا کام کسی طرح نہیں چل سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہوا کہ کسی برائی کو صرف اپنی سمجھ سے برائی سمجھ کر اس پر نکیر کرنے لگنا اس کے لئے جائز نہ ہوگا۔ اس سے پہلے اسے یہ دیکھنا ہوگا کہ کہیں ائمہ دین کے درمیان یہ مسئلہ اجتہادی تو نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں اسے برائی سمجھنے اور اس پر نکیر کرنے کا اسے حق حاصل نہ ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ مسئلہ اجتہادی ہونے کے باوجود اس پر نکیر نہ کرنے کی صورت میں کسی اور بڑی خرابی کے رونما ہونے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں البتہ اسے ایسا کرنے کا پورا پورا حق ہوگا۔ علامہ ابن قیمؒ نے اپنے شیخ علامہ ابن تیمیہؒ کا یہ خیال نقل کیا ہے کہ وہ اجتہادی مسائل میں نکیر کرنے کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ ہاں بعض صورتیں البتہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ پس یہ اصول ہمیشہ پیش نظر رکھنے کا ہے کہ کسی برائی کو صرف اپنی سمجھ سے برائی خیال کر کے اس پر علی الاطلاق نکیر نہ کی جائے۔ اس کی مثال میں ابن قیمؒ نے علامہ موصوف کا یہ مشہور واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کا گزر تاتاریوں کی ایک جماعت کے پاس سے ہوا جو بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ ان کے بعض ساتھیوں نے اس پر ان پر نکیر کرنی چاہی۔ آپ نے فرمایا: انھیں چھوڑو اور جس حال میں یہ پڑے ہیں اسی میں پڑے رہنے دو۔ اللہ نے شراب کو حرام قرار دیا ہے اس لئے کہ وہ انسان کو اللہ کے ذکر اور نماز سے روکنے کا سبب بنتی ہے، اور ان لوگوں کو یہ شراب لوگوں کا خون بہانے اور ان کا مال اسباب لوٹنے سے باز رکھے ہوئے ہے۔ (اللہ کے ذکر اور نماز کی طرف تو ان کے متوجہ ہونے کا سوال نہیں البتہ جہاں یہ ہوش میں آئے لوٹ مار سے باز نہیں رہیں گے۔ پس ان کا مدہوش پڑا رہنا ہی مصالح شریعت کا اقتضاء ہے۔ آپ نے دیکھا کہ کس طرح علامہ موصوف نے ایک کھلی ہوئی برائی کے سلسلے

میں مسئلہ کے اجتہادی پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس پر نکیر کرنے سے منع فرمایا) اسی طرح ہر داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اہم پر اہم تر کو ترجیح دے اور کلیات کو جزئیات اور فرائض کو نوافل کے مقابلے میں مقدم رکھے۔ (ظاہر ہے کہ یہ بات اس کے اندر احکام شریعت کی گہری واقفیت ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔)

تیسری بات یہ کہ اس کے بعد ہی وہ اس پوزیشن میں ہوگا کہ لوگوں کو اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے سلسلے میں پند و نصائح سے نوازنے کے ساتھ ان کے سامنے ان سے متعلق موٹے موٹے مسائل کی بروقت وضاحت کر سکے۔ چنانچہ اس صورت میں جب وہ ان کے سامنے زکوٰۃ، روزہ، حج یا اس طرح کے کسی بھی دوسرے مسئلے کے سلسلے میں گفتگو کرے گا تو اس کی گفتگو صرف ترغیب و ترہیب تک محدود نہ ہوگی کہ وہ ان کے فضائل اور ان سے کوتاہی پر جو وعیدیں ہیں ان کے بیان پر اکتفاء کرے، بلکہ ساتھ ہی اس کی خواہش ہوگی کہ اپنے سننے والے یا اگر وہ کوئی چیز لکھ رہا ہے تو اپنے پڑھنے والے کو ان سے متعلق اہم مسائل سے واقف کراتا چلے۔ بالکل ہلکے پھلکے انداز میں اس طور پر کہ انھیں کوئی بوجھ محسوس نہ ہو۔ اس طرح ان مسائل کے سلسلے میں لوگ بالکل دن کے اجالے میں ہوں گے اور الگ سے مشقت اٹھائے بغیر انھیں ان سے متعلق شریعت کے احکام کی واقفیت بہم پہنچتی رہے گی۔ کامیاب داعی وہی ہے جو لوگوں کو پند و نصائح سے نوازے تو دوسری طرف انھیں احکام شریعت سے بھی آگاہ کرتا چلے، اور ان کے درمیان توازن کو پوری طرح برقرار رکھے۔ اس طور پر کہ اس کی پند و نصیحت فقاہت پر غالب آئے اور نہ فقاہت، پند و نصیحت کا خون کر سکے۔ اس مقام پر ہم داعی کی توجہ چند امور کی طرف مبذول کرانی چاہتے ہیں۔

۱۔ پہلی چیز تو یہ کہ وہ جو حکم بھی بیان کرے، چاہئے کہ کتاب و سنت سے اس کے جو

دلائل ہوں ساتھ ہی انھیں بھی بیان کرتا چلے، اور اگر مسئلہ منصوص نہ ہو تو شریعت کے جو دوسرے ماخذ ہیں مثلاً اجماع، قیاس، استصلاح اور استحسان وغیرہ ان میں سے جس کے تحت وہ حکم آتا ہو اس کی وضاحت کر دے۔ اس لئے کہ فقہ کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ احکام شرعیہ کو ان کے تفصیلی دلائل کے ساتھ جاننے کا نام ہے۔ پس دلیل بیان کئے بغیر صرف مسئلہ بیان کر دینے کو 'فقہ' نہیں کہا جائے گا۔ یہ حقیقت اس پر مستزاد ہے کہ کسی مسئلہ کی وضاحت یا کوئی فتویٰ بیان کرنے کے ساتھ اگر اس کے دلائل بھی بیان کر دیئے جائیں تو اس میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ داعی کی یہ ضرورت احکامی حدیثوں کے مجموعوں اور ان کی شروح سے پوری ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ابن دقیق العید کی 'الاحکام'، شوکانی کی 'نیل الاوطار'، امام صغانی کی 'سبل السلام' اور نواب صدیق حسن خاں کی 'الروضۃ الندیۃ'، علامہ ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد ابن قیم وغیرہ کی کتابیں۔ ان کے علاوہ ہیں کہ شریعت کا کوئی بھی طالب علم ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی ذیل میں فقہ کی وہ کتابیں بھی آتی ہیں جن میں اپنے مسلک کے علاوہ دیگر ائمہ کے دلائل کا جائزہ، ایک دوسرے کی آپس میں ترجیح اور ان پر نقد و تبصرہ کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ابن قدامہ حنبلی کی 'المغنی'، امام نووی شافعی کی 'المجموع'، ابن عبد اللہ مالکی کی 'الاستذکار' اور ابن حزم ظاہری کی 'المحلیٰ' اور 'الروض النضیر' وغیرہ۔

۲۔ داعی اگر مقلد ہے اور کسی ایک فقہی مسلک کی پیروی کرنے والا ہے تو بھی یہ چیز اس کے لئے اس سے مانع نہ ہونی چاہئے کہ وہ اپنے مسلک کے دلائل معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ ایسا کر کے اس کے اپنے اطمینان قلب ہی میں اضافہ ہوگا۔ دوسری بات یہ کہ اسے تقلید جامد کی راہ نہیں اپنانی چاہئے۔ بلکہ اگر وہ کچھ مسائل کے سلسلے میں یہ

محسوس کرتا ہے کہ اس کے اپنے مسلک کے دلائل کمزور اور دوسرے مسلک کے دلائل قوی ہیں تو اپنے مسلک کو چھوڑ کر دوسرے مسلک کو اختیار کر لینے کے سلسلے میں اس کی مقلدیت کو آڑے نہیں آنا چاہئے۔ تمام ائمہ مسالک جن کی امت میں پیروی کی جارہی ہے اس مشترک خیال کے حامل ہیں کہ اگر ان کے مسلک کے برعکس کوئی صحیح حدیث سامنے آجائے تو وہی ان کا مسلک ہے۔ ان تمام حضرات سے ایک ہی قول منقول ہے کہ: "اذا صح الحدیث فھو مذہبی" (جب صحیح حدیث سامنے آجائے تو وہی میرا مسلک ہے)۔

داعی کے لئے صرف اس دلیل کی بنا پر کہ یہ اس کا مسلک نہیں ہے کسی صحیح اور صریح حدیث کو چھوڑنا درست نہ ہوگا۔ جیسا کہ ہم جمعہ کے بعض خطیب حضرات کو دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص مسجد میں داخل ہوا دریں حالیکہ وہ منبر پر بیٹھ چکے ہیں اور اس نے 'تحیۃ المسجد' کی دو رکعتیں پڑھنی چاہیں تو اسے فوراً منع کرتے اور بیٹھ جانے کا حکم دیدیتے ہیں (ایسا وہ صرف اپنے مسلک کی پیروی میں کرتے ہیں) ورنہ جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کا تعلق ہے تو صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ کی یہ روایت موجود ہے کہ: ایک دفعہ سلیک غطفانی جمعہ کے دن آئے اس حال میں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لئے منبر پر بیٹھ چکے تھے۔ سلیک 'تحیۃ المسجد' کی رکعتیں پڑھنے سے پہلے ہی بیٹھ گئے۔ اس پر آپ نے ان سے پوچھا: کیا تم نے (تحیۃ المسجد کی) دو رکعتیں پڑھ لیں؟۔ انھوں نے جواب دیا۔ نہیں۔ آپ نے فرمایا: اچھا اٹھو اور وہ دو رکعتیں پوری کرو۔ الحدیث[1]

۳۔ اسی طرح داعی کے لئے بہتر ہوگا کہ اسے اپنے مسلک کے علاوہ دوسرے مسالک سے بھی واقفیت ہو۔

[1] مختصر صحیح مسلم للمنذری حدیث ۴۱۸

خاص طور پر ان لوگوں کے مسالک سے جن کے درمیان وہ اپنے دعوتی فرائض انجام دے رہا ہے۔ مثال کے طور پر وہ مالکی مسلک کا پیرو ہے لیکن وہ جس ماحول میں رہ رہا ہے وہ حنبلی مسلک کے ماننے والوں کا ہے۔ یا اسی طرح مثلاً وہ حنبلی یا شافعی مسلک کا پیرو ہے لیکن وہ جس ماحول میں ہے وہ حنفی مسلک کے ماننے والوں کا ہے۔ یا اس کے برعکس صورت تو اسے چاہئے کہ وہ خاص خاص اور اہم مسائل جن میں اس کا عام باشندگان شہر سے اختلاف ہے ان سے وہ اچھی طرح واقف ہو تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ لوگوں کو اپنے مسلک کے مطابق کسی صورت پر عمل کرتے ہوئے دیکھے اور اسے اپنے مسلک سے مختلف پاکر 'منکر' خیال کرتے ہوئے انھیں اس پر ٹوکنا شروع کردے۔

اسے مثال سے یوں سمجھئے کہ ایک شافعی المسلک ہے جسے اب تک شافعی ماحول ہی میں رہنے کا اتفاق رہا ہے۔ اب اگر وہ کسی ایسے ماحول میں پہنچتا ہے جہاں مالکی مسلک پر عمل ہورہا ہو تو اسے یہ چیز بہت عجیب معلوم ہوگی کہ وہ لوگ ماکول اللحم جانوروں کے گوبر اور پیشاب سے طہارت کو ضروری خیال نہیں کرتے، یا مثلاً یہ کہ وہ نماز میں اپنا ہاتھ چھوڑے رہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو اس طرح کی صورت حال میں اگر وہ کچھ لب کشائی کرتا ہے تو ایسا کرنا اس کے لئے اسی وقت جائز ہوگا جبکہ وہ ان کے مسلک اور اس کے دلائل سے اچھی طرح واقف ہو۔

اسی طرح کی صورت حال اس حنفی المسلک کے لئے بھی پیش آسکتی ہے جو مثال کے طور پر کسی ایسی جگہ فروکش ہوتا ہے جہاں کے لوگ شافعی یا حنبلی مسلک کے ماننے والے ہیں۔ وہ دیکھے گا کہ لوگ رکوع میں جاتے اور اس سے سر کو اٹھاتے ہوئے رفع یدین کرتے ہیں۔ یا یہ کہ وہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی قرأت کرتے ہیں اور اس کے بعد آمین زور

سے کہتے ہیں یا مثلاً یہ کہ وہ امام کے دونوں طرف سلام پھیر لینے کے بعد خود سلام پھرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر اس کے علم میں یہ بات نہ ہوئی کہ یہی لوگوں کا مسلک ہے جس کے مطابق وہ عمل کر رہے ہیں تو وہ جھٹ اسے اپنے خیال کے مطابق 'منکر' تصور کرتے ہوئے اس پر ٹوکنا شروع کر دے گا۔

اس مقام پر ہر داعی کو میرا مشورہ ہے کہ اسے کم از کم فقہ کی ایک کتاب ایسی ضرور پڑھ لینی چاہئے جس میں معروف فقہی مسالک سے تقابلی طرز پر بحث کی گئی ہو۔ ابن رشد کی 'بدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد' اس مقصد کے لئے بہترین کتاب ہے۔

۴۔ اسی طرح داعی کو چاہئے کہ قرآن و سنت میں احکام کی جو علتیں بیان کی گئی ہیں وہ خود بھی ان کو نمایاں کرنے کی کوشش کرے۔ وہ لوگوں کو بتائے کہ ان میں سے ہر ہر حکم میں کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں اور نفس انسانی اور انسانی زندگی پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اور اسے اسلام کے عام فلسفۂ حیات سے مربوط کرنے کی کوشش کرے۔ اس طرح مخاطب کے لئے اس کی بات زیادہ سے زیادہ قابلِ قبول بن سکے گی۔

عام احکام کا کیا ذکر قرآن تو عبادات کے فوائد اور ان کے پیچھے کارفرما حکمتوں کے بیان کا بھی پورا اہتمام کرتا ہے۔ جبکہ ان کا معاملہ خالص تعبدی ہے کہ اسرار و علل سے بحث و کرید کئے بغیر صرف خدا کا حکم تصور کرتے ہوئے ان کی پیروی مقصود ہے۔ چنانچہ قرآن نماز کا حکم دیتا ہے تو ساتھ ہی اس کی حکمت بھی بیان کر دیتا ہے کہ نماز انسان کو 'برائی اور بے حیائی' کی باتوں سے روکتی ہے: وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ (عنکبوت: ۴۵) اسی طرح زکوٰۃ کے بیان میں وہ اس کی یہ علت واضح کر دیتا ہے کہ اس سے انسان کو پاکیزگی نصیب ہوتی اور اس کے باطن کا تزکیہ ہے: خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ

صَدَقَۃً تُطَھِّرُھُمْ وَتُزَکِّیْھِمْ بِھَا (توبہ: ۱۰۳)۔ یہی حال روزے کا ہے کہ قرآن اسے انسان کے لئے تقویٰ اور خوف خدا کے حصول کا ذریعہ قرار دیتا ہے: کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ: ۱۸۳)۔ اسی طرح حج کو قرآن کھلے لفظوں میں ہمہ جہتی فوائد کے حصول کا ذریعہ بتاتا ہے:

لِیَشْھَدُوْا مَنَافِعَ لَھُمْ وَیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ فِیْ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ (حج: ۲۸) تاکہ وہ اپنے لئے ہمہ جہتی فوائد کو پہنچیں اور اللہ کا نام پڑھیں متعین دنوں میں۔

پس عبادات جو خالص تعبدی امور ہیں، جب ان کے سلسلے میں قرآن ان کے اسرار و حکم اور ان سے حاصل ہونے والے فوائد کی نشاندہی ضروری خیال کرتا ہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے زندگی کے دوسرے معاملات و مسائل میں یہ چیز کس درجہ مطلوب نہ ہوگی؟ اس چیز کی ضرورت جیسا کہ ظاہر ہے، یوں تو ہر زمانے کے لئے ہے لیکن موجودہ زمانے میں خاص طور پر اس کا زیادہ خیال رکھنے اور اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ اکثر طبیعتیں ایسی ہی ہوگئی ہیں کہ اگر ان سے سیدھے سادے انداز میں احکام کی پیروی کے لئے کہا جائے تو بات ذرا ان کی سمجھ میں کم ہی آتی ہے، انھیں اطمینان اسی وقت ہوتا ہے جبکہ ان کے سامنے ان کے اسرار و حکم اور ان کے پیچھے کارفرما حکمتوں اور مصلحتوں کی اچھی اچھی طرح وضاحت کر دی جائے۔ مبارک ہیں وہ جنھیں زمانے کے اس رجحان کو سمجھنے اور مخاطب سے گفتگو کرتے ہوئے اس کے تقاضوں کی رعایت ملحوظ رکھنے کی توفیق نصیب ہو۔

احتیاط طلب امور | البتہ اس سلسلے میں بعض احتیاط طلب باتیں ہیں، جن کا دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔ دین کا کام کرنے والے بہت سے لوگ جن کی رعایت ملحوظ

رکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

۱۔ **عبادات کی مادی توجیہ اور ان کے دنیوی فوائد پیش کرنا** | پہلی چیز تو یہی کہ داعی کو چاہیئے کہ عبادات کی مادی توجیہ اور ان کے دنیوی فوائد کو بڑھا کر پیش کرنے سے اجتناب کرے اور محسوس فوائد کے ساتھ ان کا علت و معلول کا رشتہ قائم نہ کرے۔ اس لئے کہ عبادات کے سلسلے میں اصل چیز جو دھیان میں رکھنے کی ہے وہ یہ کہ دین میں عبادات بذات خود مطلوب و مقصود ہیں۔ بعض دوسرے مقاصد کے حصول کے وسائل و ذرائع نہیں۔ (جیسا کہ ان کے صرف مادی فوائد بیان کرنے سے مترشح ہوتا ہے) عبادات فی نفسہ مقصود ہیں قطع نظر ان دوسرے نتائج اور ثمرات کے جو ان پر مرتب ہوتے ہیں۔ قرآن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا مقصد وجود ہی حق تعالیٰ کی عبادت اور اس کی بندگی ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ.	میں نے جنوں اور انسانوں کو جو پیدا کیا تو اسی لئے
(ذاریات: ۵۶)	کہ وہ میری عبادت کریں۔

یہی نہیں بلکہ دوسری آیت سے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ آسمان و زمین غرضیکہ پوری کائنات کے پیدا کئے جانے کا یہی مقصود ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفات عالیہ کی معرفت حاصل کرے۔ چنانچہ فرمایا:

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ	اللہ ہی ہے جس نے سات آسمان بنائے
وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ	اور زمینیں بھی اتنی ہی۔ حکم الٰہی ان کے بیچ اترتا
بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ	ہے تاکہ تم کو پہچان ہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت
قَدِيرٌ وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ	رکھتا ہے اور اس کا علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے
عِلْمًا. (طلاق - ۱۲)	

اس کے بجائے اگر عبادت کے صرف دنیوی پہلو کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے تو بہت سے لوگوں کو یہ کہنے کا موقعہ ملتا ہے کہ جب عبادت کی غرض و غایت یہی ہے کہ ضمیر کی تربیت ہو جائے، نفس کا تزکیہ ہو اور لوگوں کے اخلاق و عادات درست ہو جائیں تو دوسرے ذرائع بھی ہو سکتے ہیں جن کے ذریعہ اس مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے کچھ دوسرے لوگ ہیں جو اس طرح کی باتیں کرنے لگتے ہیں جیسی کہ اس سے پہلے کے بہت سے فلاسفہ کرتے رہے ہیں (اور وہ یہ کہ اصل چیز عقل و شعور کی تربیت اور انسانی زندگی کی تنظیم ہے اور اس کے لئے فلسفہ کافی ہے، عقائد و عبادات کے چکر میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔)

احکام کی جامع ومانع علت | اسی طرح اس بات سے بھی بچنے کی ضرورت ہے کہ آدمی کسی حکم شرعی کی وہ علت بیان کرے جو جامع ومانع نہ ہو۔ جامع ومانع نہ ہونے کا مطلب یہ کہ تمام حالات میں مذکورہ حکم پر اس کا انطباق نہ ہو سکے اور دوسرے اس حکم پر بھی اس کا انطباق ہو جائے جس میں وہ علت موجود نہ ہو۔ جبکہ شریعت کا فیصلہ اس کے متعلق کچھ اور ہو۔

مثال کے طور پر سور کے گوشت کو حرام قرار دیئے جانے کی علت یہ بیان کرنا کہ وہ گندی چیزیں کھاتا ہے۔ اس پر ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ بات تو صرف ان سوروں کے لئے صادق آتی ہے جن کی غذا کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا اور جو اچھی بری ہر طرح کی چیزیں کھاتے رہتے ہیں۔ ان سوروں کا معاملہ اس سے مختلف ہونا چاہیئے جو خاص باڑوں میں پالے جاتے ہیں۔ اور جن کی نگرانی اور دیکھ بھال کے لئے باقاعدہ کچھ لوگ متعین ہوتے ہیں۔

جوان کی ہر طرح کی ضروریات کا اہتمام کرتے ہیں۔ پس سور کی حرمت کی یہ علت کہ وہ گندی چیزیں کھاتا ہے اس صورت کے لئے یہ چیز کس طرح کام دے سکتی ہے ؛

اسی طرح اگر مثال کے طور پر ایک شخص یہ کہتا ہے کہ سور کے گوشت کی حرمت اس لئے ہے کہ اس کے کھانے سے آدمی کے اندر بے غیرتی پیدا ہوتی ہے اور اس کا حیا کا مادّہ کم سے کم تر ہوتا جاتا ہے۔ جیسا کہ یورپ میں عیسائیوں کے یہاں اس حقیقت کا مشاہدہ بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بات اس سے کٹ جاتی ہے کہ اس صورت کے پیدا کرنے میں سور کے گوشت سے زیادہ وہاں کے مخصوص ماحول اور ناقص تربیت کا دخل ہے۔ اگر صرف سور کا گوشت کھانا اس کا سبب ہوتا تو مصر اور دوسرے مشرقی ممالک میں بھی عیسائی قوم آباد ہے (اور سور کا استعمال رکھتی ہے) لیکن یہاں اس کی بے عزتی اور جذبۂ حیا کی کمی کی وہ صورت نہیں ہے جو یورپ میں ہے۔

اس کے برعکس مغربی ممالک میں جو یہودی آباد ہیں تو باوجود اس کے کہ سور ان کے یہاں حرام ہے اور وہ اس کا شدت سے اہتمام بھی کرتے ہیں لیکن جہاں تک غیرت اور جذبۂ حیا کا سوال ہے تو جو حال ان کے ہموطن عیسائیوں کا ہے، اُن کا معاملہ بھی ان سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

اس کی ایک دوسری علت یہ بیان کی جاسکتی ہے کہ اس کے جسم کے اندر ایسے کیڑے پائے جاتے ہیں جو انسانی صحت کے لئے غیر معمولی طور پر مضرت رساں ہیں۔ اس کے جواب میں کوئی بھی شخص کہہ سکتا ہے کہ اس طرح کے کیڑے تو گائے اور بھینس وغیرہ کے گوشت میں بھی پائے جاتے ہیں جبکہ شریعت نے ان کے کھانے کو حلال قرار دیا ہے۔

اس لئے داعی کو چاہئے کہ اس طرح کے مسائل میں ایسی کمزور اور پھسپھسی علتیں بیان

نہ کرے جو بہت آسانی کے ساتھ تھوڑی دور ہی میں کٹ جائیں کسی حکم کی علت اسے وہ بیان کرنی چاہئے جو انتہائی مضبوط اور محکم ہو اور اس میں کسی قسم کا جھول نہ ہو۔ اور تمام حالات میں اس کا یکساں انطباق عمل میں آسکے۔ اسی صورت میں اسے واقعی معنوں میں علمی دلیل کا نام دیا جاسکے گا۔ اور کسی شخص کے لئے اس پر زبان طعن دراز کرنے کا موقعہ نہ رہے گا۔

بقیہ صورتوں میں داعی کو صاف کہہ دینا چاہئے کہ اللہ نے جس چیز کو حلال قرار دیا ہے وہ پاک (طیب) ہے اور جس چیز کو حرام بتایا ہے وہ ناپاک (خبیث) ہے۔ اس کا کوئی بھی فیصلہ حکمت و مصلحت سے خالی نہیں۔ انسان اس حکمت و مصلحت سے واقف بھی ہوسکتا ہے اور بہت سی صورتیں ایسی بھی ہوسکتی ہیں کہ اسے ان کا کچھ پتہ نہ چلے لیکن اس پتہ نہ چلنے کا یہ مطلب نہیں کہ خدانخواستہ وہ حکم حکمت و مصلحت سے خالی ہے۔ انسان کی کیا مجال ہے جو وہ اللہ کی قانون سازی اور مخلوقات میں جاری اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کا احاطہ کرسکے ؛

مذکورہ مسئلہ کے سلسلے میں ایک بات اور غور کرنے کی ہے اور وہ یہ کہ نزول قرآن کے آج چودہ سو سال بعد یہ چیز دریافت ہوئی ہے کہ سور کے گوشت میں خطرناک جرثومے پائے جاتے ہیں جبکہ جس وقت قرآن نازل ہوا تھا لوگوں کو اس کا کچھ پتہ نہ تھا، اور سور کے نجس اور ناپاک ہونے کا اس کا فیصلہ اُسی وقت کا ہے۔ کچھ آج کا نہیں۔ مستقبل میں سائنس اس کے سلسلے میں اور بھی بہت سی دریافتیں کرسکتی ہے (تو کیا ان سب کے اکٹھا ہونے تک قرآن کا یہ فیصلہ موقوف رہے گا ؟)

یہ جو اللہ تعالیٰ نے احکام شریعت کی بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں کو بندوں کی نگاہوں سے اوجھل رکھا ہے تو اس کی ایک حکمت بالکل نمایاں ہے۔ تاکہ انسان کی آزمائش کا مقصد پورا ہو اور یہ حقیقت نمایاں ہوجائے کہ کون ہے جو کسی تحفظ کے بغیر خالق کی بندگی کرنے

والا اس کے اور اس کے بتائے ہوئے احکام کی پیروی کرنے والا ہے۔ اس صورت میں یہ بات نکھر کر سامنے آجائے گی کہ کون اپنے رب کا مطیع فرمان ہے اور کس نے اپنی رگام عقل خطا کار کے حوالہ کردی ہے۔ دراصل یہ وہ مقام ہے جہاں سے ایک مومن اور ایک غیر مومن کی راہ بالکل الگ ہوجاتی ہے۔

مومن کا معاملہ تو یہ ہے کہ جب اسے معلوم ہوگیا کہ اللہ نے اس چیز کا حکم دیا ہے اور اس کام کے کرنے سے منع کیا ہے تو فوراً اس کی زبان پر یہ کلمات جاری ہوجاتے ہیں۔

سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۔ ہم نے سنا اور سرجھکا دیا، پروردگار! ہمیں تیری بخشش درکار ہے اور تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔ (بقرہ۔ ۲۸۵)

قطع نظر اس کے اس کی حکمت اس کی سمجھ میں آتی ہے یا نہیں۔ اور اس کی مصلحت کا پتہ اسے لگ پاتا ہے یا نہیں۔ اسے تو بس اس بات پر اطمینان ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے تو یہ چیز فائدہ سے خالی نہیں ہوسکتی، اور جب اس نے کسی چیز سے منع کیا ہے تو یقیناً اس کے اندر مضرت کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہوگا۔ ورنہ اگر وہ اپنا پیمانہ اسے بنائے کہ وہ صرف اسی حکم کے آگے سر تسلیم خم کرے گا جس کی حکمت و مصلحت پوری طرح اس کی سمجھ میں آگئی ہو تو پھر تو وہ اپنی سمجھ کا بندہ ہوگا۔ بندگی رب کا اس کا دعویٰ صحیح نہ ہوگا۔

البتہ جس کے اندر ایمان نہیں اس کے لئے یہ چیز کچھ مشکل نہیں کہ اس کے سامنے شریعت کا کوئی حکم رکھا جائے اور وہ اس کا صاف انکار کردے۔ اس لئے کہ اس نے بندگی رب اور رسول کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالا ہی نہیں۔ ایسا شخص تو دراصل خدا کے بالمقابل کھڑا ہوتا ہے اس کے لئے اس کے احکام کو ماننے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟

پس داعی کو چاہئے کہ شریعت کے کسی حکم کی حکمت و مصلحت بیان کرتے ہوئے اس پہلو کو لازماً مدنظر رکھے۔ کسی حکم کی علت و مصلحت کا بیان وہ اسی وقت کرے جب اس کے پاس کہنے کے لئے انتہائی محکم اور وزن دار بات موجود ہو۔ جس میں کسی طرف سے کسی قسم کا جھول نہ ہو۔ اس کے دلائل ایسے محکم ہوں کہ مخاطب کے لئے انہیں تسلیم کئے بغیر چارہ نہ رہے۔ ورنہ اس پر نہ جانے کس کس سمت سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہوگی اور وہ لاکھ چاہے گا اپنے کو ان سے بچانے میں کامیاب نہ ہوسکے گا۔ (ایک دوسری مثال سے یہ حقیقت واضح ہوجائے گی)۔

ایک داعی زنا کی برائی پر گفتگو کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ اسلام کی نظر میں یہ جتنا بڑا جرم ہے، اور اس نے جن متعدد اسباب کے پیش نظر اس کی ممانعت کی ہے اس سے ہر شخص واقف ہے لیکن وہ اس کی حرمت کی مصلحت صرف یہ بیان کرتا ہے کہ یہ چیز محض اختلاط نسب کو روکنے کے لئے ہے۔

اس کے جواب میں دوسرا فوراً یہ کہہ سکتا ہے کہ: تو پھر حاملہ عورت کے لئے زنا کے ارتکاب میں کوئی قباحت نہ ہونی چاہئے۔ اسی طرح بانجھ عورت اور وہ عورتیں جو مانع حمل ادویہ استعمال کرتی ہوں ان کے لئے بھی اس فعل بد کے ارتکاب میں کوئی رکاوٹ نہ ہونی چاہئے۔ اس لئے کہ ان میں سے کسی کے لئے بھی حاملہ ہونے اور صاحب اولاد بننے کا خطرہ نہیں ہے۔ جس کی بنا پر اختلاط نسب کے مسئلہ کے سر اٹھانے کا اندیشہ ہو۔ اسی طرح وہ عورت جو بے شوہر ہے، خواہ اس وجہ سے کہ وہ شادی شدہ ہو اور اس کا شوہر فوت ہوچکا ہو یا یہ کہ وہ کنواری ہو اور ابھی اس کی شادی ہی نہ ہوئی ہو، وہ تنہا ایک شخص کو اپنا آشنا بنا لیتی ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو وہ ہمبستری کا موقعہ

نہیں دیتی ہے۔ اب اگر اس کو اس سے حمل قرار پاتا ہے تو بالکل جانا پہچانا ہوگا۔ یہاں ناواقفیت کا کوئی پہلو نہیں ہے جس سے اختلاطِ نسب کا سوال پیدا ہوتا ہو۔ (اب سوال یہ ہے کہ کیا اس صورت میں کسی عورت کو اس کی چھوٹ دی جاسکتی ہے؟)

پس لوگوں کے سامنے اس طرح کی حکمتیں بیان کرنے سے سخت پرہیز کی ضرورت ہے۔ لوگوں کے سامنے اس ذیل میں کوئی بات کہی جائے تو اسی وقت جب کہ پہلے سے وہ خوب سمجھی بوجھی ہوئی ہو اور اس کی صداقت و حقانیت پر آدمی کو پوری طرح شرح صدر حاصل ہو۔ ورنہ اسے چاہئے کہ عمومی انداز میں اجمال کے طریقے پر عمل کرتے ہوئے ان حکمتوں اور مصلحتوں کی وضاحت کردے جیسا کہ عام طور پر قرآن میں اسی انداز کو اپنایا گیا ہے۔ چنانچہ زنا کا مسئلہ جس کے سلسلے میں ابھی گفتگو چل رہی تھی قرآن اس کی حکمت و مصلحت کے تئیں صرف اس اجمالی بیان پر اکتفا کرتا ہے:

اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَاءَ سَبِيْلًا ۔ (یہ کھلی بے حیائی اور بہت ہی برا راستہ ہے) (اسراء: ۳۲)

مصالحِ شریعت کی ناقص ترجمانی کا دوسرا مظاہرہ سود کے سلسلے میں دیکھنے میں آتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ شریعت نے سود کو اس لئے حرام قرار دیا ہے کہ اس میں مالداروں کی طرف سے غریبوں کے استحصال کی برائی پائی جاتی ہے۔ سرمایہ دار غریب طبقے کی احتیاج کا ناجائز فائدہ اٹھاکر اس کا خون چوستا اور اس سے اپنی تجوریاں بھرتا ہے۔

لیکن حرمت سود کی یہ علت اس کی ایک مخصوص صورت پر صادق آتی ہے۔

اگرچہ عام طور پر ہمیشہ سے اسی صورت کا زیادہ چلن رہا ہے اور آج کی ترقی یافتہ دنیا میں بھی اس کا رواج کم نہیں ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک غریب اور کمزور انسان جسے اپنے یا اپنے خاندان کے سلسلے میں کوئی سخت ضرورت پیش آتی ہے۔ اسے پورا کرنے کے لئے اس کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ وہ کہیں سے قرض اور ادھار لے کر اپنا کام چلائے۔ اس طرح کے مواقع پر عام طور پر آدمی کو بے رحم ساہوکار کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے جو ظاہر ہے اسی شرط پر اسے قرض دے سکتا ہے کہ وہ سود کی ایک اچھی شرح کے ساتھ اس کا قرض اسے واپس کرے گا۔ جسے وہ پیشگی طے کرا لیتا ہے اور جس کا باقاعدہ ریکارڈ اس کے پاس محفوظ ہوتا ہے۔

ظاہر ہے یہ سود کی ایک بہت مخصوص صورت ہے۔ دوسری بہت سی صورتیں ایسی ہوسکتی ہیں جہاں معاملے کی نوعیت یہ نہیں ہوتی ہے۔ آج بہت سے لوگ بینکوں اور اسی طرح کے دوسرے اداروں سے بڑے بڑے قرضے لیتے ہیں۔ یہ بالعموم سرمایہ دار اور بڑے تاجروں کا طبقہ ہوتا ہے جو یہ قرضے اس لئے لیتا ہے تاکہ اپنی تجارت کو بڑھائے اور زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرنے کی سبیل کرے۔ یہ لوگ ہزاروں بلکہ لاکھوں کروڑوں میں قرضے لیتے ہیں۔ اور تجارتی نقطۂ نظر سے بڑی بڑی عمارتیں بناتے ہیں یا پھر اندرون ملک یا باہر سے ایسے سامانوں کی خریداری کرتے ہیں جن سے زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی توقع ہو۔

اسی طرح محدود آمدنی والے لوگوں میں سے بہت سے لوگ اپنے اخراجات سے کچھ رقم بچاکر بینکوں میں جمع کرتے رہتے ہیں جس پر یہ بینک ان کی اصل رقم کے ساتھ انھیں سود کی ایک متعین شرح دیتے ہیں مثلاً پانچ فی صدی یا اس سے کم یا زیادہ وغیرہ۔

اس صورت میں سود کھانے والا ایک غریب اور کمزور آدمی ہے اور سود دینے والا یا دوسرے لفظوں میں سود کھلانے والا 'بینک' ہے جس کے پاس پیسے کی کمی نہیں ہے۔ اس کی مالی پوزیشن انتہائی مستحکم ہے اور وہ روزانہ لاکھوں کروڑوں کا معاملہ کرتا ہے۔

اس صورت حال کو دیکھ کر ہمارے زمانہ کے بہت سے نام نہاد فقہاء نے حرمت سود کو اس صورت کے ساتھ مخصوص قرار دیدیا جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔ اس لئے کہ ان کے خیال کے مطابق حرمت سود کی مذکورہ حکمت و مصلحت کی کارفرمائی اسی دائرے کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ لوگ صاف لفظوں میں کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں بینک سے ملنے والے فائدہ (Interest) پر سود (ربا) کا اطلاق نہیں ہوتا جسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ یہاں تو غریب طبقہ مالدار طبقے یعنی مالکان بینک سے فائدہ اٹھاتا ہے (جب کہ حرمت ربوا اس صورت کے لئے ہے جس میں مالدار غریب کا خون چوستا ہے۔)

معلوم ہوا کہ حرمت سود کی مذکورہ علت کافی وشافی نہیں۔ اس کی دوسری علت تلاش کرنے اور مسئلہ کی نئے سرے سے توجیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقعہ نہیں۔ اس موضوع سے متعلق کتابوں میں اس پر سیر حاصل بحثیں موجود ہیں تفصیل کے طالب ان کی طرف رجوع کریں[1]

---

[1] مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں ڈاکٹر محمد عبداللہ دراز، محمد ابو زہرہؒ اور سید قطب شہیدؒ وغیرہ کی تحریریں جو اسی موضوع سے متعلق ہیں۔ اسی طرح مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ڈاکٹر عیسیٰ عبدہ اور ڈاکٹر محمد ابوالسعود وغیرہ کی اس موضوع سے متعلق تصنیفات جن میں اس مسئلہ پر انتہائی سیر حاصل بحثیں کی گئی ہیں۔ اور اس کے مالہ وماعلیہ پر کھل کر داد تحقیق دی گئی ہے۔ (مصنف) اس ذیل میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری کی کتاب 'تجارتی سود تاریخی اور فقہی نقطۂ نظر سے' معرکتہ الآراء ہے۔ سود کے مسئلے کی تحقیق میں (بقیہ صفحہ ۱۹۷ پر)

صرف مادی فوائد اور دنیوی علتوں کے بیان پر اکتفاء سے پرہیز: احکام شریعت کی حکمتوں اور مصلحتوں کے بیان میں ایک دوسری چیز جس سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ آدمی ان کی صرف مادی اور محسوس علتوں کے بیان پر اکتفاء نہ کرے۔ خاص طور پر عبادات کے سلسلے میں جنھیں دینی شعائر ہونے کا مقام حاصل ہے۔ مثال کے طور پر وضو، نماز روزہ اور حج وغیرہ

بہت سے لوگ جو اسلام کے موضوع پر تقریریں کرتے اور کتابیں لکھتے ہیں ان کی نظر میں وضو کی حکمت صرف صفائی ستھرائی ہے۔ اسی طرح ان کے خیال میں نماز کی حکمت یہ ہے کہ اس سے جسمانی ورزش کی مشق بہم پہنچتی ہے اور ایک خاص طریقے پر اٹھنے بیٹھنے سے آدمی کے اندر نظم وضبط اور ڈسپلن کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ روزہ ان کی نظر میں اس لئے فرض کیا گیا ہے تاکہ سال کے اندر معدہ کو ایک مہینہ آرام کرنے کا موقعہ مل جائے۔ اسی طرح ان کے نزدیک حج ایک طرح کا تجرباتی سفر ہے جس کی بدولت آدمی کے اندر زندگی کے سفر میں مشقتوں اور دشواریوں کو انگیز کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو کچھ پتہ نہیں کہ دینی شعائر کی اس طرح کی حکمتیں بیان کر کے تنقید واعتراض کے لئے یہ ایک ایسا دروازہ کھول رہے ہیں جو کبھی بند ہونے کا نام نہیں لے گا۔

ایک شخص بہت آسانی سے کہہ سکتا ہے کہ میں وضو کے بغیر بھی صفائی ستھرائی کا اہتمام کر سکتا ہوں۔ دوسرا کہے گا کہ میں نماز کے بغیر بھی اپنے جسم کو محنت اور ورزش کا عادی بنا سکتا ہوں۔ اس کا تو ہر جگہ انتظام موجود ہے۔ باضابطہ اس کی تعلیم دی جاتی ہے اور ماہرین فن اس کی نگرانی کا فرض انجام دیتے ہیں۔ ایک تیسرا شخص بولے گا کہ میں تو روزہ کے بغیر بھی اپنے معدے کو آرام دے سکتا ہوں۔ اور چوتھا کہے گا کہ تجرباتی سفر میں حج کے بغیر بھی

بقیہ صفحہ ۱۹۶ سے آگے: خاص طور پر ربا اور انٹرسٹ کے سیاق میں، اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ (مترجم)

کرسکتا ہوں اور زندگی کے سفر میں آسانی کے ساتھ اپنے کو مشقت وصعوبت کا خوگر بنا سکتا ہوں۔ اس کے لئے حج ہی کیا ضروری ہے کہ ایک متعین زمانے میں ایک متعین مقام کے لئے رخت سفر باندھا جائے۔

اس طرح اگر موقعہ ومحل کی رعایت اور پوری باریک بینی اور بیدار مغزی کا ثبوت دیئے بغیر مصالح شریعت کی ناقص ترجمانی کی گئی تو مخالفین اسے اسلحہ کے طور پر استعمال کئے بغیر نہ رہیں گے۔ اور دین کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے راہ فرار اختیار کرنے کے لئے اسے بطور بہانہ استعمال کریں گے۔

ہمارے لئے اس سلسلے میں زیادہ مناسب یہ ہے کہ قرآن کے اختیار کردہ طریقہ کار کی پیروی کریں اور مصالح کے بیان میں عبادات کے دینی اور روحانی پہلو کو زیادہ ابھار کر پیش کریں۔ مثال کے طور پر نماز ہی کو لے لیجئے قرآن اس کی غرض وغایت اللہ کی یاد قرار دیتا ہے۔ فرمایا:

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ۔ (طٰہٰ - ۱۴)

اور نماز قائم کرو میری یاد کے لئے

دوسری جگہ ہے:

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ (عنکبوت - ۴۵)

نماز قائم کرو۔ بیشک نماز باز رکھتی ہے بے حیائی اور برے کاموں سے اور اللہ کی یاد (جو اس نماز سے اصل مقصود ہے) سب سے بڑی چیز بھی ہے

اس آیت میں بھی اللہ کی یاد ہی کو نماز کی اصل غرض وغایت بتایا گیا ہے۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ نماز میں اللہ کی یاد کا جو پہلو ہے وہ برائی اور بے حیائی کی باتوں سے باز رکھنے کی اس کی صلاحیت کے مقابلے میں زیادہ بلند اور عظیم الشان ہے۔

اسی طرح روزہ کے سلسلہ میں قرآن کہتا ہے:

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ۔ (بقرہ - ۱۸۳)

اے ایمان والو تم پر روزے فرض کئے گئے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تاکہ تمہارے اندر خدا کا خوف پیدا ہو۔

یہاں بھی روحانی مصلحت ہی کا پہلو مدنظر ہے۔ کسی دنیوی مصلحت کی طرف اشارہ کرنے کے بجائے روزہ کی غرض وغایت اور اس کا مقصد تقویٰ اور خوف خدا کا حصول بتایا گیا ہے۔

زکوٰۃ کے بیان میں بھی ہمیں اسی حقیقت کی جلوہ نمائی نظر آتی ہے۔ فرمایا:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِھِمْ صَدَقَۃً تُطَھِّرُھُمْ وَتُزَکِّیْھِمْ بِھَا وَصَلِّ عَلَیْھِمْ اِنَّ صَلٰوتَکَ سَکَنٌ لَّھُمْ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ۔ اَلَمْ یَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰہَ ھُوَ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ وَیَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ط (توبہ - ۱۰۳ - ۱۰۴)

اور ان کے مال سے زکوٰۃ لو کہ اس کے ذریعہ ان (کے باطن) کو پاکی ملے اور ان (کے دل) کی صفائی ہو، اور ان کے حق میں دعائیں کرو کہ تمہارا دعائیں کرنا ان کے لئے باعث تسکین ہے۔ اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ کیا انھیں پتہ نہیں کہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ذکاتیں لیتا ہے اور یہ کہ اللہ توبہ قبول کرنے والا، مہربان ہے۔

زکوٰۃ ایک مالی ذمہ داری ہے جس میں دنیوی مصلحت کس قدر نمایاں ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن اس کا کوئی حوالہ دئے بغیر صرف اس کے نفسیاتی اور روحانی پہلو کو نمایاں کر رہا ہے۔ فرمایا کہ اس کے ذریعہ انسان کا تزکیہ ہوتا اور

اسے پاکی نصیب ہوتی ہے۔ اس کی بدولت انسان رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا مستحق بنتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اسے قلبی طمانیت کی بے پایاں دولت نصیب ہوتی ہے، اور اس سے بڑھ کر روحانی مصلحت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے شرف قبولیت سے نوازتا اور اس کے بدلے انسانوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقَاتِ

اسی طرح حج کی مصلحت قرآن ان لفظوں میں بیان کرتا ہے:

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ۔ (حج - ۲۸)

اور لوگوں کے درمیان اعلان کر دو حج کا کہ وہ تمہارے پاس آئیں پیدل چل کر اور دبلے پتلے اونٹوں پر سوار ہو کر چلے آتے ہر طرف سے دور دراز راستوں سے تاکہ وہ پہنچیں اپنے لیے ہمہ جہتی فوائد کو اور اللہ کا نام پڑھیں متعین دنوں میں

آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن حج کو علی الاطلاق 'منافع' کے حصول کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ صرف مادی منافع مراد نہیں ہو سکتے ہیں۔ روحانی اور نفسیاتی منافع بھی اس کے اندر لازماً شامل ہوں گے (خاص طور پر اس صورت میں جبکہ آگے، یذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات' کے ذریعہ واضح طور پر اس کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حدیث کے اندر اس کا واحد مقصود 'یادِ الٰہی' قرار دے کر گویا صرف اس کے روحانی پہلو کے بیان پر اکتفاء فرمایا ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں:

اِنَّمَا جُعِلَ الطَّوَافُ بِالْبَيْتِ وَبَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ وَرَمْيُ الْجِمَارِ لِاِقَامَةِ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ [1]

خانہ کعبہ کا طواف، صفا و مروہ کے درمیان (سعی) اور رمی جمار (کنکریوں کا مارنا) ان تمام چیزوں کے شروع کیے جانے کا مقصد وحید اللہ کی یاد کا قائم کرنا ہے۔

حج کے اعمال میں قربانی کی ایک خاص اہمیت ہے۔ اس کے بیان میں بھی قرآن اس کے روحانی پہلو ہی کو ابھار کر پیش کرتا ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (حج - ۳۷)

اللہ تعالیٰ کو (قربانی کے) ان (جانوروں) کا گوشت اور ان کا خون نہیں پہنچتا بلکہ اس تک تمہارا 'تقویٰ' دل کا ڈر پہنچتا ہے۔ اسی طرح اس نے انھیں تمہارا مطیع فرمان بنایا ہے۔ تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو جیسا کہ اس نے تمہیں راہ بتائی ہے۔

(قرآن و حدیث کی ان تصریحات کے بعد بھلا کسی کے لئے کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ حج کی مصلحت کے بیان میں وہ صرف اس کے ایک محدود مادی فائدے کو بیان کرنے پر اکتفاء کرے؟)

یہ تو خیر عبادات کا معاملہ ہے، ان منہیات کے سلسلہ میں بھی جو سماجی اور معاشی دائروں سے متعلق ہوتی ہیں اور جن کے اندر دنیوی مصلحت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے بیان میں بھی قرآن ان کے دینی اور روحانی پہلو کو زیادہ ابھار کر پیش کرتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ مصلحت ہے جو تمام حالات

---

[1] رواہ ابوداؤد والحاکم وقال: صحیح علی شرط مسلم۔ البتہ کچھ لوگوں کو اس سے اختلاف ہے۔ ملاحظہ ہو: التیسیر للمناوی (مصنف)

پر یکساں صادق آتی ہے اور ہر ہر فرد براہ راست اس کا مخاطب بنتا ہے۔ اس کے لئے نہ کسی وقت اور زمانے کی قید ہے نہ کسی خاص ماحول اور کسی خاص صورت حال کی۔ مثال کے طور پر شراب کی ممانعت کرتے ہوئے قرآن اس کی یہ رُوحانی علت بیان کرتا ہے۔

رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ ۔ (یہ) گندا شیطانی کام ہے۔

(مائدہ ـ ۹۰)

آگے اس حکم کی کچھ مزید علتیں بیان کی جاتی ہیں، اور ان کے اندر بھی روحانی مصلحت ہی کا پہلو نمایاں ہے۔

إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ

شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ شراب اور جوئے میں ڈال کر تمہارے درمیان دشمنی اور پھوٹ کا بیج بو دے اور تم کو روک دے اللہ کی یاد سے اور نماز سے۔

(مائدہ ـ ۹۱)

شراب نوشی کے مضر اثرات انسان کے جسم اور اس کے ذہن و دماغ پر بھی پڑتے ہیں، اور یہ وہ حقیقت ہے جس سے ہر شخص واقف ہے لیکن آپ نے دیکھا کہ قرآن نے اس کی طرف کوئی اشارہ نہ کرتے ہوئے صرف اس کے روحانی نقصان کے پہلو کو ابھارا ہے کہ یہ ایک شیطانی عمل ہے جس سے انسانوں کے درمیان دشمنی اور پھوٹ پیدا ہوتی ہے، اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی وجہ سے آدمی اللہ کی یاد اور نماز سے غافل ہو جاتا ہے جبکہ یہی انسان کا اصل مقصد زندگی ہے۔ مذکورہ مادی علت کے سلسلے میں تو ایک شخص کہہ سکتا تھا کہ میری ذہنی اور جسمانی صحت پر اس کا کوئی

بُرا اثر پڑنے والا نہیں۔ میں ایک متعین مقدار میں پیتا ہوں اور اس کے سلسلے میں طبیب سے برابر مشورہ کرتا رہتا ہوں وغیرہ۔ البتہ قرآن کی بیان کردہ مذکورہ علت میں اس طرح کی کسی بہانہ بازی اور ٹال مٹول کی گنجائش نہیں۔

اسراف اور فضول خرچی بھی ایک بہت بڑی بیماری ہے۔ معاشی زندگی پر اس کے برے اثرات کو ہر شخص محسوس کرتا ہے لیکن قرآن اس کی برائی کے بیان میں بھی اسے خالص شیطانی عمل قرار دے کر اس کے روحانی پہلو کو ابھارنے ہی کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ فرمایا :

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا إِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ ، وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُوْرًا ۔ (اسراء: ۲۶، ۲۷)

اور فضول خرچی نہ کر بیشک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

دنیوی طور پر قتل اولاد کی شناعت پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن قرآن اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے :

إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيْرًا ۔ ان کا قتل کرنا بہت بڑی غلطی ہے۔

(ایضا ـ ۳۱)

بدکاری اور زنا کی دنیوی برائی بھی ہر آنکھ والے کے سامنے عیاں ہے لیکن جیسا کہ گذرا قرآن کی نظر میں اس کی شناعت اس لئے ہے کہ :

إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَاءَ سَبِيْلًا ۔ یہ کھلی ہوئی بے حیائی اور بہت برا راستہ ہے۔

(ایضا ـ ۳۲)

شرط بد کر کسی چیز کو بانٹنا کون ہے جو اس کی برائی کو محسوس نہ کر سکے عرب

میں پانسوں کے ذریعہ اس بنٹائی کا عام رواج تھا[1]۔ لیکن قرآن اس کی برائی کے سلسلے میں صرف یہ کہتا ہے:

ذٰلِکُمْ فِسْقٌ (مائدہ - ۳) یہ گناہ کا کام ہے۔

یتیموں کے مال کو حرام طریقے پر کھاجانے کے گھناؤنے پن کا اعتراف ایک دنیادار بھی کرنے کے لئے مجبور ہے۔ لیکن اس کے سلسلے میں قرآن کا بیان صرف اس قدر ہے:

اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا۔ (نساء - ۲) یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

پس دین کے اوامر ونواہی کی علتوں اور ان کی حکمتوں اور مصلحتوں کے بیان میں داعی کو قرآن کے اختیار کردہ اسی انداز کو اپنانے کی ضرورت ہے خاص طور پر اس صورت میں جبکہ اس کی گفتگو کسی مسلمان سے ہو رہی ہو۔ اسے اس کو صرف یہ بتانے پر اکتفاء کرنا چاہیے کہ اس کام کی انجام دہی خدا کی خوشنودی اور اس کے اجر وثواب کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اور اس کام سے دور رہ کر آدمی خدا کی ناراضگی اور اس کی سزا سے بچ سکتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن اہل ایمان کے سامنے بار بار صرف اسی حقیقت کا اعادہ کرتا ہے کہ یہ گندا کام ہے، اس میں برائی ہے، یہ غلط

[1] کفار عرب کے یہاں اس کا عام رواج تھا۔ مثال کے طور پر دس آدمی ایک جانور کو خرید کر ذبح کرتے۔ اب دس پانسے ہوتے کسی پر آدھا لکھا ہوتا کسی پر پاؤ کسی پر اس سے بھی کم یا زیادہ اور کوئی بالکل ہی خالی ہوتا۔ اب ہر ایک کے نام پر جو پانسا آتا وہی حصہ اس کو ملتا۔ یا بالکل خالی نکل جاتا۔ اسلام نے دیگر اور شرطوں کی طرح اس شرط بدنے کو بھی حرام قرار دیا۔ بحوالہ موضح القرآن۔ (مترجم)

ہے، یہ بڑا گناہ ہے، یہ کھلی ہوئی برائی اور برا راستہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

اصول فقہ سے واقفیت داعی کے لئے اصول فقہ سے بھی واقف ہونا ضروری ہے۔ اسے فقہ اسلامی کے مآخذ کے سلسلے میں تفصیلی معلومات ہونی چاہئیں۔ جن میں دو تو وہ ہیں جن پر پوری امت کا اتفاق ہے یعنی قرآن وسنت، دوسرے دو وہ ہیں جن پر جمہور علمائے امت کا اتفاق ہے اور وہ ہیں اجماع اور قیاس۔ البتہ قیاس کی کچھ باریک صورتیں ہیں جن کے سلسلے میں فقہائے امت کا باہم اختلاف ہو گیا ہے، جنھیں کچھ لوگ تسلیم ہیں لیکن بعض دوسرے ان کا انکار کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ان کے دائرے کو زیادہ وسیع قرار دیتے ہیں تو کچھ دوسرے ہیں جو انھیں نسبتہً تنگ رکھنا زیادہ مناسب خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح فقہائے امت کا ایک گروہ ہے جو اس سلسلے میں بیچ کی راہ اپنانے کا قائل ہے۔ قیاس کی انہی باریک صورتوں کو استحسان، استصلاح اور استصحاب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی طرح استنباط مسائل کی بعض دوسری صورتیں بھی ہیں جن کے سلسلے میں علماء امت کا باہم اختلاف ہے بمثال کے کے طور پر ہم سے پہلے قوموں کی شریعتوں کا جو حوالہ قرآن وحدیث وغیرہ میں پایا جاتا ہے دین میں اسے حجت مانا جائے یا نہیں؟ اسی طرح اگر کسی مسئلے میں کسی صحابی سے کوئی قول مروی ہے تو اپنی حجیت کے لحاظ سے دین میں اس کی کیا قیمت ہوگی؟ وغیرہ بے شمار دیگر مسائل جن کے سلسلے میں علمائے امت کا باہم اختلاف ہے اور مختلف لوگ مختلف نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔

پھر اسی میں یہ بحث بھی شامل ہے کہ کتاب وسنت جبکہ یہی شریعت کے اصل اور بنیادی مآخذ ہیں، ان سے مسائل کا استنباط کس طرح کیا جائے گا؟ کون لوگ اس

کے اہل قرار پائیں گے اور کون کس طرح کے لوگوں پر یہ چیز بطور ایک ذمہ داری کے عاید ہوگی؟ کس طرح کے لوگوں کے لئے تقلید ضروری ہے اور کون وہ لوگ ہیں جن کے لئے بجائے تقلید کے اجتہاد کی راہ اپنانا زیادہ مناسب ہوگا؟ وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال یہ باتیں تو ہم نے اشارۃً کہہ دیں ورنہ ان مسائل کی ایک لمبی فہرست ہے جن کے سلسلے میں علماء کی رائیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ داعی کے اندر یہ صلاحیت ہونی چاہئے کہ وہ یہ فیصلہ کر سکے کہ ان میں کونسی رائے راجح ہے کونسی مرجوح: تاکہ وہ راجح مسلک کو اختیار کر سکے اور اگر دوسرے مرجح مسلک کو اختیار کئے ہوئے ہوں تو انھیں ان کے حال پر چھوڑ دے۔ اور اگر ضرورت سمجھے تو ان کے سامنے اس کی وضاحت بھی کر دے۔

داعی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اس فن کی مطولات کا مطالعہ کرے، یہ کام ان لوگوں کا ہے جو اس فن میں اختصاص پیدا کرنا چاہیں۔ البتہ اس سلسلے کی کچھ کتابوں کا مطالعہ اسے ضرور کر لینا چاہئے تاکہ فی الجملہ اسے اس فن سے مناسبت پیدا ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے ابن قدامہ کی 'جنۃ الناظر' بہترین کتاب ہے۔ یا مثلاً علامہ شوکانی کی 'ارشاد الفحول' جو اپنے موضوع کا نسبتہً زیادہ وسعت کے ساتھ احاطہ کرتی ہے۔ حال کے لوگوں میں محمد خضری کی 'اصول الفقہ' اور محمد حسین خلاف کی 'علم اصول الفقہ' اس سلسلے کی بہترین چیزیں ہیں۔ خاص طور پر موخر الذکر جس کے انداز میں کافی نیاپن ہے۔ اور اس میں مسائل کو بہت کھول کر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن یہ مطالعہ نامکمل رہے گا جب تک کہ فقہ اسلامی کی مختصر تاریخ اور کن ادوار میں وہ کن مراحل سے ہو کر گذری ہے اس

کی کچھ حد تک تفصیل آدمی کے پیش نظر نہ ہو۔ دین کے داعی کو اس پہلو سے بھی اپنے کو تیار کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی اسے اس کا تفصیلی علم حاصل ہو سکے گا کہ مختلف مکاتب فقہ کن حالات میں وجود میں آئے اور بعد میں ان میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ان پر کیا کیا احوال طاری ہوئے۔ امت میں کس وقت تک اجتہاد اور قرآن و سنت سے براہِ راست مسائل کے استنباط کا رجحان رہا، اور کس وقت سے اور کن حالات میں اس کے اندر تقلید جامد کو قبول عام حاصل ہوا۔ اس مقصد کے شیخ محمد خضری کی 'تاریخ التشریع الاسلامی'[1] اور محمد حسین خلاف کی 'خلاصۃ تاریخ التشریع الاسلامی' کا مطالعہ کر لینا کافی رہے گا۔

علم العقائد کی واقفیت لیکن اس سے ہمارا یہ مقصد نہیں کہ آدمی توحید باری کے موضوع پر لکھی گئی متاخرین کی منظوم کتابوں اور ان کی شروح مثلاً 'الجوہرۃ' اور 'الخریدہ' وغیرہ کے مطالعہ میں اپنا وقت ضائع کرے۔ اسی طرح اس مقصد کے لئے ہم عقائد نفسی اور اس کی شروح و حواشی کے مطالعہ کو بھی ضروری خیال نہیں کرتے۔ اور نہ تو ہم اس فن کی مطولات کے مطالعہ کی سفارش کریں گے جن میں عقائد سے زیادہ فلسفیانہ مباحث بھرے پڑے ہیں مثلاً 'شرح مقاصد' اور 'شرح مواقف' وغیرہ۔ اس لیے کہ ان کتابوں کا جو انداز ہے اور ان میں جس طرح کی بحثیں کی گئی

---

[1] اس کا اردو ترجمہ مولانا عبدالسلام ندوی کے قلم سے 'تاریخ فقہ اسلامی' کے نام سے بہت پہلے دار المصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر مولانا محمد تقی امینی مدظلہ کی تصنیف 'فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر' کے ایک سے دو ایڈیشن ہندوستان و پاکستان سے شائع ہو چکے ہیں۔ (مترجم)

ہیں موجودہ زمانہ کے لئے ان کی چنداں ضرورت نہیں رہی، اور آج کا انسان جس انداز سے سوچتا ہے اس کے لئے یہ چیزیں تقریباً نامانوس سی ہوگئی ہیں۔ فلسفۂ جدیدہ نے حیات و کائنات اور زندگی کے دیگر بنیادی مسائل کے سلسلے میں جو بے شمار شکوک و شبہات پیدا کر دئے ہیں اور اس کے نتیجے میں لوگ جن فکری الجھنوں میں گرفتار ہیں، ہمارے پرانے علم العقائد سے اس کا تریاق فراہم ہونا مشکل ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس فن کی ضخیم مجلدات پر دماغ سوزی کرنے، ان کے مباحث کو ہضم کرنے اور ان کے مشکل مقامات کو حل کرنے پر اپنی قوتیں اور صلاحیتیں کھپانے کے بجائے موجودہ دور کے ذہن و مزاج کی رعایت کرتے ہوئے اسلامی عقائد کے دفاع اور ان کی حقانیت کو ثابت کرنے کی جد و جہد کی جائے۔ جدید فلسفہ اور جدید سائنس کی طرف سے اٹھائے گئے سوالات کی روشنی میں ایک نیا علم العقائد مرتب کیا جائے جس سے آج کے دور کے انسان کی تشفی ہو سکے۔

یہ حقیقت اس پر مستزاد ہے کہ مذکورہ کلامی مباحث خواہ وہ اپنے اندر کتنی ہی گہرائی کیوں نہ رکھتے ہوں اور ان پر آدمی اپنا ذہن کتنا ہی تھکائے اور ان کے تمام مسائل کا پوری طرح استقصاء کرے لیکن بہرحال اس کا حاصل ایک ایسے مجموعۂ عقائد کا دفاع ہوگا جو عملاً تشکیل پا کر ماضی کی تاریخ کا ایک جز بن چکا ہے۔

کلامی مباحث کا مقصود اسی سے متعلق شکوک و شبہات کی تردید ہوتا ہے۔ ان کے ذریعہ بجائے خود کسی ذہن و فکر کی تشکیل نہیں ہوتی ہے۔ کون نہیں

جانتا کہ ہمارا قدیم علم کلام یونانی فکر اور یونانی فلسفہ سے متاثر ہے۔ اور عقائد کے دفاع اور ان سے متعلق مسائل کے حل کے سلسلے میں اس کے اوپر یونانی رنگ کی چھاپ گہرے طور پر موجود ہے۔ (اس کے باوجود اسی فرسودہ علم کلام سے چمٹے رہنا اور اپنی ساری ذہنی کاوشیں اس کے پیچھے لگا دینا کون ہے جو اسے دانشمندی کا تقاضا قرار دے سکے۔)

قدیم علم کلام کے اسی طرح کے نقائص تھے جس کے سبب سلف صالحین میں بہت سے لوگ اس کے مخالف رہے، اور متکلمین کے طرز گفتگو اور ان کے انداز بحث پر انھیں ہمیشہ اعتراض رہا۔ بلکہ بہت سے لوگوں نے تو ان پر انتہائی سخت تنقیدیں بھی کی ہیں۔

اس لئے ہمارے خیال میں اسلامی عقائد کے مطالعہ کے سلسلے میں درج ذیل باتوں کا لحاظ کیا جانا ضروری ہے۔

۱۔ پہلی چیز تو یہ کہ عقائد کے اثبات کے سلسلے میں ہمارا مرجع و ماخذ تنہا قرآن و سنت کو ہونا چاہئے۔ اور مختلف ادوار میں اپنے زمانہ سے متاثر ہو کر اس کے اوپر جن اجنبی افکار و نظریات کی چھاپ پڑ گئی ہے اور جو لاطائل چیزیں اس کے ساتھ شامل ہو گئی ہیں اسے ہاتھ لگانے سے یکسر اجتناب کیا جانا چاہئے۔ اسی صورت میں اسلامی عقائد اپنی اصل روشنی کے ساتھ ہمارے سامنے آسکیں گے، اور کسی ایچ پیچ کے بغیر اور بالکل بے غبار انداز میں وہ لوگوں سے اپنی صداقت کا لوہا منوالیں گے۔ ایسا ہرگز نہ ہونا چاہئے کہ ہم کسی متعین کلامی مسلک کو اپنا اصل الاصول قرار دے لیں اور پھر قرآن و سنت کے نصوص کو اس کے پیچھے گھسیٹتے رہیں۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ ہمیں قرآن کی پیروی کرتے ہوئے انسان کے ذہن و دماغ کی طرح اس کے قلب اور وجدان کو بھی اپنا مخاطب بنانا چاہئے۔ اسی صورت میں صحیح اور حقیقی ایمان لوگوں کے دلوں جاگزیں ہوسکے گا یعقائد کی عمارت کو صرف عقل کی اساس پر استوار کرنا جیسا کہ فلاسفہ کا طریقہ ہے یا اس کی بنیاد محض انسان کے قلب پر رکھنا جیسا کہ صوفیاء کا انداز ہے، یہ دونوں ہی چیزیں صحیح اسلامی طرز و انداز کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ اسلام لوگوں کے دلوں میں ایمان کی آبیاری کرنے اور ان کے اندر دیگر حقائق کو جاگزیں کرنے کے سلسلے میں ہمہ جہتی انداز اختیار کرنے کا قائل ہے۔ وہ انسان کی عقل کو بھی مطمئن کرتا ہے اور اس کے قلب کو بھی ایک خاص کیفیت سے سرشار کرتا ہے جس کے نتیجے میں وہ صرف ذہنی طور پر کسی چیز کو چار و ناچار تسلیم کرلینے پر اکتفا نہیں کرتا جیسا کہ منطق و فلسفہ کی دنیا میں ہوتا ہے۔ بلکہ وہ انسان کے دل میں ایک طرح کی تڑپ پیدا کرکے اسے صدق و اخلاص کا پیکر اور اپنے مقصد کی راہ میں پہاڑ کی طرح جمنے والا بنا دیتا ہے۔ انسان فلسفیانہ تشکیک سے بلند ہوجاتا اور اس کے اندر مجاہد کی رُوح بیدار ہوجاتی ہے۔

۳۔ اس مہم کو سر کرنے کے لئے انہی دلائل سے کام لیا جائے جن کا ذکر قرآن کرتا ہے۔ جس طرح اس نے اپنے پیش کردہ عقائد کو لوگوں سے منوایا اور اپنے مخاطب کو پوری طرح مطمئن کیا۔ مخالفین کی اس نے ایک نہ چلنے دی اور ان کی طرف سے جو شکوک وشبہات اور جن بے بنیاد اتہامات کی بوچھاڑ کی گئی ان سب کو اس نے بالکل بے وزن اور بے اثر ثابت کر دکھایا۔ ہمیں بھی قرآن کی دکھائی ہوئی اسی راہ پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔ قرآن کے اس طرز استدلال کو لوگ قدیم سے لے کر آج تک نمایاں کرتے رہے ہیں۔

مثال کے طور پر قرآن نے خدا تعالیٰ کے وجود کے سلسلے میں جو دلائل دیئے ہیں بہت سے لوگوں نے بالکل بے آمیز طریقے پر قرآن کے طرز استدلال کی پیروی کرتے ہوئے وجود باری کے مسئلے کو حل کیا ہے۔ قدماء میں علامہ ابن رشد کی 'مناہج الادلۃ' اور حال کے لوگوں میں محمد عقاد کی 'اللہ' اور ندیم الجسر کی 'قصۃ الایمان' وغیرہ اسی سلسلے کی کامیاب کوششیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، قیامت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے اثبات وغیرہ کے سلسلے میں بھی اسی انداز سے قرآن کے پیش کردہ دلائل اور اس کے طرز استدلال کو نمایاں کرکے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن کے پیش کردہ یہ تمام دلائل عقلی اور برہانی ہیں اور اپنے اندر حق وصداقت کا لازوال خزانہ رکھتے ہیں۔ انھیں خطابی یا اقناعی کہنا جیسا کہ بہت سے متکلمین کا خیال ہے اس سے بڑھ کر ان کے ساتھ کسی بے انصافی کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ موجودہ دور کا انسان جن مسائل اور جن فکری الجھنوں سے دوچار ہے مسلمان متکلم کی اصل توجہ ان کے ازالہ کی طرف ہونا چاہئے۔ اس کی دلچسپی کا اصل محور براہِ راست اسلامی عقائد کی اہم دفعات ہونی چاہئیں۔ مثال کے طور پر وجود باری تعالیٰ، اس کی وحدانیت، زندگی بعد موت، قضا و قدر کے مسائل وغیرہ۔ جہاں تک ان مسائل کا تعلق ہے جو خاص طور پر تاریخ کے کسی دور میں اس فہرست میں شامل ہوگئے مثلاً خلق قرآن اور صفات باری تعالیٰ اور ذات باری سے ان کے تعلق کا مسئلہ کہ یہ عین ذات ہیں یا غیر ذات یا نہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات۔ 'لاعین ولاغیر' وغیرہ بے شمار مسائل۔ تو اب یہ چیزیں فکر اسلامی کی تاریخ کا ایک جزء بن چکی ہیں۔ اور انھیں اسی حیثیت سے پڑھا اور پڑھایا جانا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارا سارا وقت اسی داستانِ

پارینہ کی ورق گردانی میں لگ جائے اور عصر حاضر نے ہمارے سامنے جو فکری مسائل کھڑے کر دئے ہیں اور جنہیں حل کرنا ہماری اولین ذمہ داری ہونی چاہئے اس کے لئے ہمارے پاس کوئی وقت نہ رہے۔

۵۔ ہمارے دور میں تمدن کا قافلہ جو آگے بڑھا ہے اور اس کے نتیجے میں جو تحقیقات اور انکشافات سامنے آئے ہیں خاص طور پر خالص سائنس کے موضوعات میں مثلاً فلکیات، طب اور طبیعیات وغیرہ، ہمیں اسلامی عقائد کے اثبات اور ان کے تئیں اپنے موقف کو مضبوط کرنے کے سلسلے میں ان تحقیقات و انکشافات سے بھی لازماً استفادہ کرنا چاہئے۔ ہمارے زمانے میں اس سلسلے کی ایک سے زیادہ کامیاب کوششیں سامنے آئی ہیں جس میں مسلمان مفکرین اور ارباب قلم کے علاوہ غیر مسلم دانشور بھی شریک ہیں۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: ’العلم یدعو الی الایمان‘ ’اللہ یتجلی فی عصر العلم‘[1] ’قصۃ الایمان‘ ’اللہ والعلم الحدیث‘[2] اور ’الاسلام یتحدی‘ (علم جدید کا چیلنج) وغیرہ۔

۶۔ اس سلسلے میں ایک اور خاص بات جو پیش نظر رکھنے کی ہے وہ یہ کہ صفات باری کے سلسلے میں ہمیں اسی طریقے کو اپنانا چاہئے جو سلف صالح میں بڑی اکثریت

[1] ’العلم یدعو الی الایمان‘ امریکہ کی مجمع العلمی کے صدر کریس موریسون کی کتاب ‘Man does not stand alone’ کا عربی ترجمہ ہے۔ جیسا کہ مصنف محترم نے آگے ’علمی ثقافت‘ کے عنوان میں اس کی صراحت کی ہے۔ ’اللہ یتجلی فی عصر العلم‘ ممتاز اور چوٹی کے علمائے طبیعیات کی ایک بڑی جماعت کی قلمی کاوش کا نتیجہ ہے۔ ’اللہ والعلم الحدیث‘ اس کتاب کے مصنف ہیں عبدالرزاق نوفل۔ (مترجم)

کا مسلک رہا ہے یعنی کہ ہم اللہ تعالیٰ کی صفات کا بیان اسی طرح کریں جس طرح کہ اس نے خود اپنے کو ان صفات سے متصف فرمایا ہے یعنی اجمال کے طریقہ پر جس میں کسی کیفیت اور تمثیل کا شائبہ نہ ہو۔ نیز یہ بیان ایسا ہم آہنگ ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی صفت اپنے مقام سے ہٹنے نہ پائے۔ اس کے تعطل اور بے اثر ہونے کا تو خیر سوال ہی کیا ہوتا ہے۔ اشاعرہ اور ان کے علاوہ دوسرے مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے ہمارے چوٹی کے متکلمین اسلام کا یہی انداز رہا ہے۔ اشاعرہ کے سرخیل ابوالحسن اشعری نے اپنے رسالہ ’الابانۃ‘ اور امام غزالی نے اپنی شاہکار تصنیف ’الجام العوام عن علم الکلام‘ میں اسی طریقے کی پیروی کی ہے۔ اسی طرح امام رازی بھی ’اقسام اللذات‘ میں اسی مسلک کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: ”میں نے فلسفہ اور علم الکلام کے منہج وانداز پر بہت غور کیا لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اس سے کسی بیمار کو شفا ہوتی ہے نہ کسی پیاسے کی تشنگی رفع ہوتی ہے۔ مجھے تو سب سے عمدہ طریقہ قرآن کا نظر آتا ہے۔ ذات باری کے اثبات کے سلسلے میں اس آیت کو پڑھو: اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی (طٰہٰ: ۵) (رحمٰن جو عرش پر متمکن ہے) اور نفی ذات کے سلسلے میں اس آیت کو سامنے رکھو: لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (شوریٰ: ۱۱) اس کے مانند کوئی چیز نہیں۔ دیکھو کتنے دو ٹوک انداز میں ذات باری کی حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ جو شخص بھی میرے ساتھ اس تجربہ میں شریک ہوگا یہ حقیقت واشگاف انداز میں اس کے سامنے عیاں ہو جائے گی۔“

۷۔ آخری بات یہ کہ ہمیں مستشرقین اور اشتراکی مفکرین نیز ان کے علاوہ دیگر دشمنان اسلام اور ان کے شاگرد اور خوشہ چیں ہیں، ان کی طرف سے

اسلام کے سلسلے میں جو بھی شکوک و شبہات پیدا کئے جاتے اور پھیلائے جاتے ہیں ہمیں ان سے پوری طرح باخبر رہنے کی ضرورت ہے۔ اور پھر اسی معیار اور اسی انداز سے دورِ حاضر کے اسلوب اور اس کے مذاق کی پوری پوری رعایت کرتے ہوئے ان کا علمی اور فکری سطح پر جواب فراہم کیا جانا چاہئے۔

تصوّف | تصوّف اصلاً تو اس علم کا نام ہے جو اسلامی ثقافت کے باطنی اور اخلاقی پہلو کی نمائندگی کرتا ہے، اور اس کے اندر اسی سے متعلق مسائل سے بحث کی جاتی ہے۔

لیکن آج تصوف کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص اس حقیقت کے اعتراف کے لئے مجبور ہے کہ اس کے اندر اسلام کے پہلو بہ پہلو بہت سے اجنبی عناصر کی بھی آمیزش ہوگئی ہے۔ مسیحی، ہندی، عجمی اور یونانی ہر ایک کے کچھ نہ کچھ اثرات آج کے مروجہ تصوف میں شامل ہوگئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ تاریخ کے طویل عرصے میں ان کے علاوہ بھی بہت سے اجنبی افکار مختلف سمتوں سے اس میں در آئے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تصوف کی بعض ایسی قسمیں بھی رائج ہیں جو علانیہ طور پر حلول و اتحاد اور وحدۃ الوجود کی قائل ہیں[1]۔ بہت سے صوفی حضرات ہیں جنھوں نے نورِ محمدیؐ کے قدم (یعنی اس کے قدیم ہونے) پر بحثیں کی ہیں جسے وہ 'حقیقتِ محمدی' کا نام دیتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگوں نے منصبِ ولایت اور اولیاء، کشف و کرامات، مواجید و اذواق کے سلسلے میں ایسی باتیں کہی ہیں جن کا کسی بھی صورت سے اسلامی تعلیمات سے جوڑ

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر ابو الوفا تفتازانی کی کتاب 'مدخل الی التصوف الاسلامی' میں 'التصوف الفلسفی' کی بحث صفحہ ۲۲۷ اور اس سے آگے۔ (مصنف)

نہیں ملتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ قرآن و سنت کے صریح نصوص کے بالمقابل یہ لوگ انھی چیزوں کو فیصلہ کن قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک شریعت الگ ہے اور طریقت اور حقیقت الگ۔ پیر کا تصور ان کے نزدیک یہ ہے کہ مرید کو اس بات کی تربیت دی جانی چاہئے کہ وہ اپنے شیخ کے سامنے اسی طرح رہے جیسا کہ مردہ نہلانے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے[1]۔ اسی طرح زہد اور ترکِ دنیا کی لے ان کے یہاں ایسی تیز ہوتی کہ بات اسلام کے جادہ اعتدال سے نکل کر نصاریٰ کی ایجاد کردہ رہبانیت کے دائرہ میں داخل ہوگئی۔

غالباً اسی طرح کی چیزیں ہوں گی جو قرآن و سنت کے دلدادہ امت کے صحیح الفکر طبقے نے ہمیشہ تصوف کو شک کی نگاہوں سے دیکھا بلکہ بہت سے لوگوں نے تو اسے کھلے طور پر اسلام کا مخالف قرار دیا، اور اس کے فکری سرمائے اور اس کے علمبرداروں پر سخت تنقیدیں کیں۔ کچھ لوگوں نے تو آگے بڑھ کر یہ تک کہہ دیا کہ جب تک تصوف کو یک قلم قابلِ رد قرار نہیں دیا جائے گا اور امت بالکلیہ اس سے دستبردار نہ ہوگی اس وقت تک اس کی فلاح ممکن نہ ہو سکے گی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس کے اندر اسلامی اور غیر اسلامی عناصر کی آمیزش اس طور پر ہوگئی ہے کہ یہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ اس کا کونسا حصہ سنت کے موافق ہے اور کونسا بعد کا ایجاد کردہ ہے۔ اسی لئے جب تک اس کے پورے ذخیرے کو خیرباد نہیں کہا جائے گا امت کی گاڑی پٹری پر نہیں لگ سکے گی۔ ان کا کہنا تھا کہ آخری صدیوں میں امت کے اندر جن فکری بے اعتدالیوں اور کج رویوں نے جنم لیا اور اس کے نتیجے میں وہ میدانِ جہد و عمل میں جس طرح نکمی ثابت ہوئی، اس پورے سانحے کی ذمہ داری بڑی حد تک

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اس موضوع پر ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی کا تحقیقی مقالہ 'تصوف میں پیر کا تصور' مطبوعہ تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، شمارہ دوم اپریل تا جون ۸۲ء (مترجم)

اسی غیر اسلامی تصوف کے سر ہے۔ بہرحال یہ تو ایک تفصیل طلب بحث ہے۔ ذیل میں ہم اس سلسلے کی چند اہم باتوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

۱۔ پہلی چیز تو یہ کہ فلسفیانہ تصوف پورا کا پورا قابلِ رد ہے، اور اس کا مستحق کہ اسے جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ اگر ہم اس کا مطالعہ بھی کرنا چاہیں تو بس اسی غرض سے کہ ہم اس کی تردید کریں اور اس کی خرابیوں کو سامنے لائیں اور لوگوں کو بتائیں اس کے اپنانے سے کس طرح اسلام کی نفی لازم آتی ہے۔ فلسفیانہ تصوف سے ہماری مراد اس کا وہ حصہ ہے جو 'حلول' اور 'وحدۃ الوجود' کے باطل تصورات کی بنیاد پر قائم ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ تصوف کا ایک پہلو ایسا ہے جو ہمارے لئے بڑی قدر و قیمت کا حامل ہے اور اس کی طرف پوری توجہ دینے کی ضرورت ہے اور وہ ہے اس کا اخلاقی اور تربیتی پہلو اور دراصل یہی چیز ہے جسے تصوف کا خلاصہ اور اس کا جوہر کہنا چاہئے۔ چنانچہ علمائے اہلِ سنت میں سے بہت سے جلیل القدر ائمہ اس کے اس کردار کے قائل ہیں۔ علامہ ابن قیم 'مدارج السالکین' میں فرماتے ہیں: "اس فن کے تمام بڑے لوگوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ تصوف اخلاق ہی کا دوسرا نام ہے۔" کتانی نے یہی بات ان لفظوں میں کہی ہے: "تصوف اخلاق کا دوسرا نام ہے پس جو شخص تمہارے لئے اخلاق کے کسی خوشگوار باب کا اضافہ کرتا ہے تو سمجھو کہ اس نے تم کو تصوف کی ایک نئی راہ دکھادی"۔

۳۔ تیسری بات یہ کہ ہمیں تصوف کے اس حصے کو چھانٹ کر الگ کر لینا چاہیے جس سے ایک مسلمان کے عقیدے میں گہرائی پیدا ہوتی اور اس کے اخلاق کو

سنوارنے میں مدد ملتی ہے۔ البتہ جہاں کہیں ہمیں تردد ہو یا کوئی بات کھٹکتی نظر آئے تو اس سے فوراً ہاتھ اٹھا لینے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے صوفیا پر تنقید کے سلسلے میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ جس کی ایک نمایاں مثال علامہ ابن جوزی کی 'تلبیس ابلیس' ہے۔

بڑی بے انصافی ہوگی اگر ہم اس مقام پر اسی طرح کی تصوف کی اور بھی بہت سی خوبیوں کی نشاندہی نہ کرتے چلیں۔ اپنی ہزار خامیوں کے باوجود تصوف کا ہمارا موجودہ سرمایہ اپنے اندر ایسے انمول موتیوں کو سمیٹے ہوئے ہے کہ کوئی بھی مسلمان اس سے اپنے کو بے نیاز نہیں رکھ سکتا ہے:

۱۔ علمائے امت کے بیش قیمت اقوال، اسی طرح امت میں وہ ہستیاں جو زہد و ورع کا پیکر تھیں اور جن کے شب و روز خدا کی عبادت و ریاضت میں بسر ہوتے تھے، جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ خوفِ خدا کے سائے میں گذرتا اور جو دین میں فہم و بصیرت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، ان کے حکم اور مواعظ کا بڑا ذخیرہ ہمیں تصوف کے اسی سرمایہ میں مل سکتا ہے۔

۲۔ قرآنی آیات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے سمجھنے سمجھانے کے سلسلے میں تصوف کے اس سرمایہ میں ہمیں ایسے لطیف اور اثر انگیز اشارے ملتے ہیں جن سے آدمی کے اندر ایک طرح کا جذبہ اور تڑپ پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے کو شرحِ صدر کی کیفیت سے سرشار پاتا ہے۔ صوفیائے کرام کے علاوہ کہیں اور ہمیں ان لطیف اشارات کا سراغ نہیں ملتا۔

۳۔ ایک دوسرے پہلو سے بھی حضرات صوفیائے کرام کو ایک امتیاز حاصل ہے۔

اگر فقہائے عظام نے دین کے ظاہری احکام کو اپنی توجہات کا محور بنایا اور امت کے متکلمین نے عقلی انداز میں اسلامی عقائد کے دفاع میں اپنے کو سینہ سپر کیا تو ان حضرات صوفیاء کرام نے دین کے باطنی پہلو کی طرف توجہ کی، انھوں نے انسانی نفوس پر طاری ہونے والی آفات کا انتہائی گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا اور ایک ایک کرکے ان چور دروازوں کا پتہ لگایا جہاں سے شیطان کو در آنے کا موقعہ ملتا ہے۔ پھر اس سے بچاؤ کی انھوں نے تدبیریں نکالیں اور انسانوں کو لاحق ہونے والے ان باطنی امراض کا تریاق فراہم کیا۔ کوئی شک نہیں کہ اس خاص میدان میں ان کی جو مشقیں ہیں اور جو خاص تجربات اور معلومات ان کو حاصل ہیں، امت کے کسی دوسرے طبقہ کے یہاں یہ چیز ہمیں نہیں مل سکتی ۔

۴۔ اس کے علاوہ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ ان کے اقوال کو پڑھنے سے آدمی کے دل میں ایک طرح کی گرمی پیدا ہوتی اور روح کو بالیدگی نصیب ہوتی ہے، اور پڑھنے والا براہ راست اپنے کو ان کیفیات سے سرشار محسوس کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ان حضرات نے تزکیۂ نفس اور اصلاح باطن کے سلسلے میں جو ریاضتیں کی ہیں اور جن مجاہدات کی مشقیں جھیلی ہیں، ان کے اقوال کی یہ اثر انگیزی اسی کا نتیجہ اور کرشمہ ہے۔ یقیناً جو شخص خونِ جگر جلا کر اپنے اندر کوئی کیفیت پیدا کرتا ہے اس کی بات ہی اور ہے، وقتی طور پر ان کیفیات کو اپنے اوپر طاری کرکے آدمی اپنے اندر وہ بات پیدا نہیں کرسکتا ہے ۔

۵۔ دورِ اول کے صوفیائے کرام جنھوں نے تصوف کی بنیاد رکھی اور اس کے لائحۂ عمل کو متعین کیا، ان کی بھرپور کوشش تھی کہ اس کے اندر کوئی بات خلاف شرع

شامل نہ ہونے پائے۔ وہ اس سے کم کسی چیز پر تیار نہ تھے کہ تصوف کو بہرحال قرآن وسنت کا پابند ہونا چاہئے۔ چنانچہ سید الطائفہ جنید بغدادی کا مشہور قول ہے۔

من لم یقرأ القرآن و یکتب الحدیث لا یقتدی بہ فی ھٰذا الامر لان علمنا مقید بالکتاب والسنة ۔	جو قرآن نہ پڑھے اور حدیث نہ لکھے وہ ہمارے (تصوف کے) اس معاملے میں پیروی کے لائق نہ ہوگا۔ اس لئے کہ ہمارا یہ علم کتاب و سنت کا پابند ہے ۔

نیز انہی کا قول ہے :

مذھبنا مقید بالکتاب والسنة	ہمارا مسلک (تصوف) کتاب وسنت کا پابند ہے

اسی طرح ابوحفص دارانی، ابن ابی الحواری اور سری سقطی وغیرہ جیسے اساطین تصوف سے بھی اسی طرح کے اقوال مروی ہیں۔ جیسا کہ امام قشیری اور دوسرے لوگوں نے ان سے نقل کیا ہے[1]

۶۔ آخری بات یہ کہ بات صرف حلقہ صوفیا تک محدود نہیں سلف صالح میں بہت سے وہ لوگ بھی اس کے قدر دان نظر آتے ہیں جن کی زندگیاں قرآن وسنت کی وکالت میں گذریں اور جنھوں نے اپنی پوری زندگی میں ایک لمحہ کے لئے بھی ان کے دکھائے ہوئے راستے سے سرمو انحراف گوارہ نہیں کیا چنانچہ انھوں نے بھی تصوف کو اپنا موضوع بنایا اور اس سے متعلق کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں اگر انھوں نے اس کے ایک حصے پر تنقید کی اور اسے قابل رد قرار دیا۔ تو دوسرے حصے کی قدر وقیمت کا انھوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا اور

---

[1] ملاحظہ ہو: مدارج السالکین جلد ۲ صفحہ ۴۶۴ اور اس سے آگے۔ مطبعۃ السنۃ المحمدیہ۔

اسے اپنے سینے سے لگا یا ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ کے رسائل 'العبودیہ' 'التحفۃ العراقیہ فی الاعمال القلبیہ' اور 'رسالۃ الفقراء' وغیرہ کو دیکھ کر اس حقیقت کا اندازہ اچھی طرح لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر موصوف کی اور بھی بہت سی چھوٹی بڑی چیزیں بھی ہیں۔ جو ان کے مجموعۂ فتاوی کی نئی ترتیب میں دو ضخیم جلدوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ جن میں ایک کا عنوان 'التصوف' اور دوسرے کا 'السلوک' ہے۔ اسی طرح ان کے شاگرد رشید علامہ ابن قیمؒ نے بھی اس سلسلے کی بہت سی چیزیں یادگار چھوڑی ہیں۔ مثال کے طور پر 'طریق الہجرتین'، 'عدۃ الصابرین'، 'ذخیرۃ الشاکرین' اور 'الداء والدواء' وغیرہ۔ ان مختصر رسائل کے علاوہ اس موضوع پر ان کی ضخیم کتاب بھی ہے جو تین جلدوں میں ہے یعنی 'مدارج السالکین شرح منازل السائرین' جس کے اندر انھوں نے تصوف کو قرآن و سنت کی کسوٹی پر جانچنے اور پرکھنے کی انتہائی کامیاب کوشش کی ہے[۱]

اسلامی نظام زندگی کا مطالعہ اس سلسلے کی آخری چیز جس پر ایک داعی کو دھیان دینے اور اس کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے، وہ ہے 'اسلامی نظام زندگی' یا 'اسلامی طرز زندگی' کا گہرا مطالعہ اس طور پر کہ اس سلسلے کی ایک ایک چیز اس کے دل و دماغ میں پوری طرح اتر جائے اور اس کے نقوش اس کے ذہن و فکر پر گہرے طور پر مرتسم ہو جائیں۔

---

[۱] اسی سلسلے کی ایک اور کامیاب کوشش محترم مولانا سید احمد عروج قادری مدظلہٗ کی تازہ کتاب 'اسلامی تصوف' ہے۔ جو مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ یہ آمیز تصوف کے خدوخال دیکھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ (مترجم)

اسلامی نظام زندگی کا یہ مطالعہ بالکل خالص اور کھرے انداز میں ہونا چاہئے اس طور پر کہ اس میں کسی طرف سے کسی قسم کی آمیزش نہ ہو پھر یہ مطالعہ ایسا ہونا چاہئے کہ اس میں اسلام اپنی کامل اور ہم آہنگ صورت میں نمایاں ہوسکے اس کا کوئی حصہ چھوٹنے پائے نہ اس کے کسی حصے کے ساتھ حق تلفی ہونے پائے کہ اس کے ایک پہلو کو ابھار کر دوسرے کو دبا دیا گیا ہو۔ اسلام کی اس کاملیت کا مطلب ہے کہ وہ ایک مکمل نظام حیات ہے جو انسانی زندگی کے تمام دائروں سے متعلق خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی مادی ہوں یا معنوی اور روحانی، اصول و ضوابط عطا کرتا اور انسان کی کامل رہنمائی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اسلام کے اس کامل اور ہمہ جہتی مطالعہ کی کمی کو مجرد دینی علوم مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ اور عقائد وغیرہ کی تدریسی تعلیم سے پورا نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ ان کے مطالعہ سے فی الجملہ آدمی کی دینی معلومات میں تو اضافہ ہو جاتا ہے لیکن اس سے اسلام کا کا کوئی واضح اور مربوط نقشہ اس کی نگاہوں کے سامنے نہیں آپاتا ہے۔ یقیناً اس سے اسلامی نظام زندگی سے متعلق مختلف گوشوں کے سلسلے میں اسے معلومات حاصل ہو جاتی ہیں، لیکن ایک کو دوسرے سے ملا کر اسلام کی کوئی کامل اور ہم آہنگ تصویر اس کے سامنے آتی ہو، ایسا نہیں ہو پاتا ہے۔

اسلام کے صحیح، واقعی اور مبنی بر انصاف مطالعہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے سلسلے میں چند باتوں کا لحاظ کیا جائے، اور ان سے اجتناب کو لازم پکڑ لیا جائے۔

۱۔ اول یہ کہ اس میں کسی قسم کا اضافہ نہ ہونے پائے، نہ اس کے ساتھ کسی اور

چیز کا جوڑ ملا یا جائے۔ یہ اضافہ اور پیوند کاری گذشتہ مذاہب کے زیر اثر بھی ہو سکتی ہے۔ جس میں بت پرستی اور تحریف شدہ آسمانی مذاہب سبھی شامل ہیں۔ اور ان بے شمار فلسفہائے نظر، نظامہائے حیات اور مکاتب فکر و نظر کے زیر اثر بھی، جن کی نہ معلوم کتنی قسمیں اور کتنی شاخیں دور قدیم سے لیکر آج تک مشرق و مغرب میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُمت کے لئے دین اسلام کو بالکل مکمل فرما دیا ہے اور اس کے ذریعہ آخری طور پر اس پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے۔ جیسا کہ فرمایا :-

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ (مائدہ : ۳)	آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کر لیا)

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس میں اب کسی قسم کا اضافہ کیا جا سکتا ہے اور نہ تو اس کے کسی جزء کو اس سے نکال کر اس کے کمال کو داغ دار کرنا روا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں کسی قسم کے اضافے اور اس میں نئی بات پیدا کرنے سے سختی سے منع فرمایا ہے، اور اسے صاف لفظوں میں گمراہی سے تعبیر کیا ہے۔

۲۔ جس طرح اسلام پر کسی قسم کا اضافہ اور زیادتی کرنا صحیح نہیں، اسی طرح یہ بات درست نہیں کہ اس میں کسی قسم کی کمی کی جائے، اس کے کسی حصے کو نکال دیا جائے یا اس کے بعض اجزاء سے دستبردار ہو لیا جائے، دوسرے لفظوں میں یہ

کہ اس کے ایک حصہ کو تو لے لیا جائے اور ایک حصے کو چھوڑ دیا جائے، جیسا کہ بنی اسرائیل کے لوگوں نے اپنے دین کے ساتھ کیا کہ توراۃ کے ایک حصہ کو تو وہ مانتے تھے لیکن دوسرے کا انکار کرتے تھے۔ ہمارے اس زمانہ میں بھی بہت سے حلقوں کی طرف سے اس کی مسلسل کوششیں ہو رہی ہیں کہ کسی طرح سے اسلام کے حصے بخرے ہو جائیں اور اس کے بہت سے احکامات سے لوگ اپنی دستبرداری کا اعلان کر دیں۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ ہیں جو چاہتے ہیں کہ اسلام کو صرف ایک عقیدہ کی حیثیت سے مانا جائے، اس کی شریعت پر عمل کو ضروری قرار نہ دیا جائے۔ دوسرے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اسے صرف افراد کی نجی زندگی تک محدود ہونا چاہئے حکومت وسیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے۔ اسی طرح کچھ لوگ ہیں جن کا کہنا ہے کہ نماز تو ٹھیک ہے لیکن زکوٰۃ کی دفعہ کو ساقط کر دینا چاہئے۔ کچھ اور لوگ ہیں جنھیں اسلام کا شادی کا طریقہ تو پسند ہے لیکن طلاق کے اسلامی قوانین کی وہ تبدیلی چاہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ سیدھی بات یہ ہے کہ اسلام ایک اکائی ہے جس کے حصے بخرے کئے جا سکتے ہیں، نہ اس کے کسی جزء کو کسی حال میں معطل کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل ایمان سے قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اسلام میں پورے پورے کسی پیشگی شرائط اور کسی تحفظات کے بغیر داخل ہو جائیں کہ اس کے سوا تمام راستے شیطان کے نقش قدم کی پیروی ہیں :

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ اِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ (بقرہ: ۲۰۸)	اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ بیشک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

۳۔ اسی طرح یہ بات نامناسب ہے کہ عقائد وعبادات اور اخلاق ومعاملات وغیرہ سے متعلق اس کی تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کیا جائے۔ ان کی ایسی تشریح کی جائے کہ ان کی اصل حقیقت کچھ کی کچھ ہو جائے۔ اور بات بدل کر کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔ اس کا سبب کبھی تو ناواقفیت اور نادانی ہوتا ہے اور کبھی یہ چیز جان بوجھ کر نفسانیت اور اپنے من پسند طریقے کی پیروی کے جذبے سے کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر عقائد کے باب میں قضا وقدر کا مسئلہ، عبادات میں حج کا تصور اخلاق کے بحث میں زہد کا مسئلہ، اسی طرح خاندانی نظام کے سلسلے میں طلاق، تعددِ ازدواج اور نافرمانی کی صورت میں اپنی بیوی کے سلسلے میں شوہر کے حق تادیب وغیرہ کے مسائل یا مثلاً نظام اسلامی میں جہاد کا تصور اور تعزیرات کے باب میں حدود کا مسئلہ وغیرہ (جس میں چور کا ہاتھ کاٹنے اور زانی کو کوڑے لگانے اور اسے سنگسار کرنے جیسے مسائل شامل ہیں یہ اور اس طرح کے بے شمار مسائل ہیں جن کے سلسلے میں اغیار کے علاوہ اپنے بہت سے لوگ بھی اسلام کے بتائے ہوئے طریقے کے سلسلے میں شکوک وشبہات کا شکار ہیں۔ چنانچہ وہ ان مسائل کی وہ تعبیرات کرتے اور ان کی وہ توجیہات پیش کرتے ہیں جو اسلام کے لئے بالکل اجنبی ہیں اور جنھیں وہ اپنے حلق سے نیچے کسی بھی صورت میں آتارنے کے لئے تیار نہیں ہے۔)

۴۔ آخری چیز جس کا لحاظ رکھنے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اسلام نے اپنے نظام فکر وعمل میں جس اعتدال وتوازن کو ملحوظ رکھا ہے وہ متاثر نہ ہونے پائے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی چیز کو تو اس کی واقعی حیثیت سے بڑھا ہوا درجہ دیدیا جائے اور دوسری چیز کو اس کے جائز مقام سے بھی گھٹا کر پیش کیا جائے۔ ایک چیز جسے شریعت نے اپنی

ترتیب میں موخر رکھا ہے اسے مقدم قرار دیدیا جائے اور جسے وہ مقدم قرار دیتی ہے اسے موخر کر دیا جائے۔ اسلام کے خاکے میں ہر عمل کی ایک خاص قدر وقیمت ہے اور اس کی ہر تعلیم اپنا ایک خاص وزن رکھتی ہے، اس کے ہم آہنگ مطالعہ کا حق ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی قائم کی ہوئی اس ترتیب کو پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے۔ ایسا نہ ہو اس کے برعکس فروع کو اصول کا درجہ دیدیا جائے اور نوافل کو فرائض کے مقام پر لاکر کھڑا کیا جائے۔ یا مثلاً یہ کہ انسان کی قلبی کیفیات اور دین و ایمان کے پہلو سے اس کے دل کی جو حالت ہو اس کی طرف تو کوئی خاص توجہ نہ ہو، ساری توجہ ظاہری اعمال کی انجام دہی پر ہو اور انھیں کو سب کچھ تصور کر لیا جائے۔ اسی طرح خدا کے تقرب کے حصول کے لئے کچھ انفرادی نوعیت کے اعمال ہیں جن کا دائرہ افراد کی ذات تک محدود رہتا ہے، دوسری طرف عبادت کے کچھ ایسے طریقے ہیں جو اپنے اندر اجتماعیت کی شان رکھتے ہیں اور ان کا فائدہ انسانوں کی کثیر تعداد تک پہنچتا ہے، اب ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ سارا زور صرف انفرادی نوعیت کے اعمال پر ہو اور اجتماعی نوعیت کی عبادات کی طرف کوئی توجہ ہی باقی نہ رہے۔ خلاصہ یہ کہ نظام شریعت میں جس چیز کو جس مقام پر رکھا گیا ہے ہماری فکر اور ہماری عملی زندگی میں بھی اسے وہی مقام ملنا چاہئے کسی چیز کو اس کی اصل حیثیت سے گھٹایا جائے نہ اسے اس کے واقعی مقام سے بڑھ کر درجہ دیا جائے۔ ورنہ شریعت کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور اسلامی نظام فکر وعمل کی پوری ترتیب اُلٹ پلٹ ہو کر رہ جائے گی۔

بہر حال یہ چار چیزیں ہیں جن سے اسلامی نظام زندگی کا مطالعہ کرنے والا

اس سے متعلق اپنے حاصل مطالعہ کو پیش کرنے والے کے لئے، خواہ وہ تقریر کی صورت میں ہو یا تحریر کی، اپنے کو سختی سے بچانے کی ضرورت ہے۔ اسلام کے نظام فکر و عمل میں کوئی اضافہ ہو نہ اس میں کسی قسم کی کمی کی جائے، اس کی اصل صورت کو مسخ ہونے سے بچایا جائے، اور اس بات کی پوری کوشش کی جائے کہ اس نے اپنے یہاں فکر و عمل کا جو توازن قائم کیا ہے وہ کسی طرح متاثر نہ ہونے پائے۔ اس منفی پہلو کی وضاحت کے ساتھ اس کا مثبت پہلو خود بخود ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ یعنی یہ کہ اسلامی نظام زندگی کا مطالعہ کس طرح کیا جانا چاہئے، اور اس کے سلسلے میں کن امور کو پیش نظر رکھا جانا ضروری ہے۔ ذیل میں ہم انہی چیزوں کی نشاندہی کرتے ہیں،

۱۔ پہلی بات تو یہ کہ اسلام کا یہ مطالعہ بالکل خالص اور بے آمیز طریقے پر ہونا چاہئے۔ تاریخ کے طویل عرصے میں اس کے اندر جن غیر اسلامی عناصر کی آمیزش ہوگئی ہے اور جو لاطائل اور دور از کار چیزیں اس میں شامل ہوگئی ہیں ان سے یکسر دامن بچا کر چلنا چاہئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کے چشمہ صافی سے براہ راست اور کسی واسطہ کے بغیر سیراب ہوا جائے۔ اور اسلام کے اصل مآخذ یعنی قرآن و سنت کی طرف رجوع کیا جائے۔ دراصل یہی اسلام تھا جو حضرات صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کی زندگیوں میں جلوہ گر تھا۔ یہ اس کے بعد کا زمانہ ہے جبکہ امت میں طرح طرح کے فرقے وجود میں آئے۔ بدعتوں کا ظہور ہوا اور چہار سو فتنوں کا سیلاب امنڈنے لگا۔ جس نے اسلام کے چشمۂ صافی کو بہت کچھ گدلا کر کے رکھ دیا۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ اسلام کا یہ مطالعہ کامل اور ہمہ گیر نظام زندگی کی صورت

میں ہونا چاہئے۔ اس کے حصے بخرے کئے جائیں نہ اس کے کسی جزء کو الگ کیا جائے اور نہ تو اس کے کسی عنصر کو القط قرار دینے کی کوشش کی جائے۔ اس کے بجائے اسلامی نظام زندگی کو اس کے اصلی اور حقیقی رُوپ میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلام کے عقائد و افکار، اس کے شعائر اور عبادات اس کا نظام اخلاق و آداب نیز اس کے قانونی اور راداراتی شعبوں کی تفصیل خواہ اس کا تعلق اجتماعیات کے دائرے سے ہو یا سیاست و معیشت اور تہذیب و تمدن کے دائرے سے یا معاملہ اس کے پیش کردہ نظام حدود و تعزیرات کا ہو، ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلامی نظام زندگی کے ان تمام اجزاء کو کسی ترمیم و تنسیخ اور تغیر و تبدل کے بغیر بالکل بے لاگ انداز میں پیش کیا جائے۔ اور ساتھ ہی ان میں سے ہر جزء کا دوسرے سے کیا تعلق ہے اسے بھی واضح کرتے چلا جائے۔ ایک خدا کی بندگی اور اس کے سوا تمام چیزوں کا انکار یہی چیز اسلام کا اصل الاصول اور اس کا جوہر اور خلاصہ ہے، بات نامکمل رہے گی جب تک کہ اسلامی نظام زندگی کے مختلف اجزاء کو اس اصل الاصول کے ساتھ مربوط کر کے پیش نہ کیا جائے۔

۳۔ اس کے ساتھ ہی اس مطالعہ کا بے داغ اور نقص کے ہر شائبے سے پاک ہونا ضروری ہے۔ لوگوں نے جس طرح اس کے چہرے کو داغدار کر رکھا ہے، اپنی انتہاپسندی کے نتیجے میں اس کے اصل حقائق کو کچھ کا کچھ کر دیا ہے، باطل افکار و خیالات کی اس کے اندر آمیزش کر دی ہے اور اس کے سلسلے میں اپنی طرف سے

ایسی من مانی تاویلات و توجیہات کی ہیں جنھیں جہالت اور نادانی کا شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کو ان تمام کثافتوں سے پاک و صاف کر کے پیش کیا جائے، لیکن یہ کام بھی اسی صورت میں انجام پا سکتا ہے جبکہ اسلام کو اس کے اصل مآخذ کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی اہتمام کرنے کی ضرورت ہے کہ جو بات کہی جائے دلائل کے ساتھ کہی جائے اور اس انداز سے کہی جائے کہ شریعت کا منشا بالکل نکھر کر سامنے آجائے، اور اسلام اپنے تمام امتیازات اور خصوصیات کے ساتھ نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو سکے۔ انسان کا اللہ کی ذات سے ربط و تعلق، بندگان خدا کے حقوق کی ادائگی، اسلام کی جامعیت، اس کا اعتدال و توازن اور اس کی عملیت وغیرہ بے شمار گوشے ہیں، اسلامی نظام زندگی کے ان تمام پہلوؤں کی بے لاگ ترجمانی کی ضرورت ہے۔

۴۔ آخری بات یہ کہ اس مطالعہ کو پورے طور متوازن اور ہم آہنگ ہونا چاہیے جس میں اس کے ہر جزء کو اس کے اصل مقام پر رکھا گیا ہو، ہر چیز کا منشا اور مفہوم بالکل واضح اور نکھری ہوئی صورت میں موجود ہو۔ اس کی جملہ تعلیمات کی ایک ترتیب قائم ہو اور اس بات کا پورا لحاظ رکھا جائے کہ یہ ترتیب کہیں ٹوٹنے نہ پائے شریعت میں جو چیز جس اہمیت کی حامل ہے اسے اہمیت کے اسی مقام پر رکھا جائے۔ نہ اس کے مرتبے کو اس سے بڑھایا جائے اور نہ اس کے درجے کو گھٹا کر پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ عقائد کو اعمال پر فوقیت حاصل ہے اسی طرح عبادات کا معاملہ معاملات پر مقدم ہے۔ نوافل کے بالمقابل فرائض زیادہ اہمیت کے حامل ہیں اور صغائر کے مقابلہ میں کبائر سے اجتناب کا زیادہ اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔

اسی طرح دین میں کچھ چیزیں وجوب کا درجہ رکھتی ہیں اور کچھ سنن و مستحباب ہیں، ایسا نہ ہو کہ سنن و مستحبات کی ادائیگی کی فکر تو اسے ہر وقت دامن گیر رہے لیکن فرائض و واجبات کی اسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔

اسلامی نظام زندگی کے اس ہم آہنگ مطالعہ کا حق ادا کرنے کے لئے ہمارے اپنے زمانہ کے اسلامی مفکرین کی کتابوں کا مطالعہ خاص طور پر کرنا ضروری ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ عالم اسلام کا کوئی گوشہ ان سے خالی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ان کی وہ کتابیں خصوصی توجہ کی مستحق ہیں جن میں اسلامی نظام زندگی کے بنیادی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ استقصار مقصود نہیں ذیل میں ہم صرف مثال کے لئے اس طرح کی منتخب کتابوں کی ایک فہرست پیش کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا معصوم کوئی نہیں اس لئے ہر شخص کی ہر بات سے اتفاق ضروری نہیں، لیکن بہر حال اس چیز کو اخذ و استفادہ کی راہ میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔

اسلام کے بنیادی عقائد و افکار سے متعلق کتابیں:

مبادی الاسلام (رسالہ دینیات) (ابوالاعلیٰ مودودیؒ)، العقائد الاسلامیہ (حسن البناءؒ)، خصائص التصور الاسلامی ومقوماتہ (سید قطبؒ)، قصۃ الایمان بین العلم والفلسفۃ والقرآن (ندیم الجسر)، نظام الاسلام: العقیدۃ والعبادۃ (محمد المبارک)، الاسلام یتحدی (علم جدید کا چیلنج) (وحید الدین خاں)، اللہ جل جلالہ (سعید حوی)، الرسول صلی اللہ علیہ وسلم (سعید حوی)، حقائق الاسلام واباطیل خصومہ (عباس العقاد)، عقیدۃ المسلم (عقیدہ اسلامی ایک آفتاب الخ) (محمد الغزالی)، الایمان والحیاۃ (ایمان اور زندگی) (یوسف القرضاوی) (بقیہ صفحہ ۲۳۰ پر)

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی (ابوالاعلیٰ مودودیؒ)، خطبات (ابوالاعلیٰ مودودیؒ)، خدا اور رسول کا تصور اسلامی تعلمات میں (جلال الدین عمریؒ)، معروف ومنکر (جلال الدین عمریؒ)، اساس دین کی تعمیر (صدر الدین اصلاحیؒ)، سیرۃ النبی جلد چہارم (سید سلیمان ندویؒ)۔

عبادات کے باب میں:

اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر (مع خطبات حرم) (ابوالاعلیٰ مودودیؒ)، الارکان الاربعہ (ارکان اربعہ) (ابوالحسن علی ندوی)، العبادۃ فی الاسلام (یوسف القرضاوی)، سیرۃ النبی جلد پنجم (سید سلیمان ندویؒ)۔

اسلام کے تصور اخلاق کی نمائندہ کتابیں:

اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر (ابوالاعلیٰ مودودیؒ)، ربانیہ لا رہبانیہ (ابوالحسن علی ندوی)، خلق المسلم[1] (محمد الغزالی)، دستور الاخلاق فی القرآن (محمد عبداللہ دراز)، سیرۃ النبی جلد ششم (سید سلیمان ندویؒ)۔

(صفحہ ۲۲۹ سے آگے) لہ 'عقیدہ اسلامی' اور 'ایمان اور زندگی' یہ دونوں اردو ترجمے ہندوستان میں شائع ہو چکے ہیں۔ اول الذکر عنایت اللہ سبحانی اور دوسرا مرحوم عبد الحمید صدیقی کے قلم سے ہے۔ (مترجم)۔ لہ اس کا اردو ترجمہ 'اسلامی کردار' کے نام سے ہندوستان پبلیکیشنز دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔ (مترجم)

کتابیں جو اسلامی نظام زندگی اور اس کے مختلف اجزا کی تفصیل پیش کرتی ہیں

العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام (اسلام میں عدل اجتماعی) (سید قطبؒ)، خطوط رئیسیۃ فی الاقتصاد الاسلامی (محمد ابو السعود)، منہاج الاسلام فی الحکم (محمد اسد)، نظام الاقتصاد (محمد المبارک)، الحکم والدولۃ (محمد المبارک)، الاقتصاد الاسلامی۔ مدخل ومنہاج (عیسیٰ عبدہ ابراہیم)، الفکر الاسلامی المعاصر (الحکم والمجتمع) (دکتور محمد البہی)، الفکر الاسلامی المعاصر (الأسرۃ والتکافل) (دکتور محمد البہی)، الاسلام والاوضاع الاقتصادیۃ (محمد الغزالی)، الاسلام المفتریٰ علیہ (محمد الغزالی)، اشتراکیۃ الاسلام (محمد مصطفیٰ السباعی)، الثروۃ فی ظل الاسلام (البہی الخولی)، فقہ الزکوٰۃ (یوسف القرضاوی)، مشکلۃ الفقر وکیف عالجہا الاسلام (یوسف القرضاوی)، غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی (یوسف القرضاوی)، التشریع الجنائی الاسلامی (عبد القادر عودۃؒ)، الاسلام عقیدۃ وشریعۃ (محمود شلتوت)، احکام الذمیین والمستأمنین فی شریعۃ الاسلام (عبد الکریم زیدان)، الفرد والدولۃ فی شریعۃ الاسلام (عبد الکریم زیدان)، المجتمع الانسانی فی ظل الاسلام (انسانی معاشرہ۔ اسلام کے سائے میں[1]) (محمد ابو زہرہؒ)، نظام الحکم فی الاسلام (محمد عبداللہ العربی)، اسلام کا سیاسی نظریہ (ابوالاعلیٰ مودودیؒ)، سود (ابوالاعلیٰ مودودیؒ)، پردہ (ابوالاعلیٰ مودودیؒ)، الجہاد فی الاسلام (ابوالاعلیٰ مودودیؒ)، مشکلاتنا فی ضوء النظام الاسلامی (حسن البناء)، الاسلام وقضایا المرأۃ المعاصرۃ (البہی الخولی)، اسلامی ریاست (ابوالاعلیٰ مودودیؒ)، اسلامی ریاست (امین احسن اصلاحیؒ)

---

[1] یہ اردو ترجمہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔ (مترجم)

تجارتی سود۔ تاریخی اور فقہی نقطۂ نظر سے (ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری*)، اسلام کا نظریۂ ملکیت (ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی*)، عورت اور اسلام (سید جلال الدین عمری*)

دعوت اسلامی کی نمائندہ کتابیں:

دعوت دین اور اس کا طریقۂ کار (امین احسن اصلاحی*)، اسلام کی دعوت (جلال الدین عمری*)، اسلام آپ سے کیا چاہتا ہے (سید حامد علی*)، تحریک اسلامی۔ کامیابی کے شرائط (ابوالاعلیٰ مودودیؒ)، مسلمان خواتین کی دعوتی ذمہ داریاں (جلال الدین عمری*)، راہِ حق کے مہلک خطرے (صدر الدین اصلاحی*)، تحریک اور کارکن (سید ابوالاعلیٰ مودودی*)۔[۱]

---

[۱] اس فہرست میں نشان زدہ (*) کتابوں کا اضافہ ہم نے اپنی طرف سے کر دیا ہے۔ غالباً اردو میں ہونے کے سبب وہ مصنف محترم کی نظر میں نہ آسکی ہوں گی۔ لیکن وہ جس اہمیت کی حامل ہیں اس کے پیشِ نظر اس گفتگو میں ہم نے ان سے صرفِ نظر کرتے ہوئے آگے بڑھنا مناسب خیال نہیں کیا۔ (مترجم)

تاریخی ثقافت

اس کے علاوہ ایک دوسری ثقافت۔ جس سے دین کے ایک داعی کو اپنے کو آراستہ کرنا ضروری ہے، تاریخی ثقافت ہے۔ تاریخ جسے ہم دوسرے لفظوں میں قافلہ انسانیت کی ڈائری کا نام دے سکتے ہیں کیونکہ وہ ریکارڈ ہے۔ جس کے ذریعہ ہمیں مختلف ادوار میں انسانی قافلہ کو پیش آنے والے حالات و واقعات کا پتہ چلتا ہے۔ اگر ہم چاہیں تو اس کے ذریعہ اپنے مستقبل کو سنوارنے کے لئے عبرت و موعظت کا سامان کر سکتے ہیں اس لئے کہ اس کی مدد سے ہمیں زندگی کے وہ اصول ہاتھ آتے ہیں جنھیں اپنا کر ایک قوم عروج واقبال کی بلند ترین عزتوں کو پالیتی ہے اور جن کی عدم رعایت کے نتیجے میں وہ قعرِ ذلت میں گرنے کے لئے مجبور ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں خاص طور پر بار بار توجہ اسلامی تاریخ یا بالفاظ دیگر امت مسلمہ کی تاریخ کو ہونا چاہیے۔ البتہ ایک عمومی نظر پوری انسانی تاریخ پر بھی ہونی ضروری ہے۔ تاکہ اس میں پیش آنے والے کم از کم ان اہم واقعات سے آدمی بے خبر نہ رہے جو دنیائے انسانیت

کے لئے فیصلہ کن حیثیت کے مالک رہے ہیں اور جہاں سے تاریخ ایک نیا موڑ لیتی ہے۔
عمومی نظر کی بات ہم اس لئے کر رہے ہیں کہ جہاں تک تفصیلی مطالعہ کا سوال ہے تو جس شخص نے تاریخ کو اپنا موضوع بنایا ہو وہ بھی پوری انسانی تاریخ کے مطالعہ کا حق ادا نہیں کر سکتا چہ جائیکہ ایک عام طالب علم سے اس کی توقع کی جائے۔ دین کے ایک داعی کے لئے تاریخ سے واقفیت کی یہ ضرورت مختلف پہلوؤں سے ہے:

۱۔ پہلی بات تو یہ کہ اس کے ذریعہ اس کا ذہن وسیع ہوتا ہے اور اس کے اندر مسائل پر کھل کر سوچنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ جب قوموں کی تاریخ کا مطالعہ کرتا اور اس کے اسٹیج پر ابھرنے والی بڑی بڑی شخصیتوں کے حالات پڑھتا ہے اور پھر یہ دیکھتا ہے کہ لیل و نہار کی اس گردش میں وہ کس انجام سے دوچار ہوئیں تو اس کے لئے یہ حقیقت بالکل عیاں ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ تاریخ انسانی کے طویل عرصے میں مختلف قوموں اور جماعتوں کے تئیں سنت الٰہی کس بے لاگ طریقے پر کام کرتی رہی ہے۔ کس طرح ایک قوم عروج و اقبال کی بلند ترین منزلوں کو چھو لیتی ہے اور پھر نکبت و ادبار کے کھڈ میں گر جاتی ہے؟ بڑی بڑی حکومتیں اور مملکتیں منصۂ شہود پر آتی ہیں لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ یہ فلک شگاف عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ لوگ بڑی بڑی دعوتیں اور تحریکیں لے کر اٹھتے ہیں لیکن تھوڑی ہی دور بعد انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ بڑی بڑی تہذیبیں اور تمدن وجود میں آتے ہیں۔ لیکن زیادہ دن نہیں لگتے کہ وہ اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔ بڑی بڑی قیادتیں اور لیڈر شپ جنم لیتی ہیں لیکن ابھی وہ چند قدم ہی چلی ہوتی ہیں کہ شکست و ہزیمت ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ غرضیکہ تاریخ کے اس آئینہ خانہ میں ہمارے سامنے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ کن اسباب کے تحت کوئی قوم جاگتی

ہے اور وہ کیا حالات ہوتے ہیں جو اسے گمنامی کی نیند سلانے کے لئے مجبور کر دیتے ہیں۔
قرآن کریم ذیل کی آیت میں انہی حقائق کی نشاندہی کرتا ہے۔

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ	(کیا یہ زمین میں نہیں چلے کہ ان کے دل ہوتے
لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَا اَوْ اٰذَانٌ	جن سے یہ سمجھتے۔ اور ان کے کان ہوتے جن سے
يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ	یہ سنتے۔ اس لئے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں۔
وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي	بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں
الصُّدُوْرِ۔ (حج - ۴۶)	ہوتے ہیں)

۲۔ پھر یہ کہ اسلام جن بلند پایہ اصولوں اور جن اعلیٰ اقدار کا علمبردار ہے تاریخ اس کی صداقت و حقانیت کی بہترین گواہی فراہم کرتی ہے۔ تاریخ کے اس آئینے میں صاف نظر آجاتا ہے کہ اللہ پر ایمان اور اس کے خوف و خشیت کے کیا بہترین نتائج آدمی کو ملتے ہیں اس کے برعکس خدا کے انکار اور اس کی نافرمانی کے نتیجے میں انسان کس انجام بد سے دوچار ہوتا ہے۔ جو لوگ دنیا کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں پر شکر و احسان کی روش اپناتے ہیں اپنے اس طرز عمل کا وہ کس قدر بہترین بدلہ پاتے ہیں اور جو ان نعمتوں کی ناشکری کرتے اور سرکشی کی راہ اختیار کرتے ہیں کس طرح ان پر خدا کی عقوبت کا تازیانہ برستا ہے جو شخص دنیا میں نیکی کا بیج بوتا ہے کس طرح وہ اس کے بہترین پھل سے اپنے کو شاد کام کرتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص لوگوں کے راستے میں کانٹے بچھاتا ہے کس طرح اسے اس کے کڑوے کسیلے پھل کو اپنے حلق سے نیچے اتارنے کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے۔
عبرت و موعظت کے یہی لازوال اور درخشندہ پہلو ہیں جن کے پیش نظر قرآن اپنے صفحات میں گذشتہ قوموں اور ان کی تاریخ کا بار بار حوالہ دیتا ہے:

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِى الْبِلَادِ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ. اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ـ (ق ـ ۳۶، ۳۷)

(ان (اہل مکہ) سے پہلے ہم بہت سی قوموں کو ہلاک کر چکے جن کی قوت ان سے زیادہ زبردست تھی پھر وہ شہروں شہروں چھانتے پھرتے کہ کہیں ہے بھاگنے کا ٹھکانا۔ بیشک اس میں نصیحت ہے اس کے لئے جس کو دل ہو اور جو بات کو دھیان لگا کر سنے)

دوسرے مقام پر ہے

لَقَدْ كَانَ فِىْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِى الْاَلْبَابِ ـ (یوسف ـ ۱۱۱)

(ان (اقوام ماضیہ) کے قصوں میں عبرت و نصیحت ہے سمجھ والوں کے لئے)

اسی طرح اکثر و بیشتر قرآن حکیم ان اقوام کے حالات و واقعات کے بیان میں ان کے انجام کی تفصیل کرنے کے بعد ان سے حاصل ہونے والے سبق کی بھی نشاندہی کرتا جاتا ہے۔ چنانچہ قوم ثمود کا قصہ نقل کرنے کے بعد فرمایا۔

فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ـ (نمل ـ ۵۲، ۵۳)

(سو یہ ان کے گھر ڈھیے پڑے ہیں اس بنا پر کہ انھوں نے انکار کیا۔ بیشک اس میں نشانی ہے جاننے والوں کے لئے۔ اور ہم نے بچا دیا ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جو اللہ کا ڈر رکھتے تھے)

قوم سبا کا واقعہ بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا۔

ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا وَهَلْ نُجٰزِىْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ ـ (سبا ـ ۱۷)

(یہ ہم نے ان کو بدلہ دیا اس بنا پر کہ انھوں نے ناشکری کی۔ اور ایسا بدلہ تو ہم ناشکری کرنے والے ہی کو دیتے ہیں)

حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی کشمکش کی داستان کو نقل کرنے کے بعد قرآن کا اس پر تبصرہ ان لفظوں میں ہے:

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ـ (اعراف ـ ۱۳۷)

(اور ہم نے وارث کر دیا ان لوگوں کو جو دبائے ہوئے تھے۔ اس سرزمین کے مشرق و مغرب کا جس میں ہم نے برکت رکھی ہے (یعنی ارض شام) اور تیرے رب کا بھلا وعدہ پورا ہو گیا بنی اسرائیل پر اس بنا پر کہ انھوں نے صبر سے کام لیا اور ہم نے تباہ کر دیا وہ جو بناتے تھے فرعون اور اس کی قوم کے لوگ اور انگور جو وہ چڑھاتے تھے چھتریوں پر)

دین کا داعی قدم قدم پر اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو جن اصولوں اور جن اقدار کی طرف دعوت دے رہا ہے اس کے حق میں اس کے پاس علاوہ اور چیزوں کے تاریخ کے شواہد بھی موجود ہوں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ دنیا کے اسٹیج پر ایک سے ایک زبردست اور صاحب قوت و جبروت شخصیتیں نمودار ہوئیں لیکن آن کی آن میں وہ فنا کے گھاٹ اتر گئیں۔ تاریخ انسانی کا یہ وہ عبرت ناک پہلو ہے جس کے ذریعہ داعی کو لوگوں کے ذہن و دماغ میں اپنے مطلوبہ مقاصد اور پیش نظر اقدار کو جاگزیں کرانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ سادی سودی نصیحتیں تو ہو سکتا ہے لوگوں کے لئے توجہ کا باعث کم بن سکیں لیکن جریدۂ عالم پر اقوام ماضیہ کے یہ جو نقوش ثبت ہیں کوئی سمجھ دار انسان بھلا انھیں نظر انداز کر کے آگے کیسے بڑھ سکتا ہے؟

۳ . اس کے علاوہ تاریخ کے مطالعہ میں چوں کہ ایک ہی طرح کے واقعات بار بار سامنے

آتے رہتے ہیں اس لئے اس کے ذریعہ اپنے زمانہ کے کسی پیش آمدہ مسئلہ کو سمجھنے اور اس کے سلسلے میں فیصلہ کرنے میں آدمی کو کافی مدد ملتی ہے۔ اور اس صورت میں تو یہ چیز اور بھی زیادہ قریب الفہم ہو جاتی ہے جب کہ دو واقعات کی ظاہری مشابہت کے ساتھ ان کے وجود پذیر ہونے کے احوال و ظروف اور ان کے اسباب و محرکات میں بھی یکسانیت ہو۔ تاریخ انسانی میں پیش آنے والے واقعات کی یہی باہمی یکسانیت ہے جس کے سبب اہل عرب کے یہاں یہ مقولہ رائج تھا کہ: کل آج سے کیسا مشابہ ہے، ما اشبہ اللیل بالبارحۃ۔ اور جسے آج کے جدید اسلوب میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے"۔ قرآن حکیم نے بھی آخری نبیؐ کی دعوت سے نبیش قوم کے جواب اور اس کے ردعمل کے سلسلہ میں گذشتہ اقوام کے اسی طرح کے جواب اور اسی نوعیت کے ردعمل کا بار بار حوالہ دیا ہے۔ مشرکین عرب کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حسی معجزات طلب کرنے کے سلسلے میں قرآن ان کے مطالبہ کو ان لفظوں میں بیان کرنے کے بعد کہ:

لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ۔ (اللہ کیوں نہیں ہم سے (دو بدو) ہمکلام ہوتا یا ہمارے پاس کوئی اور کھلی ہوئی نشانی کیوں نہیں آجاتی)

اگلے ٹکڑے میں اسی حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے۔

كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۔ (بقرہ - ۱۱۸) (انہی لوگوں جیسی بات کہی تھی ان لوگوں نے بھی جو ان سے پہلے تھے۔ ان سب کے دل بالکل ایک جیسے ہیں)

دوسرے مقام پر فرمایا:

كَذٰلِكَ مَاۤ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ اَوْ مَجْنُوْنٌ اَتَوَاصَوْا (اسی طرح ان سے پہلے جو رسول بھی آیا لوگوں نے یہی کہا یہ جادوگر یا دیوانہ ہے۔ کیا انھوں نے آپس میں اس کی

بِهٖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۔ (ذاریات - ۵۲، ۵۳) (کبھی بدی کر رکھی ہے۔ کچھ نہیں بلکہ یہ سرکش لوگ ہیں)۔

گویا کہا یہ جا رہا ہے کہ جب مخاطب قوم اور گذشتہ اقوام کا غرور و استکبار اور نافرمانی و سرکشی میں حال یکساں تھا تو اب رسولؐ خدا کے خلاف افترا پردازی اور بہتان تراشی میں بھی ان کے طرز عمل کو ایک سا ہی ہونا چاہیئے۔

اس کے علاوہ تاریخ سے واقفیت کی اہمیت و ضرورت کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ اس لئے کہ موجودہ زمانہ میں جو بہت سے مسائل ہمیں درپیش ہیں ان میں کتنے مسائل ایسے ہیں جن کی جڑیں تاریخ میں بہت گہری اتری ہوئی ہیں۔ جس شخص کی اس پورے سلسلۂ تاریخ پر نظر نہ ہوگی آج کے زمانے میں وہ ان کے مالہٗ و ماعلیہ کو پوری طرح سمجھنے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ مثال کے طور پر ہمارے اس دور میں اسلام اور عیسائیت کے درمیان جو کش مکش برپا ہے جب تک کہ آدمی اس کشمکش کی پوری تاریخ سے واقف نہ ہو کہ کس طرح صلیبی جنگوں کے دوران یہ چیز اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی، پھر یہ کہ وہ کونسے اسباب و محرکات تھے جن کے تحت ان جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا اور پھر ان کے نتیجے میں کتنا زبردست تباہی و بربادی کا بازار گرم ہوا نیز یہ کہ انسانی تاریخ پر اس کے کتنے دوررس اثرات مرتب ہوئے، جب تک یہ تمام باتیں آدمی کے پیش نظر نہ ہوں وہ اسلام اور عیسائیت کی موجودہ کش مکش کو وہ پوری طرح سمجھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بات صلیبی جنگوں ہی پر ختم نہ ہو کر اس کا سلسلہ حضرات خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں ہونے والے معرکوں سے جا ملتا ہے جن میں اسلام اور عیسائیت کی ایک دوسرے سے ٹکر ہوئی۔ مثال کے طور پر جنگ یرموک اور دوسری جنگیں جن کے نتیجے میں شام و مصر اور افریقہ کا بڑا علاقہ اسلام کے

زیرنگیں ہوگیا۔ بلکہ اس سے بھی آگے اس کشمکش کا سرا حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ سے جاملتا ہے۔ غزوۂ موتہ اور غزوہ تبوک میں یہ عیسائی قوم ہی تھی جو مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہوئی تھی۔

۴۔ اس کے علاوہ داعی کی علمی اور فکری تربیت کے پہلو سے بھی تاریخ کے اس مطالعہ کی کافی اہمیت ہے۔ مثال کے طور پر مختلف مذاہب کا مطالعہ نیز یہ کہ مختلف ادوار میں ان کا کیا کردار رہا اور ان کے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ دنیا کے اسٹیج پر نمودار ہونے والی بڑی بڑی شخصیتوں کا مطالعہ نیز ان کی زندگی میں پیش آنے والے ان اہم ترین واقعات کی تفصیل جنھیں انسانی تاریخ میں خصوصیت کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اسی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ان کا خاتمہ کس طور پر ہوا اور اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ اسی سے ملتی جلتی بات تاریخ کے طویل عرصے میں پیدا ہونے والے فرقوں اور جماعتوں اور مختلف مکاتب فکر و نظر کی تاریخ کی بھی ہے۔ بڑی بڑی تہذیبوں کی تاریخ۔ اور خاص طور پر ان کے اجتماعی اور تمدنی پہلوؤں کا مطالعہ وغیرہ (جب تک داعی کی ان تمام چیزوں پر فی الجملہ نظر نہ ہوگی اپنی علمی زندگی میں ان سے عہدہ برا ہونے اور ان کے تئیں مناسب اور معقول طرز عمل اختیار کرنے میں وہ کامیاب نہ ہو سکے گا)

مطالعۂ تاریخ کے لئے ہدایات: اس مقام پر دین کے ایک داعی کے لئے مطالعۂ تاریخ کے سلسلے میں چند اہم باتوں کی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھیں ہر وقت اسے اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے۔

۱۔ پہلی بات تو یہ کہ اس کی اصل توجہ اور دلچسپی تاریخ کے جزئی واقعات اور اس کی تفصیلات کو سمیٹنے پر نہیں ہونی چاہیے، اس لئے کہ اولاً تو اس طرح واقعات کا

استقصاء کرنا ممکن نہیں اور اگر اس میں کسی حد تک کامیابی ہوتی بھی ہے تو داعی کے لئے اس کی افادیت برائے نام ہے۔ داعی کا اصل نشانہ تاریخ کے اوراق میں پھیلے ہوئے عبرت و موعظت کے شاہکاروں کو ہونا چاہئے جس سے اس کی فکر و نظر کو مہمیز اور اس کی روح کو بالیدگی نصیب ہو سکے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مطالعہ تاریخ کی اصل افادیت اس کے جزئی واقعات کے استقصاء میں نہیں بلکہ اخلاقی تربیت کے اس سامان میں ہے جنھیں آدمی ان حالات و واقعات کی روشنی میں اخذ کر سکتا ہے۔ تاریخ کی اصل اہمیت واقعات کی تفصیلات میں نہیں بلکہ اس حقیقت میں مضمر ہے کہ لیل و نہار کی اس گردش میں کس نے کیا بویا اور کس کو کیا کاٹنا نصیب ہوا۔

۲۔ دوسری چیز جو اس کے لئے دھیان دینے اور نگاہ رکھنے کی ہے وہ تاریخ کے وہ واقعات ہیں جو اس سے اپنے پیش نظر موضوع کے لئے کام دے سکیں اور جن کے ذریعہ اس کی فکر و نظر میں گہرائی پیدا ہو سکے اور جنھیں وہ حسب ضرورت اپنے لئے بطور استدلال کے استعمال کر سکے۔ اس طرح کے واقعات سے واقفیت بہم پہنچانے کے لئے خاص طور پر تاریخ کی کتابوں کا ہی مطالعہ کرنا ضروری نہیں ہے دوسرے ان مآخذ سے بھی داعی اس سلسلے کی بہت سی چیزیں اخذ کر سکتا ہے جن کی طرف عام طور پر تاریخ کے طالب علم توجہ نہیں کرتے۔ یہ مواد وہ قرآن و حدیث کے ذخیرے سے بھی حاصل کر سکتا ہے اور آثار صحابہؓ اور قرون اولی سے متعلق لٹریچر کے ذخیرے سے بھی۔ یہاں تک کہ کتاب الخراج، اور کتاب الاموال جیسی کتابوں میں بھی اسے یہ چیز مل سکتی ہے جو اصلاً احکام اسلام سے متعلق ہیں۔ اس سے بھی آگے خالص ادب، سیر و تفریح اور نگرانی حکومت کے شعبے سے متعلق کتابیں، جسے اصطلاح میں 'احتساب'، یا 'حسبہ'، کے نام سے

جانا جاتا ہے اسی طرح فقہ وفتاوی کی کتابوں کے اندر بھی جستجو کرنے والا اس طرح کے مواد کو نکال لے سکتا ہے۔

۳۔ تیسری چیز جس پر ایک داعی کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے وہ بڑی بڑی شخصیتوں کی سیر وسوانح اور ان کی سرگرم زندگی میں پھیلے ہوئے خاص خاص واقعات ہیں۔ خاص طور پر علمائے امت، ارباب دعوت وعزیمت اور امت کے صلحاء اور اتقیا کی زندگیاں اور انھیں پیش آنے والے اہم واقعات وحالات کی تفصیل۔ ہماری چودہ سو سالہ تاریخ اپنے اوراق میں ایسے بے شمار انسانوں کے حالات وواقعات کو سمیٹے ہوئے ہے جن سے آدمی اپنی زندگی میں روشنی حاصل کرسکتا اور جنھیں بجا طور پر وہ اپنے لئے نمونہ بنا سکتا ہے۔ ان کی مثالی زندگیوں میں ایک مومن کامل کی تصویر اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک طرف تو طبقات وتراجم کا وہ سلسلہ ہے جس میں ہر طرح کی شخصیتوں کے حالات مذکور ہیں مثال کے طور پر وفیات الاعیان، اور الوافی بالوفیات وغیرہ۔ دوسری طرف ان کا وہ سلسلہ ہے جس میں خاص طور پر کسی ایک طبقہ کے لوگوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں مثال کے طور محدثین کے حالات میں طبقات ابن سعد، اور تہذیب التہذیب، اور صلحاء اور اتقیاء کے حالات سے متعلق حلیۃ الاولیاء، اور صفوۃ الصفوۃ۔ اسی طرح فقہاء امت نیز ان میں بھی خاص طور پر کسی ایک مکتب فقہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی سوانح اور ان کے حالات سے متعلق طبقات وتراجم کا سلسلہ مثلاً طبقات الحنفیہ، اور طبقات الشافعیہ، جیسے عنوانات کی حامل کتابوں کا سلسلہ۔ یہی نہیں بلکہ اطباء اور حکماء نیز لغویوں اور نحویوں کے حالات زندگی سے متعلق کتابوں کے سلسلے میں بھی یہ چیز نہیں مل سکتی ہے۔

بہر حال ہم روز جس بات پر دینا چاہتے ہیں وہ یہ کہ تاریخ صرف بادشاہوں اور سیاسی طالع آزماؤں کے حالات زندگی کا نام نہیں، بلکہ ان کے علاوہ دوسری طرح کی بے شمار شخصیتیں بھی ہیں جن کا امت کی تاریخ بنانے میں انتہائی اہم کردار رہا ہے اور انسانی زندگی پر اپنی بے مثال زندگیوں کے انھوں نے وہ تابندہ نقوش چھوڑے ہیں جو کسی بھی صورت سے مٹائے نہیں جا سکتے۔ سچ یہ ہے کہ امراء و سلاطین اور سیاسی رہنماؤں کے بالمقابل ان کا پلہ کچھ زیادہ ہی بھاری نظر آتا ہے۔

ہماری تاریخ کے اندر امراء و سلاطین کی فہرست میں کتنے ہی لوگ ہیں جن کی زندگیاں بالکل ویران کھنڈر کے مانند ہیں۔ جن سے آدمی کو کوئی سبق ملتا ہے نہ اس کی قوت فکر وعمل کو کوئی حرکت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس دوسرے میدان کی بے شمار شخصیتیں ہیں جن کی زندگیاں مثالی اور اعلیٰ انسانی قدروں سے پر ہیں، جن کے مطالعہ سے انسان کی حرارت ایمانی میں اضافہ ہوتا اور جہد وعمل کے لئے بے قراری کی دولت نصیب ہوتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ امت کسی بھی دور میں اپنی تاریخ کو اس پہلو سے دیکھنے سے غافل نہیں رہی ہے۔ سلاطین وامراء کے مقابلے میں علماء وصلحا کی طرف اس کی توجہ ہمیشہ سے زیادہ ہی رہی ہے۔

۴۔ اس کے علاوہ ایک دوسری چیز جس پر داعی کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اسے حالات وواقعات کو ان کے اخلاقی ومعنوی اسباب وعلل سے ملا کر دیکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ خاص طور پر ہماری اسلامی تاریخ کے سلسلے میں اس کا اور بھی اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ ملت اسلامیہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا کوئی بھی شخص تھوڑے سے غور وفکر سے اس حقیقت کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ اپنی زندگی کے طویل عرصے

میں امت کے اندر جو مدوجزر آیا، اس کا دائرہ جب کبھی وسیع ہوا یا اسے اپنے بال و پر سمیٹنے کے لئے مجبور ہونا پڑا، اسے فتح و کامرانی کے دن دیکھنے کو ملے یا ناکامی اور ہزیمت اس کا مقدر بنی، اس کا عروج و اقبال کا ستارہ بلند ہوا یا نکبت و ادبار نے اس پر اپنا سایہ ڈالا، اس کے مال و دولت میں اضافہ ہوا یا وہ غربت و افلاس کی زد میں آئی، ان تمام باتوں کا سرا اس بنیادی حقیقت سے جڑتا ہے کہ امت کا اسلام سے تعلق کتنا مضبوط رہا یا اس سے کس قدر دور رہی۔ اس نے اسلامی تعلیمات کو اپنا مشعل راہ بنایا یا ان سے منہ موڑ کر ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھاتی رہی۔ حضرات خلفائے راشدینؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے مثالی زمانوں اسی طرح ہارون رشید، نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی کے ادوار میں جب امت فی الجملہ اسلام سے چمٹی اور اسے ہی اپنا ملجا و ماویٰ بنائے رہی تو اس کا پھل اسے عزت و سربلندی اور عروج و اقبال کی بے پایاں دولت کی صورت میں ملا۔ دوسرے امراء و سلاطین کے زمانوں میں جب اس نے اس کے برعکس روش اپنائی تو اس کا نتیجہ بھی اس کے سامنے الٹا آیا کہ ذلت و رسوائی اور نکبت و ادبار اس کا مقدر بن گیا۔

۴۔ آخری بات یہ کہ تاریخ کے اس مطالعہ کا اصل مرکز توجہ اسلام کو ہونا چاہیے۔ اسلام اس حیثیت سے کہ وہ ایک ہمہ گیر پیغام اور ایک انقلاب انگیز دعوت اور مشن سے عبارت ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اس کے زیر سایہ ایک پوری امت کی تشکیل ہوئی ہے اور اس کے افراد کی ایک خاص انداز کی تربیت اور ایک بالکل ممتاز طریقے پر ان کی کردار سازی کا اہتمام ہوا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی بنیاد پر دنیا میں بڑی بڑی حکومتیں قائم ہوئی ہیں اور عظیم ترین تہذیبیں اور بڑے بڑے تمدن وجود میں آئے ہیں۔ پوری دنیا

کے نقشے پر اس نے اپنے محسوس اثرات چھوڑے ہیں۔ اور چار دانگ عالم میں اس کے نشانات دیکھے جا سکتے ہیں۔ حالات سازگار رہے ہیں تو اس کا قافلہ پوری صبارفتاری کے ساتھ آگے بڑھا ہے لیکن اگر کبھی حالات نے پلٹا کھایا اور اسے کٹھنائیوں کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے پوری ہمت اور جواں مردی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا ہے۔ پھر اس کی اثر انگیزی کا عالم یہ رہا کہ اپنے وقت کی جابر سے جابر اور سرکش ترین قوتیں بھی اس کی گرویدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اور اپنی اکڑفوں سے دستبردار ہوتے ہوئے انھیں اس کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونا پڑا۔ سلجوقیوں اور تاتاریوں کی مثال دنیا کے سامنے ہے جنھیں بالآخر اپنے صنم خانوں کو پاش پاش کرتے ہوئے کعبہ کی پاسبانی کا فرض انجام دینا پڑا۔

ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

اور بات یہیں آکر رک نہیں جاتی۔ بلکہ ہر دور اور ہر زمانے میں اس نے اپنی اس صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔ طرح طرح کی قومیں اور مختلف رنگ و نسل کے لوگ کثیر اس کے دائرے میں شامل ہوتے رہے ہیں۔ جن کے اندر روح جہاد کو بیدار اور پروان چڑھاتے ہوئے اس نے اقصائے عالم میں امت کا لوہا منوایا، ورنہ اتنا تو ضرور ہی ہوا ہے کہ اس کی بدولت اس نے اس کے کھوئے ہوئے عزت و وقار کو بحال کرنے کا سامان کیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی اس مقام پر میں تاریخ کے سلسلے میں چند اہم حقائق کی نشاندہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنھیں مخالف اسلام ارباب قلم اور ادارے اگر جان بوجھ کر نہیں تو بھول چوک کے نتیجے ہی میں بہر حال نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

پہلی چیز تو یہ کہ ہمیں اس جاہلیت قدیمہ کو پوری طرح ابھار کر پیش کرنے کی ضرورت ہے جس کا گھٹا ٹوپ اندھیرا پوری دنیا اور بالخصوص عالم عرب پر چھایا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں اگر ہمارے لئے مبالغہ آمیزی سے کام لینا جائز نہیں تو اسے اس کی واقعی صورت سے گھٹا کر پیش کرنا بھی درست نہ ہوگا۔

آج عیسائی مشنریاں اور مغربی ارباب قلم اس جاہلیت کو انتہائی حسین اور خوبصورت لباس میں پیش کرتے ہیں۔ اپنے خیال کے مطابق وہ اس کی اچھائیوں کو تو خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں لیکن اس کے اندر برائیوں اور خرابیوں کا جو طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا اس سے اپنی نگاہیں یکسر بند کر لینا چاہتے ہیں۔ قومیت و وطنیت کے دلدادہ عناصر جن میں عرب قومیت کے علمبرداروں کا نام سر فہرست ہے اسے پڑھ اور سن کر پھولے نہیں سماتے اور عرب جاہلیت کی وکالت اس طور پر شروع کر دیتے ہیں کہ گویا اس کے اندر کوئی برائی اور کوئی خرابی تھی ہی نہیں۔ ظاہر ہے اس صورت میں انھیں اس قدیم جاہلیت سے چمٹنے سے کوئی چیز باز نہیں رکھ سکتی۔ آدمی کسی چیز کو پکڑنے اور اسے اختیار کرنے سے تو اسی وقت احتراز کرتا ہے جب کہ اس کے اندر اس کی برائی اور خرابی کا احساس پوری طرح بیدار ہو۔ ہمارے یہاں المجتمع العربی (عربی سماج) کے عنوان سے تاریخ و ادب کی جو کتابیں سامنے آرہی ہیں انھیں دیکھ کر اس حقیقت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ تعجب ہے کہ ان حضرات کو عرب جاہلیت کی خوبیاں اور اچھائیاں تو ایک ایک کر کے نظر آتی ہیں لیکن فکری اور اخلاقی اعتبار سے وہ قوم جس انارکی کا شکار تھی اور تہذیب و تمدن کے تصور سے بھی وہ جس طرح بیگانہ تھی افسوس ہے کہ اس کی طرف ان کی نگاہیں بالکل متوجہ نہیں ہوتیں۔ حالانکہ اسلام سے پہلے عرب

کے لوگ جہالت و گمراہی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پڑے ہوئے تھے جس کا بیان قرآن حکیم کے لفظوں میں اس طرح ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔ (جمعہ - ۲)

(وہی (اللہ) ہے جس نے ان پڑھوں میں انھی میں سے ایک رسول کو اٹھایا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے ان کو سنوارتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ اس سے پہلے وہ کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

اس مقام پر لسان حق ترجمان حضرت عمرؓ کی یہ نصیحت بار بار یاد آتی ہے جو واقعہ یہ ہے کہ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ آپ نے فرمایا تھا:

"انما تنقض عرا الاسلام عروۃ عروۃ اذا نشأ فی الاسلام من لا یعرف الجاهلية۔"

"اسلام کا شیرازہ ایک ایک کر کے بکھر جائے گا جب اس کے اندر ایسے لوگ پیدا ہونے لگیں جو "جاہلیت" سے پوری طرح واقف نہ ہوں"

اس لئے کہ جب تک اس "جاہلیت" سے آدمی کو صحیح معنوں میں واقفیت نہ ہو، اسلام نے انسان کے فکر و نظر کی اصلاح اور اسے علم و عمل کی صراط مستقیم پر گامزن کرنے کے سلسلے میں جو عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے اور جس کا لازوال ذخیرہ آج بھی ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے، حق یہ ہے کہ "جاہلیت" سے اچھی طرح واقف ہوئے بغیر خواہ وہ جاہلیت 'قدیمہ' ہو یا 'جاہلیت جدیدہ' آدمی صحیح طور پر اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کر سکتا ہے۔ البتہ اس کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں پڑے ہونے کے باوجود عرب قوم کا یہ امتیاز اپنی جگہ ہے جو اپنی بے مثال شجاعت و بہادری، اپنی غیرت و حمیت اور اخلاقی جرأت کی بدولت اسے اقوام عالم میں حاصل تھا۔ عربی زبان کی فصاحت و بلاغت

اور دنیا کی تمام زبانوں میں اس کا امتیازی مقام، عرب کا جائے وقوع اور پورے کرۂ ارض کی نسبت سے اس کی وسطیت و مرکزیت وغیرہ دوسری خصوصیات اس پر مستزاد ہیں جن کی بنا پر اسلام کے لازوال اور ابدی پیغام کے لئے قوم عرب کا انتخاب عمل میں آیا۔ خالق کائنات اور علیم وخبیر خدائے ذوالجلال کا انتخاب جو یقیناً یوں ہی اور بلا وجہ نہیں ہوسکتا تھا:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ۔ اللہ کو زیادہ بہتر علم ہے کہ وہ رسالت (کا منصب) کہاں اور کسے عطا کرتا ہے۔)

(انعام - ۱۲۴)

۲ ۔ اسی طرح تاریخ اسلام کے طویل عرصے میں ابھرنے والی اصلاح وتجدید کی مختلف تحریکات اور ان مجددین کی شخصیتوں کو بھی ہماری خصوصی دلچسپی کا موضوع ہونا چاہیے جنھیں اللہ تعالیٰ اس فریضے کی ادائگی کے لئے امت کے اندر مختلف اوقات میں پیدا کرتا رہا ہے۔ پھر یہ کہ تجدید دین کا فرض انجام دینے والی یہ شخصیتیں ایک ہی رنگ کی نہیں ہوتیں بلکہ مختلف دائروں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے ہاتھوں یہ کام انجام پاتا ہے اس فہرست میں اگر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جیسی شخصیت ہے جسے پانچواں خلیفہ راشد کہا جاتا ہے تو بعد کے امراء وسلاطین میں نورالدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی بھی اسی فہرست میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ فقہاء امت اور ارباب دعوت وعزیمت شخصیتوں کی بھی ایک لمبی فہرست ہے جنھوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اس فریضے کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے مثال کے طور پر امام شافعیؒ، امام غزالیؒ، علامہ ابن تیمیہؒ، علامہ عبدالوہابؒ نجدی وغیرہ۔ تجدید دین کا یہ فریضہ ایک فرد واحد بھی انجام دے سکتا ہے اور کبھی یہ کام کسی جماعت اور کسی خاص مکتب فکر کے ذریعہ بھی انجام پاسکتا ہے جس کے

نتیجے میں معاشرہ کا ایک خاص رخ بنتا ہے اور محسوس تبدیلیاں ابھر کر سامنے آتی ہیں جنھیں ہر شخص اپنی نگاہوں سے دیکھ سکتا ہے۔

۳ ۔ اس کے ساتھ ہی پوری دنیا اور بالخصوص عالم اسلام میں جس کا دائرہ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک پھیلا ہوا ہے۔ حالیہ صدیوں میں استعماری طاقتوں کے خلاف جو جدوجہد ہوئی ہے اور ان کے ظلم واستبداد اور ان کی ریشہ دوانیوں کا امت اسلامیہ نے جس بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا ہے، استعمار کے خلاف اس جنگ میں اسلام اور اس کے علمبرداروں کا جو شالی کردار رہا ہے تاریخ کے اس مطالعہ میں اسے بھی کسی طرح سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ صلیبی طاقتوں کی تمامتر فریب کاریوں اور مسلمان عوام کو اپنے نت نئے اسلحوں سے ڈرانے دھمکانے اور انھیں گمراہ کرنے اور ان کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی ہزار کوششوں کے باوجود مغربی استعمار کو عالم اسلام کے کسی بھی حصے میں چین سے رہنا نصیب نہ ہوسکا بلکہ اسے ہر جگہ سخت ترین مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس میں شک نہیں استعمار کے خلاف اس جنگ میں خون کی ندیاں بہہ گئیں اور اس راہ میں جام شہادت نوش کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا اور شہداء کی لاشوں کا ایک انبار لگ گیا۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان کسی بھی صورت مقابلہ سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ استعمار کے پاؤں اکھڑ گئے اور سوائے بھاگنے کے اس کے لئے کوئی دوسرا چارہ کار باقی نہ رہا۔ یہ سب صرف اسلام کا کرشمہ تھا۔ اور اس جنگ کی کمان علمائے امت اور ارباب دعوت وعزیمت ہی کے ہاتھوں میں تھی جنھوں نے برطانیہ، فرانس، اٹلی اور اسپین جیسی بڑی طاقتوں کے چھکے چھڑا دئے اور اس پورے استعماری سیلاب کو اپنی اصل پناہ گاہوں میں سر چھپانے کے لئے مجبور کردیا

چنانچہ بہت سے مغربی مؤرخین مثال کے طور پر برنارڈ لوئیس اور اس کے علاوہ دوسرے بہت سے لوگوں نے بھی کھلے لفظوں میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے[۱]

چند وہ امور جن سے تاریخ کے مطالعہ میں داعی کو ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے:

اس کے ساتھ ہی میں داعی کی توجہ بعض دوسرے احتیاط طلب امور کی طرف بھی مبذول کرانی ضروری سمجھتا ہوں جن پر دھیان نہ دے کر واقعہ یہ ہے کہ مطالعہ تاریخ کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا ہے:

پہلی چیز تو یہ کہ تاریخ کے صفحات میں جو کچھ مذکور ہے ایسا نہیں کہ اس کا ہر ہر حرف اس قابل ہے کہ اس پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کر لیا جائے۔ ہمارے تاریخی ماخذ میں کتنی ہی چیزیں ہیں جو مبالغہ آرائی کا شاہکار ہیں۔ جن میں حقائق کو بالکل توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے اور بات کچھ سے کچھ بنا دی گئی ہے۔ اگر آدمی کسی ایک واقعہ کی تمام جزئیات کا احاطہ کرنے کی کوشش کرے اور اس سلسلے میں تمام ماخذ کا بالاستیعاب مطالعہ کر سکے تو وہ اس حقیقت کا اندازہ اچھی طرح لگا سکتا ہے۔ تاریخ نویسی میں قومی اور خاندانی اور سیاسی، مذہبی اور مسلکی عصبیتوں کا بڑا اہم کردار رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں حقائق کو اپنی خواہشات کا جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی۔ واقعات کے بیان میں انہیں ایک خاص رنگ دے کر پیش کیا گیا اور ان سے متعلق افراد و شخصیات کی مثبت یا منفی جیسی چاہی تصویر بنا کر رکھ دی گئی۔ اور اس صورت کے پیش نظر تو ہمیں اور بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لینے میں کوئی تامل باقی نہیں رہتا کہ عام طور پر تاریخ کو مرتب کرنے والے زیادہ تر

---

[۱] ملاحظہ ہو موصوف کی کتاب الغرب والشرق الاوسط، ترجمہ ڈاکٹر نبیل صبحی۔

فتحمند عناصر ہی ہوتے ہیں۔ سیاسی غلبہ و تسلط کی چکا چوند روشنی میں نگاہیں عام طور پر خیرہ ہو جاتی ہیں جس کے نتیجے میں غالب اور فتح مند عناصر کی خامیاں اور کمزوریاں تو پردۂ خفا میں چلی جاتی ہیں۔ البتہ محکوم اور مغلوب عناصر کی خوبیاں بھی عام طور پر خرابیوں کی صورت میں نمایاں کر دی جاتی ہیں اور رائی کو پہاڑ کی صورت میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ یہ کام قصد و ارادے کے بغیر شاید کبھی بے اختیاری میں بھی ہو جاتا ہو لیکن بہر حال صورت واقعہ یہی ہے۔

کسی اور زمانے کا کیا ذکر تاریخ کی اس ستم رانی سے تو خلافت راشدہ اور اس کے بعد کا مبارک زمانہ بھی محفوظ نہیں ہے۔ حالانکہ یہ وہ دور تھا جس میں اسلام کا پھریرا دنیا کے چپے چپے پر لہرایا، عربی زبان اور دینی علوم کا پوری دنیا میں آوازہ بلند ہوا۔ پھر بھی وہ مبارک عہد تھا جس میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھنے اور سمجھانے کی ایسی کوششیں سامنے آئیں جن کی بعد کے ادوار میں کہیں نظیر ملنی مشکل ہے۔ علاوہ ازیں حضرات صحابہ کرام رضؓ اور ان کے بعد آنے والوں کی یہ وہ مبارک صدی تھی، جس کی تعریف و توصیف اور جس کی افضلیت کا بیان خدا اور رسولؐ کی زبان سے صاف لفظوں میں مذکور تھا۔ یہ انسانیت کے وہ گل سرسبد تھے جنہیں قرآن ازبر اور جو اپنے سینوں میں حدیث رسولؐ کی امانت کو محفوظ کیے ہوئے تھے۔ پھر قرآن و حدیث کی تعلیمات کو بعد کے لوگوں تک پہنچانے کے سلسلے میں ان حضرات نے جو جان توڑ کوششیں کی ہیں اور اس کے لئے جس طرح اپنا دن کا آرام اور رات کی نیندیں حرام کی ہیں وہ ان سب پر مستزاد ہے لیکن اپنے ان تمام کارناموں اور اپنے حق میں فضیلت و برتری کی تمام تر شہادتوں کے باوجود یہ حضرات اپنے کو تاریخ کی ستم چکانی سے محفوظ نہ

رکھ سکے۔ مآخذ کو اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ ان نفوس قدسیہ کی بے مثال زندگیوں کے ساتھ جو ناانصافی کی گئی اور ان کی شخصیت کے چہرے کو جس طرح بگاڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اسے ہر شخص پہلی نظر میں محسوس کر سکتا ہے ...... بعد میں ہوتا یہ ہے کہ لوگ تاریخ کے انہی بیانات پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کر لیتے ہیں۔ چنانچہ آج اپنے زمانے میں ہم بہت سے لوگوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ کسی تحقیق و تنقید کی زحمت اٹھائے بغیر تاریخ کے اس ذخیرے سے اسی طرح کے رطب و یابس کو جمع کر لیتے ہیں اور پھر یہ شور مچاتے پھرتے ہیں کہ ہم نے علم و تحقیق کی شاہراہ سے ایک قوم اِدھر اُدھر نہیں رکھا۔ ہم بات اپنی طرف سے نہیں کہہ رہے ہیں۔ دیکھ لیا جائے ہمارے مآخذ یہی طبری، واقدی اور ابن اثیر وغیرہ ہیں۔ ان کی تاریخ کی فلاں جلد، اس کا فلاں صفحہ اور اس کا فلاں ایڈیشن۔

مغربی ارباب قلم اور مستشرق حضرات کا یہی انداز ہے۔ اور اسی سے متاثر ہو کر ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے بہت سے اساتذہ بھی انہی کے نقش قدم کے پیرو ہیں۔ اسی طرح رسائل و جرائد میں تاریخ کے موضوع پر لکھنے والے بہت سے وہ لوگ بھی اسی طریقۂ تحقیق کے دلدادہ نظر آتے ہیں جن کے نام اگرچہ مسلمانوں جیسے ہیں لیکن ان کا فکری ہیولیٰ انہی مستشرقین کا تیار کردہ ہے۔ کاش یہ حضرات تھوڑی سی توجہ اس پر صرف کرتے کہ تاریخ نویسی کا حق ادا کرنے کے لئے صرف کسی کتاب سے کسی واقعہ کا نقل کر دینا کافی نہیں بلکہ اس کا ایسا تجزیہ اور ایسی تحقیق و تنقید بھی ضروری ہے جس سے وہ چیز اس دور کے مجموعی مزاج سے ہم آہنگ ہو جائے۔ قرون اولیٰ کی تاریخ کے سلسلے میں تو خاص طور پر اس پہلو کی رعایت ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے جب کہ تاریخ نویسی کا فن اپنے ابتدائی مرحلے میں تھا، اور واقعات کی تحقیق اور ان کے تجزیہ کا انداز ابھی عام

نہیں ہوا تھا۔

مثال کے طور پر تاریخ طبری ہی کو لے لیجئے جو ہمارے ابتدائی ادوار کی تاریخ کا اہم ترین مآخذ ہے اور جو شہرت و مقبولیت میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتی لیکن کیا ہے ہمیں اس میں ہر طرح کی روایتیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ اس لئے کہ اس دور میں تاریخ نویسی کا سب سے بڑا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ ایک واقعہ کے ضمن میں آدمی تمام باتیں اکٹھی کر دے اور کوئی چیز چھوٹنے نہ پائے۔ واقعات کی روایت کرنے والوں کی جانچ پرکھ اور خود ان واقعات کی صداقت و حقانیت کی تحقیق و تفتیش کا رواج اس وقت تک عام نہیں ہوا تھا چنانچہ جس شخص کو بھی کوئی قابل ذکر واقعہ یا بات معلوم ہوتی وہ اس کے بیان کرنے والے کی طرف اس کا انتساب کر کے اسے نقل کر دیتا قطع نظر اس کے کہ وہ روایت کرنے والا شخص کیسا ہے۔ سچا اور قابل اعتماد ہے یا ضعیف، متہم اور متروک۔ اس چیز کا محرک صرف ان حضرات کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ ایک واقعہ کے تمام اطراف و جوانب کا احاطہ کر لینا چاہیے ایسا نہ ہو کہ کوئی بات چھوٹ جائے اور اس طرح کوئی حصہ علم زیاں کا شکار ہو کر رہ جائے۔ ہمارے دور کے فاضل یگانہ سید محب الدین خطیب نے اس سلسلے میں بڑی پتے کی بات کہی ہے وہ فرماتے ہیں" علامہ طبری اور ان کے دور کے دوسرے بہت سے علماء جو ایک واقعہ کے ضمن میں صحیح اور ضعیف ہر طرح کی روایتیں جمع کر دینے کے عادی تھے، ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کہ ہمارے زمانہ کے بہت سے لوگ کہ جب وہ کسی مسئلہ سے بحث کرتے ہیں تو اس کے متعلق جو چیز بھی انھیں ہاتھ لگتی ہے اسے جمع کر دیتے ہیں اور اس کے تمام امکانی دلائل و شواہد کو یکجا کرنا ضروری خیال کرتے ہیں حالانکہ ان میں بہت سی چیزوں کی

کمزوری اور بودے پن کا خود انھیں بھی احساس ہوتا ہے۔ لیکن ایسا وہ محض اس توقع پر کرتے ہیں کہ باتیں جو کچھ کہی گئی ہیں سب سامنے آجائیں، دلائل کی کمزوری اور مضبوطی کا فیصلہ لوگ اپنے اپنے طور پر کرتے رہیں گے۔"[1] کمزور اور مجروح قسم کے افراد سے روایت کرنے کے سلسلے میں علامہ طبری اور ان جیسے اہل علم کی ایک مجبوری تو یہ ہے۔ اس کے علاوہ طبری کے سلسلے میں دو مجبوریوں کی اور نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

پہلی چیز تو یہ کہ چونکہ وہ واقعات کو پورے سلسلۂ سند کے ساتھ بیان کردیتے ہیں اس لئے خیال یہ ہوتا ہوگا کہ جب ان کی سند بیان کردی ہے تو خود بری الذمہ ہیں، معاملے کی تمامتر ذمہ داری ان روایت کرنے والوں پر عائد ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ان حضرات کے یہاں یہ قول مشہور تھا کہ: من اسند فقد حمل، یعنی جس نے سند بیان کردی اس نے اب ذمہ داری تمہارے سر ڈال دی کہ اس سند کی صحت و عدم صحت کی جانچ کر کے اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرو۔ ان حضرات کے زمانے کی حد تک تو یہ بات درست ہوسکتی ہے اس لئے کہ اس وقت ایسے علماء کثرت سے موجود تھے جو سندوں کی جانچ پرکھ اور ان کی صحت و عدم صحت کے سلسلے میں فیصلہ کرنے کی بھرپور صلاحیت سے مالامال تھے۔ (البتہ موجودہ زمانہ کے لئے یہ چیز بہرحال دشواریاں پیدا کرنے والی ہے)

اسی وجہ سے علامہ موصوف اپنی تاریخ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

"اگر میری اس کتاب میں پڑھنے والے کو کوئی ایسی چیز ملے جو اسے ناقابل قبول نظر آئے اور اسے دیکھ کر اس کی طبیعت ابا محسوس کرے اور بات اسے کسی صورت

---

[1] ملاحظہ ہو: مجلۃ الازہر جلد ۲۴۔ صفر ۱۳۷۲ھ میں موصوف کا مقالہ بعنوان "المراجع الاولی فی تاریخنا"

سے درست معلوم نہ ہو اور وہ اس کی کوئی معقول توجیہ نہ کرسکے تو سمجھنا چاہئے کہ یہ چیز ہماری طرف سے نہیں بلکہ اس کی ذمہ داری ہم تک اسے نقل کرنے والوں میں سے کسی پر جاتی ہے۔ ہم نے صرف یہ کیا ہے کہ بات جس طرح ہم تک پہنچی اسے جوں کا توں بیان کردیا ہے۔"

اس طرح علامہ موصوف اس کی تمامتر ذمہ داری راویوں پر ڈال دیتے ہیں، دوسرے لفظوں میں آپ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اب یہ اس کتاب کے مطالعہ کرنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان روایت کرنے والوں کی جانچ پرکھ اور خود ان کے روایت کردہ واقعات کی تحقیق و تفتیش کا بیڑہ اٹھائیں۔ اور دوسرے مآخذ سے رجوع کر کے اپنے طور پر ان کے سلسلے میں کوئی رائے بنانے کی کوشش کریں جس کے نتیجے میں وہ بہت سے روایت کرنے والوں کو پہلی نظر ہی میں ساقط الاعتبار قرار پائیں گے، دوسرے لوگ وہ ہوں گے جن کے سلسلے میں دونوں طرح کی باتیں کہی گئی ہوں گی۔ یعنی کچھ لوگوں نے توان کی توثیق کی ہوگی دوسرے لوگوں نے انھیں ضعیف قرار دیا ہوگا۔ البتہ انھیں میں ایک طبقہ قابل اعتماد اور ثقہ لوگوں کا بھی ضرور ملے گا جن کی روایت کردہ چیزیں اس کی مستحق کہ انھیں قبولیت کے اعلیٰ مقام پر رکھا جائے۔

مثال کے طور پر طبری کے رواۃ میں سے ایک محمد بن اسحاق ہیں جن کی سیرت پر سب سے پہلی کتاب ہے۔ لیکن معلوم ہے کہ امام مالک کی رائے ان کے بارے میں اچھی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جن لوگوں نے انھیں ثقہ قرار دیا بھی ہے انھوں نے ان کی تمام مرویات کو قابل قبول نہیں سمجھا ہے۔ ان کے سلسلے میں ایک دوسری بڑی کمی اس سے بھی پیدا ہوگئی کہ جن لوگوں نے بعد میں ان سے روایت کیا وہ ان سے بھی زیادہ

کمزور اور گئے گزرے تھے۔

یہی حال ان کے دوسرے راوی واقدی کا ہے کہ محدثین کی ایک بڑی جماعت نے اسے 'کاذب' قرار دیا ہے۔ اور اگر کچھ لوگوں نے ان کو قابل قبول سمجھا بھی ہے تو کچھ شرطوں کے ساتھ۔ علی الاطلاق کسی نے بھی انھیں سند قبول عطا نہیں کی ہے۔ یہی حال ہشام بن محمد کلبی اور ان کے والد کا بھی ہے کہ ان دونوں پر 'کذب' کا الزام ہے۔ اسی طرح سیف بن عمر تمیمی حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ اور ثقہ راویوں کے حوالہ سے ان من گھڑت حدیثوں کو روایت کرتا تھا۔ کچھ لوگوں نے تو اس کے اوپر 'بے دینی' کا الزام بھی لگایا ہے۔

اور کمزور اور ضعیف تو ایک سے زیادہ لوگوں نے قرار دیا ہے۔ ابو مخنف لوط بن یحییٰ ازدی کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی اس کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ اخباری ہے، اس کی روایت کردہ کسی چیز پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ابو حاتم وغیرہ نے اس کو 'متروک' قرار دیا ہے۔ اور حافظ معین کہتے ہیں کہ: یہ بھروسہ کے قابل نہیں۔ دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: اس کی روایت کردہ کوئی چیز کسی بھی درجہ میں قابل اعتبار نہیں۔ ابن عدی فرماتے ہیں کہ: یہ غالی شیعہ ہے، اور بس انھیں کے مطلب کی روایتیں بیان کرتا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں جن کو ائمہ حدیث نے 'مجروح' اور 'متروک' قرار دیا ہے۔ اس لئے حدیث کے ذیل میں ان کی روایتیں قابل اعتبار نہیں البتہ تاریخ کے سلسلے میں لوگ ان سے نقل کرنے کو جائز قرار دیتے ہیں اور ان کی روایات پر اعتماد کرنے کو چنداں قابل اعتراض تصور نہیں کرتے۔

البتہ محققین اس طرح کے 'اخباری لوگوں' کی روایات کو کہیں بھی وزن دینے کو تیار نہیں۔ نہ ان کی روایات پر اعتماد کرنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ بلکہ وہ مورخین جن کی کتابوں کو اعتبار کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اگر ان کے یہاں بھی اس طرح کے لوگوں کی روایت سے کچھ چیزیں آجاتی ہیں تو یہ حضرات اس پر اپنی زبان اعتراض کھولے بغیر نہیں رہتے اور کھلے لفظوں میں اسے ان کی کمزوری قرار دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر علامہ نووی اپنی کتاب 'تقریب' میں علامہ ابن عبد البر کی شاہکار تصنیف 'الاستیعاب' کے متعلق کہتے ہیں کہ: "حضرات صحابہ کرام کے حالات میں اس سے بہتر اور اس سے زیادہ افادیت کی حامل کوئی دوسری کتاب نہیں لکھی گئی۔ بس افسوس اس کا ہے کہ ان حضرات گرامی کے مشاجرات کے سلسلے میں 'اخباری طرز کے لوگوں' کی بھی بہت سی روایتیں آگئی ہیں۔"

علامہ سیوطی اس کی توضیح میں فرماتے ہیں: "ان حضرات کے یہاں عام طور پر روایات کی بہتات ہو جاتی ہے اور چیزوں کے ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہونے سے بچانے میں کامیاب نہیں ہو پاتے ہیں۔"[1]

دوسری چیز جس کی وجہ سے طبری نے اپنی تاریخ میں روایتوں کی جانچ پرکھ کے سلسلے میں زیادہ سختی سے کام نہیں لیا وہ شاید یہ ہوگی کہ معاملہ تاریخ کا ہے اس لئے اگر اس میں کوئی کمزور اور موضوع روایت درج بھی ہو جاتی ہے تو چنداں مضائقہ نہیں کہ اس سے کسی حکم شرعی کا اثبات مقصود نہیں کہ کوئی چیز حلال قرار پائے اور کوئی چیز حرام

---

[1] ملاحظہ ہو: التدریب علی التقریب ۲/ ۲۰۷

بن جائے۔ اسی طرح کسی چیز کے وجوب اور فرضیت وغیرہ کے مسائل بھی اس سے متعلق نہیں ہیں کہ اسے بالکل فقہی مسئلہ بنا کر اس حیثیت سے اس سے بحث کی جائے۔ نہ تو اس سے قرآن کریم کی کسی آیت کی تفسیر یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث کی تشریح ہی ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جس کا اہتمام تفسیر اور حدیث کے موضوعات میں ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیں اس پر چنداں تعجب کی ضرورت نہیں کہ امام طبری جو مفسرین کے سرخیل اور حدیث کے سلسلے میں بھی انتہائی بلند مقام رکھتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ فقہ کے اندر بھی انھیں اچھا خاصا دسترس حاصل ہے اور اس کے سلسلے میں ان کی رائیں کافی وزن رکھتی ہیں یہاں تک کہ ان کے بعد کافی عرصہ تک ایک الگ مکتب فکر کی حیثیت سے ان کی فقہی آراء پر عمل بھی ہوتا رہا ہے، بہر حال ان تینوں ہی علوم کے سلسلے میں وہ کافی باریک بینی سے کام لینے اور تحقیق و تفتیش کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اگر تاریخ کے سلسلے میں وہ نسبتہ سہل انگاری کا مظاہرہ کرتے ہیں تو اس کے لئے وجہ جواز ان کی اس تحریر میں موجود ہے کہ "اس کتاب کا مقصد تصنیف یہ ہے ہی کب کہ اس سے کسی شرعی مسئلہ میں حجت پکڑی جائے"۔

بہر حال امام موصوف نے یہ فرما کر عند اللہ تو اپنی برأت کا سامان کر لیا لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کی اس سہل نگاری نے اسلام کے ابتدائی ادوار کی تصویر بگاڑنے میں خاصا بڑا کردار ادا کیا ہے۔ جس کا نتیجہ ہوا کہ دور اول کے واقعات کی روایت کرنے والوں کے سلسلے میں لوگوں کی رائیں اچھی نہیں رہ گئیں۔ اور بعد کے لوگوں کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں رہا کہ وہ معذرتوں پر معذرتیں کئے چلے جائیں۔ اس لئے

کہ جب ایک بار کسی چیز کا سلسلہ چل پڑنے تو کوشش کے باوجود اس کے رکنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا ہے۔ پس جس طرح علامہ موصوف نے اپنے پیش روؤں سے روایتیں اخذ کیں اور انھیں بعد والوں کے لئے بیان کیا اسی طرح ان لوگوں نے اپنے بعد والوں کے لئے ان روایتوں کو قبول عام عطا کرنے اور ان کو نقل کرنے کا سلسلہ قائم کر دیا۔ چنانچہ بعد میں ہم دیکھتے ہیں کہ ابن اثیر، ابوالفداء اور ابن کثیر وغیرہ بے شمار مورخین انہی طبری پر اعتماد کرتے ہوئے اپنی کتابوں میں بے تکلف اس طرح کی تمام رطب و یابس کو نقل کرتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بات ہمارے اس زمانے تک پہنچی ہے جب کہ مستشرق حضرات اور مغربی ارباب قلم اور ان کے خوشہ چیں میدان میں آتے ہیں۔ اور اس طرح کی چیزوں کو ایک ایک کر کے ڈھونڈتے اور سامنے لاتے ہیں اور پھر ان کتابوں کے حوالہ سے اسے علم و تحقیق کا لبادہ اوڑھا کر اس کے پردے میں اپنی یاوہ گوئیوں کا ایک طومار کھڑا کر دیتے ہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ معاملہ یک طرفہ نہیں رہا۔ امت میں کچھ شخصیتیں ایسی بھی پیدا ہوئیں جنھوں نے اس خلاء کو پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر قاضی ابوبکر بن عربی جنھوں نے اپنی شاہکار تصنیف "العواصم من القواصم" میں حضرات صحابہ کرامؓ کی برگزیدہ شخصیتوں کے دفاع اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد ان کی مثالی زندگیوں اور مثالی کردار کی نقاب کشائی اور ان کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ موصوف کی یہ کتاب علمیت کی شاہکار، تلاش و تحقیق کا بہترین نمونہ اور تاریخ کے معروضی مطالعہ کی ایک تابندہ مثال ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ کے حالات سے متعلق اس کا حصہ الگ بھی کتابی صورت میں آگیا ہے جسے علامہ سید محب الدین خطیب نے بڑے اہتمام کے ساتھ ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے اور اس پر اپنے فاضلانہ حواشی اور تحقیقی نوٹس

بھی لکھے ہیں۔

یہ تو خیر تاریخ کے سلسلے میں تدوین کی گڑبڑی تھی جس کی وجہ سے اس کا چہرہ مسخ ہوتا اور حقائق پر پردہ پڑجاتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ ایک دوسری چیز بھی ہے جو تاریخ کا چہرہ بگاڑنے کے سلسلے میں، خاص طور پر موجودہ دور کے سیاق میں خاصا اہم کردار ادا کرتی ہے اور وہ ہے تاریخ کی تعبیر اور ایک خاص زاویے سے اس کی تشریح و تفسیر۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف گروہوں کے جذبات و میلانات، عصبیتوں اور فکری رجحانا کے زیر اثر تاریخ کی تفسیر اور اس کے واقعات کی توجیہ عمل میں آتی ہے۔ ظاہر ہے اسلامی تاریخ اس صورت حال سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی ہے۔ چنانچہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ مختلف حلقوں کی طرف سے وہ باقاعدہ اس حملے کی لپیٹ میں ہے

مغربی ارباب قلم کو دیکھئے وہ تاریخ اسلامی کے چہرے کو کس قدر مسخ کرکے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام، اس کے لانے والے پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جاں نثار ساتھیوں کے سلسلے میں انھوں نے پہلے سے ایک سوچی سمجھی رائے بنا رکھی ہے، چنانچہ تاریخی واقعات کو وہ ایک خاص رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس سے ان کا مقصود اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو متہم کرنے کے سوا نہیں ہوتا۔ ان کے حلق سے یہ بات کسی طرح نیچے نہیں اترتی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں۔ دین اسلام خدا کا آخری پسند کردہ دین ہے۔ اسی طرح حضرات صحابہ کرامؓ کے پاکباز گروہ کو یہ لوگ عام دنیا داروں اور جاہ و اقتدار کے متوالوں سے زیادہ کوئی حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں۔ ظاہر ہے جب ان حضرات گرامی کے سلسلے میں ان کی یہ رائے ہے تو بعد کے لوگوں کے سلسلے میں یہ لوگ کیا کچھ

نہیں کہتے ہوں گے؟

بات یہ ہے کہ یہ لوگ تعصب کے اندھے پن کا شکار ہیں۔ ان کے نزدیک اصلاً خدائی دین ہونے کی حیثیت یہودیت اور عیسائیت کو حاصل ہے۔ اسلام کو تو یہ لوگ پناہ بخدا صرف ان دونوں مذاہب کی بگڑی ہوئی صورت خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر تاریخ کو کچھ دینے کی صلاحیت ہے تو وہ صرف اہل یورپ کا حصہ ہے۔ دنیا کی عظیم ترین تہذیبیں یونان اور روم کی ہیں اور یہ لوگ اس کے وارث ہیں۔ اب اسلام کے نام لیواؤں کی حیثیت اس کے سوا اور کیا رہ جاتی ہے کہ وہ ان کی حاشیہ برداری کریں اور زندگی کے ہر میدان میں ان کے نقش قدم کی پیروی کو اپنے لئے سرمایۂ افتخار تصور کریں۔ وغیرہ وغیرہ

اپنی ان مذموم کوششوں کو بارآور بنانے کے لئے تاریخ اسلامی کے وہ اہم اجزاً تو ان کی نگاہوں سے اوجھل رہ جاتے ہیں جن کے نتیجے میں تہذیبوں کی کایا پلٹ ہوگئی اور انسانی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا، البتہ اس تاریخ کے بعض بالکل ہی ناقابل لحاظ واقعات کو وہ رائی کا پہاڑ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ صحیح تاریخ اور اس کے مستند واقعات ان کو راس ہی نہیں آتے۔ ان کی نگاہ انتخاب اگر پڑتی ہے تو بے سروپا اور بے اصل واقعات پر جس کے لئے 'اغانی' جیسی افسانوی رنگ کی حامل کتاب بھی ان کے نزدیک اسلامی تاریخ کا مستند ترین مآخذ قرار پائی ہے۔ پھر انھی واقعات کو وہ ایک خاص انداز سے ترتیب دیتے ہیں اور انھیں اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں جس سے اسلام، پیغمبر اسلامؐ اور اس کی نام لیوا امت کی تصویر زیادہ سے زیادہ بگاڑ کر پیش کی جا سکے اور انھیں زیادہ سے زیادہ بدنام کیا جائے۔

ایک طرف یہ لوگ ہیں دوسری طرف اشتراکی حضرات ہیں جو مارکسی فلسفہ کے مطابق تاریخ کی مادی اور طبقاتی تشریح پیش کرتے ہیں۔ اور پھر اسلامی تاریخ کو بھی وہ اسی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتے ہیں اس کے لئے وہ اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کرتے، بات کو خوب نمک مرچ لگا کر پیش کرتے اور پھر واقعات پر وہ رنگ چڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جسے وہ کسی بھی صورت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ صحابہ کرام رضؓ کے گروہ قدسی کو یہ لوگ دائیں اور بائیں بازو میں تقسیم کرتے اور پھر ان کے درمیان ایک موہوم طبقاتی کشمکش کی جلوہ نمائی کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ بہت سے مسلمان ارباب قلم بھی ان کی اس زہر افشانی سے متاثر ہو کر قرون اولیٰ کی تاریخ اور اس کی ممتاز شخصیتوں کو اسی رنگ میں پیش کرنا چاہتے ہیں جس کا آج کی رسوائے زمانہ سیاست میں ہر جگہ چرچا ہے اور صبح سے شام تک جس سے وہ خود اپنے کو دوچار پاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک حضرت عمرؓ اور حضرت خالدؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ، اور حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ وغیرہ کے باہمی تعلقات کی نوعیت معاذ اللہ اس سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی جس کا مظاہرہ ہم آج کے سیاسی طالع آزماؤں اور خوف خدا سے عاری دنیا پرست ارباب اقتدار کے یہاں دیکھتے ہیں۔ اس پس منظر میں ان حضرات صحابہ کرامؓ کے حالات اور ان کے واقعات زندگی کو یہ لوگ خوب رنگ آمیزی اور رائی کا پہاڑ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ جب چمن زار انسانیت کے ان گلہائے سرسبد کی یہ کم نصیب لوگ اس بھونڈی صورت میں رونمائی کرتے ہیں جب کہ چشم فلک کو آج تک ان کا مثل دیکھنا نصیب نہ ہوا تو بعد کی تاریخ اور بعد کے لوگوں کے سلسلے میں یہ لوگ جو کچھ بھی کر جائیں کم ہی ہے۔

اسی طرح عرب قومیت کے علمبردار حضرات اسلامی تاریخ کو عرب قومیت کے رنگ میں رنگ کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام ان کی نظر میں سرزمین عرب سے اٹھنے والی ایک انقلابی تحریک اور ایک فکری چھلانگ تھی جس کا خمیر خالص عرب قوم اور عرب قومیت سے تیار ہوا تھا۔ اسی طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ایک خالص قومی رہنما اور قومی ہیرو تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ کے ہاتھوں جو کارنامے انجام پائے اس سے پوری دنیائے انسانیت فیض یاب ہوئی۔ اس کے بعد اگر تاریخ اسلامی کی عظیم شخصیتوں امت کے بڑے بڑے علماء اور اس کی عظیم ہستیوں "کو خالص عربی شخصیتیں" بنا کر اسی طرح "اسلامی تہذیب" کو "عرب تہذیب" کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے تو اس پر ہمیں تعجب کا کوئی موقعہ نہیں ہے لیکن یہ ان حضرات کی کج فہمی اور کم ظرفی ہے ورنہ اسلام کی برپا کردہ یہ تہذیب 'عربی تہذیب' نہیں بلکہ 'اسلامی تہذیب' ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد، اس کی ہیئت ترکیبی، اس کی نمائندہ اقدار یہ سب کی سب اسلام کی عکاسی کرنے والی اور اس کے چشمہ صافی سے سیراب ہونے والی ہیں۔ اس تہذیب کو برپا کرنے کے محرکات اور اس کے اسباب و عوامل ان سب کا سر رشتہ اسلام اور جذبۂ اسلامی سے جڑا ہوا ہے۔ پھر وہ عناصر ترکیبی جو اس کی تشکیل میں ممد و معاون ہوئے اور جن کے نتیجے ہی میں اس مرغ ہمیں کو بال و پر نکالنے کا موقعہ ملا، ان میں سے ہر چیز اسلام اور فلسفۂ اسلام کی نمائندگی کرنے والی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب کا دائرہ صرف عربوں تک محدود نہیں رہا بلکہ اس کا حلقہ اثر کرہ ارضی کے ایک عظیم حصے تک وسیع ہوا اور مختلف رنگوں اور مختلف قومیتوں کے لوگوں نے اسے خوش آمدید کہنے کو اپنے کو آمادہ پایا۔ آخر آج اگر طنجہ

سے لے کر جکارتہ تک انسانوں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اسلام سے اپنی وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہے تو کیا یہ چیز عرب قومیت کے علمبرداروں کی لاف زنی کا کرشمہ ہے۔ ہرگز نہیں ان کی وفاداری بے آمیز طریقے پر اسلام اور صرف اسلام سے ہے۔ جس کے لئے انھیں کسی وسیلے اور واسطے کی احتیاج نہیں۔

قومیت ووطنیت کے اس غیر اسلامی نقشے سے ہٹ کر جہاں تک اسلامی تاریخ کی تشکیل میں عربوں کے امتیازی کا کردار کا سوال ہے تو یہ وہ حقیقت ہے جس کا کوئی انصاف پسند انکار نہیں کر سکتا۔ اسلام کے لئے ان کی قربانیاں بے مثال ہیں۔ انہی کی بدولت دورِ اوّل میں اسلام کو دنیا میں قدم جمانے کا موقعہ ملا۔ اور دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک اس کا دائرہ وسیع ہوا۔ اس کے علاوہ دنیائے انسانیت کو قرآن وسنت کی صورت میں جو عظیم دولت ملی اس کا واسطہ یہی عرب قوم بنی۔ پھر یہی قوم ہے جس کی طرف آخری نبی کی بعثت کے لئے حق تعالیٰ کی نگاہ انتخاب پڑی۔ اسی کی زبان میں قرآن حکیم کا نزول ہوا جس سے قیامت تک کے لئے انسانیت کی تقدیر وابستہ ہے۔ عرب ہی کی سرزمین ہے جس میں اللہ کا پاک گھر ہے اور یہی سرزمین ہے جس میں ہمارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی ابدی خواب گاہ ہے، جہانِ خدا جس سے بڑھ کر روئے زمین پر تقدس واحترام کی کوئی جگہ نہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ اہل عرب اور سرزمین عرب کی یہ فضیلت ایک الگ چیز ہے، اور اسے عرب قومیت اور عرب وطنیت کا رنگ دے کر پیش کرنا ایک بالکل ہی دوسری بات ہے۔

ادبی ثقافت

دین کے ایک داعی کے لئے جہاں اس بات کی اہمیت ہے کہ اس کا دین کا اچھا مطالعہ ہو اور اس سے متعلق علوم پر فی الجملہ اس کی نظر ہو، جیسا کہ اس کی تفصیل اس سے پہلے گذر چکی ہے، اسی طرح اس کے لئے یہ بات بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ زبان وادب پر اس کی اچھی نگاہ ہو اور اس کی باریکیوں اور نزاکتوں کا وہ لذت آشنا ہو۔ اگر اوّل الذکر چیز داعی کے لئے مقصود ومطلوب کا درجہ رکھتی ہے تو یہ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس طور پر کہ اس کے بغیر اس مقصود ومطلوب کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ زبان وادب کی اسی گہری واقفیت کے لئے ہم ادبی ثقافت کی اصطلاح استعمال کر رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ کسی زبان کے معلومات کا صرف یہ مطلب نہیں ہوتا کہ آدمی کو کسی طرح اس میں لکھنا بولنا آجائے۔ زبان کا واقف کار آدمی اسی وقت ہونے کا مستحق ہوتا ہے جب کہ وہ اس کے نوک پلک سے اچھی طرح واقف ہو اور اس کی باریکیوں پر اس کی نظر ہو .... بلکہ سچی بات یہ ہے کہ آدمی جس زبان کو بھی اپنے اظہار خیال اور تقریر وتحریر کا ذریعہ بنائے اس کا حق وہ اس وقت

تک ادا نہیں کرسکتا جب تک اس کی نظم و نثر کا ایک اچھا ذخیرہ اس کے نوک زبان نہ ہو۔ بحل اشعار، اچھے نثر نگاروں کے منتخب جملے، امثال وحکایات، ادبی شہ پارے، حکمت ونصیحت پر مشتمل اچھے جملے اور اچھے ٹکڑے، بڑے لوگوں کے یادگار فقرے، اچھے خطیبوں کی اثر انگیز اور چبھتی ہوئی چیزیں، عمدہ محاورے اور عمدہ تشبیہیں، یہ سبھی چیزیں زبان وادب کے پہلو سے ایک داعی کے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس پہلو سے تیاری کے ساتھ داعی جب میدان میں آئے گا تو اس کی بات ہی اور ہوگی۔ تقریر یا تحریر جس صورت میں بھی وہ لوگوں کے سامنے اپنی بات پیش کرے گا، اس کا اثر ضرور نمایاں ہوگا۔ وہ ان کے دل کو گرمائے گی اور ان کی طبیعت میں اہتزاز پیدا کرے گی۔ وہ اس پر سوچنے کے لئے مجبور ہوں گے۔ اور پھر یہی چیز ان کے لئے حرکت وعمل کا پیش خیمہ بن جائے گی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث ذیل میں زبان وادب کی اسی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے:

اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ سِحْرًا، وَاِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِكَمًا[1]	بہتیرا کلام جادو کی تاثیر رکھتا ہے اور کتنے ہی اشعار ہیں جن میں حکمت کے خزانے بھرے ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ ثابت ہے کہ ایک سے زیادہ شاعروں کا کلام آپ نے سنا، ان کی تعریف کی اور ان سے مزید اشعار کی فرمائش کی۔ حضرات صحابہ کرامؓ کے اندر بڑے پائے کے شعرا موجود تھے۔ مثال کے طور پر حضرت حسان بن ثابتؓ، کعب بن مالکؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ انصاری وغیرہ۔ حضرت حسانؓ کو تو آپ نے خاص طور پر اس کی اجازت دے رکھی تھی کہ وہ اپنی شعر گوئی سے اسلام کا دفاع کریں۔ چنانچہ وہ شعرائے قریش کی ہجو کا مسلمانوں کی طرف سے ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے۔ دین کے اندر اس سے بڑھ کر اس کی اہمیت اور پسندیدگی کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپؐ

---

[1] احمد وابوداؤد عن ابن عباس باسناد صحیح

نے ان سے خطاب کر کے فرمایا: "ان کی ہجو کے جواب میں تم بھی ان کی اچھی طرح ہجو کرو، تمہاری مدد کے لئے فرشتہ تمہارے ساتھ ہے"۔

ادب کی کتابوں میں حضرت خلفائے راشدینؓ کے سلسلے میں بھی شعر گوئی کی روایات موجود ہیں۔ خاص طور پر حضرت علیؓ سے تو بکثرت اشعار مروی ہیں، زبان وادب کے پہلو سے ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ اور انھیں شعری ادب کے بہترین نمونوں کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ دیگر حضرات کے سلسلے میں بھی خاصی بڑی تعداد میں اشعار کی روایت کی گئی ہے۔ بعض حضرات اگر اشعار کہتے نہیں تھے تو دوسروں کے اشعار کا انھیں اچھا بڑا ذخیرہ محفوظ تھا جن کی وہ خود روایت کرتے اور دوسروں کو بھی ان کی روایت کی ترغیب دیتے تھے۔ خاص طور پر حضرت عمرؓ تو لوگوں کو باقاعدہ اس کی تاکید کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا مشہور قول ہے:

علموا ابناءكم السباحة والرماية و ركوب الخيل ورووهم ما يجمل من الشعر۔	اپنے بچوں کو تیراکی، تیر اندازی اور گھوڑ سواری کا فن سکھاؤ، اور انھیں عمدہ اشعار یاد کراؤ۔

اسی طرح حضرت عائشہ فرماتی ہیں:

رووا اولادكم الشعر تعذب السنتهم۔	اپنے بچوں کو اشعار یاد کراؤ ان کی زبان میں مٹھاس آجائے گا۔

انھیں اشعار کثرت سے یاد تھے۔ مقداد بن اسود کا بیان ہے کہ میں نے پورے گروہ صحابہؓ میں شعر وسخن اور علم فرائض سے واقفیت رکھنے والا حضرت عائشہؓ سے بڑھ کر نہیں دیکھا۔ ابن ابی ملیکہ کا بیان ہے کہ آپ لبید کا یہ شعر اکثر پڑھا کرتی تھیں:

ذهب الذين يعاش في اكنافهم	وبقيت في خلف كجلد الاجرب
وہ لوگ دنیا سے جاچکے جن کے پہلو میں زندگی کا لطف تھا	البتہ ہم خارشتی اونٹ کے مانند پیچھے رہ گئے

اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتیں کہ اللہ بھلا کرے لبید کا۔ اس نے اپنے زمانہ کے لیے یہ شعر کہا تھا۔ اگر آج وہ ہمارے دور کے حالات دیکھتا تو نہ جانے اپنے اس تاثر کو کس صورت میں پیش کرتا؟ فرماتیں کہ مجھے لبید کے تقریباً ایک ہزار اشعار یاد ہیں۔ اور یہ تو کم ہے دوسروں کے اشعار مجھے اس سے بھی زیادہ ازبر ہیں۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو بھی بکثرت اشعار یاد تھے۔ یہاں تک کہ بیان کیا جاتا ہے کہ انھیں عمر بن ربیعہ کا طویل ترین قصیدہ پورا کا پورا ازبر تھا۔ قرآن کریم کی تفسیر بیان کرتے ہوئے وہ اشعار عرب سے بکثرت استدلال کرتے۔ جیسا کہ نافع ازرق کے ساتھ ان کے مکالمے سے واضح ہے (جسے سیوطی نے الاتقان میں نقل کر دیا ہے[1])

اسی طرح امام شعبیؒ جو مشہور تابعی ہیں، فرمایا کرتے تھے کہ تمام دوسرے علوم کے بالمقابل مجھے اشعار سب سے کم یاد ہیں اور میں سب سے کم ان کی روایت کرنے والا ہوں۔ اس کے باوجود اگر چاہوں تو مہینہ بھر اشعار گنگناتا رہوں۔ اس طور پر کہ ایک بار جس شعر کو پڑھوں دوبارہ اسے دھرانے کی نوبت نہ آئے۔

ظاہر ہے ان اسلاف کرام کو زبان و ادب اور اشعار سے دلچسپی کی وجہ اس کے سوا دوسری نہ تھی کہ وہ اسے ایک دینی ضرورت خیال کرتے تھے۔ اور کیوں نہ ہو جب کہ خدائے عزوجل نے اپنے کلام مبارک میں اس کا اہتمام فرمایا ہے۔ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اثبات کے سلسلے میں اپنا سب سے اہم معجزہ قرار دیا۔ جب کہ اس کا نمایاں ترین عنصر اس کی ادبیت اور اس کی فصاحت و بلاغت تھی۔ جس کی تاثیر کا یہ عالم تھا کہ اپنوں کو چھوڑیئے اغیار کو اس کا لوہا ماننے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ یقیناً دین اور دعوت دین کے سلسلے میں زبان و ادب کی اہمیت کے حق میں اس سے بڑھ کر دلیل کوئی دوسری نہیں ہو سکتی ہے۔

مثال کے ذریعہ یہ بات زیادہ بہتر طور پر واضح ہو سکے گی۔ دین میں صلہ رحمی اور عزیز و اقربا کے

---

[1] ملاحظہ ہو: الاتقان، جلد ۱ صفحات ۱۲۰ تا ۱۳۳ (مترجم)

کے حقوق کی اہمیت سے ہر شخص واقف ہے۔ اب فرض کیجئے کہ ایک شخص لوگوں کو اسلام کے اس حکم پر عمل کرنے اور اس کی اہمیت کو ان کے دلوں میں جاگزیں کرنا چاہتا ہے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس موضوع سے متعلق قرآن و حدیث میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے بالکل سادہ انداز میں لوگوں کے سامنے بیان کر دیا جائے۔ لیکن بات کا رنگ بدل جائے گا اور اس کی تاثیر میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا اگر اس کے ساتھ آپ ادب کی چاشنی شامل کر دیں اس سے متعلق کچھ ادبی شہ پاروں کو پیش کر سکیں، کچھ اشعار یاد ہوں جن سے اس موقعہ پر برمحل استدلال کر سکیں، تو آپ دیکھیں گے کہ بات کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے اور اس کی اثر انگیزی غیر معمولی طور پر بڑھ گئی ہے۔ بات صلہ رحمی کی چل رہی تھی۔ اس کے سلسلے میں حضرت علیؓ کے اس قول کو پڑھئے اور پھر اپنے دل کی کیفیت کا اندازہ لگایئے۔

اکرم عشیرتك، فانهم جناحك	اپنے خاندان کی عزت کرو کہ یہی وہ پر ہیں جن کی
الذی بہا تطیر، واصلك الذی	بدولت تیری قوت پرواز ہے اور یہی وہ تیرا اصل
الیه تصیر۔ الخ	ٹھکانا ہیں جن تک بہر حال تجھے پلٹ کر آنا ہے

معلقات کے مشہور شاعر طرفہ کا یہ شعر بھی آدمی کو کس قدر تڑپا دینے والا ہے:

وظلم ذوی القربی اشد مضاضة   علی المرء من وقع الحسام المهند

عزیزوں اور قرابت داروں کے ظلم و زیادتی سے پہنچنے والی تکلیف تیز ہندوستانی تلوار کی کاری ضرب سے بھی زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک دوسرا شاعر کہتا ہے:

اخاك اخاك ان من لا اخاله   کساع الی الهیجاء بغیر سلاح

خبردار اپنے بھائی سے چپٹے رہو اسے کبھی نہ چھوڑو اس لئے کہ جس کے بھائی نہیں وہ اس شخص کے مانند ہے جو میدان کارزار میں بغیر ہتھیار کے بھاگا جائے۔

وان ابن عم المرء فاعلم جناحهٗ — وهل ينهض البازی بغیر جناح

(اسی طرح، بھتیجے کو بھی نہیں چھوڑنا چاہئے اس لئے کہ وہ کسی انسان کا دست بازو ہے۔ بھلا بغیر شکرے کے پر کے باز اس کے اڑانے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟

اور پھر ذرا سینے پر ہاتھ رکھ کر ایک حماسی شاعر کے ان اشعار کو پڑھئے:

وان الذی بینی وبین بنی ابی — وبین بنی عمی لمختلف جدا

جو معاملہ میرا ہے اور جو میرے سوتیلے بھائیوں اور چچازاد بھائیوں کا میرے ساتھ ہے اس میں ذرا بھی جوڑ نہیں

اذا أکلوا لحمی وفرت لحومهم — وان هدموا مجدی بنیت لهم مجدا

اگر وہ میرا گوشت کھائیں تو کچھ پروا نہیں کہ، اس طرح میں ان کی فربہی میں اضافہ کا موجب ہوں گا، اگر وہ میری عزت و ناموس کو ڈھانا چاہیں تو میں ان کی عزت و ناموس کو بڑھانے کی فکر کروں گا۔

وان زجروا طیرا بنحس تمر بی — زجرت لهم طیرا تمر بهم سعدا

اسی طرح اگر وہ میرے لئے نحوست و بدبختی کی سبیل ڈھونڈیں تو میں ان کی خوش بختی و سعادت کا سامان کرونگا

ولا احمل الحقد القدیم علیهم — ولیس کبیر القوم من یحمل الحقدا

اور میں ان کے تئیں بھولی بسری دشمنی و عداوت کو ڈھوتے نہیں پھرتا۔ وہ آدمی قوم کا بڑا ہو بھی کیسے سکتا ہے جو دشمنی و عداوت کو ڈھوتا پھرے۔

اور آگے ان بلند جذبات سے اپنے کو سرشار کرتے چلئے جن سے لبریز ہو کر ایک دوسرا شاعر اس طرح نغمہ سرا ہوتا ہے:

قومی هم قتلوا امیم اخی — فاذا رمیت یصیبنی سهمی

یہ میری ہی قوم کے لوگ ہیں جنھوں نے میرے بھائی کا خون کیا ہے اب اگر ان پر انتقام کا تیر چلاتا ہوں تو وہ مجھے ہی لگتا ہے۔

فلئن عفوت لاعفون جللا — ولئن رمیت لاوهنن عظمی

اگر میں انھیں معاف کرنا چاہوں تو یہ ایک بڑے بھاری جرم کا معاف کرنا ہوگا، اور اگر انتقام لوں تو یہ چیز خود اپنے ہی کو کمزور کرنے کا ذریعہ بنے گی۔

بات اشعار ہی تک محدود نہیں زبان و ادب کی کتابوں میں ایسے بے شمار واقعات و حکایات اور بہترین گفتگوئیں اور دل کو لگنے والے فقرے اور جملے بھی بکثرت ملتے ہیں جو اپنے اندر پند و موعظت کا بڑا سامان رکھتے ہیں۔ آدمی اپنی سیرت و کردار کو سنوارنے اور اپنے اندر اعلیٰ جذبات اور اعلیٰ کیفیات کو پروان چڑھانے کے سلسلے میں ان سے بہت کچھ استفادہ کر سکتا ہے۔ ایک ذہین اور بیدار مغز داعی کو چاہئے کہ وہ اپنے مطالعہ کے دوران اس طرح کی چیزوں کو نوٹ کرتا رہے۔ اور انھیں اپنے حافظے میں ٹانکنے کی کوشش کرے۔ دعوتی کام کے سلسلے میں اس کے لئے یہ چیز بہت زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔

پھر اسی ادب لطیف کا ایک حصہ لطائف و ظرائف، تشبیہ و استعارات اور مجاز اور کنایہ وغیرہ بھی ہیں۔ اپنی دعوتی مہم میں داعی کو ان سے بھی بھرپور کام لینے کی ضرورت ہے جس طرح انسان کا جسم تھکتا ہے اس کے دل پر بھی ماندگی کے اثرات نمایاں ہوتے ہیں۔ ایسے مواقع کے لئے لطائف و ظرائف اور تشبیہ و استعارے جیسی چیزیں بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ اس سے ایک طرف تو دل کی ماندگی اور اکتاہٹ کے نشانات مٹتے ہیں، ساتھ ہی بات زیادہ موثر طریقے پر آدمی کے دل میں گھر کر جاتی ہے۔ بسا اوقات ایک ادبی لطیفہ یا ایک مختصر استعاراتی جملہ یا اس طرح کا کوئی شعر لمبے چوڑے وعظوں اور طول طویل تقریروں کا نعم البدل بن جاتا ہے۔

حضرت شبلیؒ کی مجلس میں ایک شخص آتا ہے۔ اور ان سے کچھ نصیحت کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ فرمایا میں تمہیں کیا نصیحت کروں۔ شاعر بہت پہلے اس شعر کے ذریعہ نصیحت کا حق ادا کر گیا ہے:

قالوا توق دیار الحی ان لهم — عینا علیك اذا نمت لم تنم

رکھتے ہیں محلے کی آبادی سے خوب بچ بچا کر نکلو اس لئے کہ لوگ تم پر ہر وقت آنکھ لگائے ہوئے ہیں، تم چاہے غفلت کا شکار ہو یہ نگاہیں اپنے کام پر لگی رہتی ہیں[1]۔

اسی طرح کبھی کبھی آدمی اپنے دلی جذبات کی ترجمانی ایسے اشعار کے ذریعہ کرتا ہے جو اگرچہ ظاہری عشق و محبت کے سلسلے میں کہے گئے ہوتے ہیں۔ لیکن موقعہ کی مناسبت سے ان کی تاثیر دو چند ہو جاتی ہے۔ ان اشعار کا پڑھنے والا خود بھی اپنے کو ایک بے پایاں لذت سے سرشار پاتا ہے اور دوسرے لوگوں کے دلوں میں بھی ان کی بدولت گرمی پیدا ہوتی اور محبوب حقیقی کی راہ میں اپنے کو فدا کرنے کا بے پایاں جذبہ بیدار ہوتا ہے۔

ابوفراس ہمدانی نے سیف الدولہ کو خطاب کرتے ہوئے جو خلیفۂ وقت ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا بھتیجا بھی ہوتا تھا درج ذیل اشعار کہے ہیں۔ اب اپنے محبوب حقیقی خداوند عزوجل کو اپنے تصور میں بٹھا کر ان اشعار کو پڑھئے۔ اور پھر دیکھئے کہ دل کی کیفیت کا کیا عالم ہے۔ اور ذہن و دماغ میں کیسی ہل چل پیدا ہوتی نظر آتی ہے:

فلیتک تحلو والحیاۃ مریرۃ ۔۔۔ ولیتک ترضی والانام غضاب

کاش کہ تو سراپا لذت و سرور ہوتا اور میری زندگی تلخیوں سے پر ہوتی۔ صرف تو راضی ہو جاتا اس کے بعد چاہے پوری دنیا ناراض ہوتی۔

---

[1] غالباً حضرت شبلیؒ اس شعر کے ذریعہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ آدمی کو اپنی دینداری اور خدا ترسی کا اندازہ کرنے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ سماج اس کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے۔ سوسائٹی ہر شخص کی ایک ایک ادا اور اس کی چھوٹی سے چھوٹی حرکت پر نگاہ رکھتی ہے۔ پس سماج کا یہ احتساب جس شخص کو کھرا ثابت کر دے، اور جو اس کی اس چھان پھٹک سے کامیاب نکل آئے سمجھنا چاہئے کہ وہ شخص کامیاب ہے۔ دیکھئے کیسی کڑی نصیحت ہے جسے موصوف نے ایک مختصر شعر میں سمیٹ کر گویا سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ واللہ اعلم (مترجم)

ولیت الذی بینی و بینک عامر ۔۔۔ و بینی و بین العالمین خراب

اور کاش کہ محبت و دوستی کا وہ رشتہ جو میرے اور تمہارے درمیان ہے سدا بہار ہوتا، اگرچہ بقیہ ساری دنیا کے ساتھ میرے تعلقات پژمردگی و اضمحلال کا شکار ہوتے۔

اذا صح منک الود یا غایۃ المنیٰ ۔۔۔ فکل الذی فوق التراب تراب

اے میری تمناؤں کے مرکز! اگر تجھ سے دوستی و محبت کا معاملہ درست ہے تو پھر اس مٹی (زمین) کے اوپر جو کچھ ہے سب مٹی (بے حقیقت) ہے مجھے ان کی کچھ پروا نہیں۔

انسانی ثقافت

اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ داعی کو ان علوم سے بھی یک گونہ واقفیت بہم پہنچانی ضروری ہے جنھیں آج انسانیات، (Humanities) یا سماجی علوم (Social Sciences) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر نفسیات، معاشیات، فلسفہ، علم الاخلاق (Ethics) اور تاریخ وغیرہ۔ تاریخ پر اس سے پہلے ہم الگ سے گفتگو کر چکے ہیں۔ اسلامی تاریخ کے تنقیدی مطالعہ کے سیاق میں داعی کے لئے یہ موضوع خصوصی اہمیت کا حامل بن جاتا ہے۔ اسی لئے ہم نے اس پر الگ سے گفتگو کرنے کو زیادہ مناسب خیال کیا۔

داعی کے لئے ان سماجی علوم سے فی الجملہ واقفیت کو جو ہم ضروری خیال کرتے ہیں تو اس کی کئی وجہیں ہیں۔

۱ - پہلی بات تو یہ کہ ان مضامین کا براہ راست دعوت کے موضوع سے تعلق ہے۔ اس لئے کہ جس طرح دعوت کا موضوع 'انسان اور اس کے مسائل' ہیں، یہ سارے مضامین بھی اسی موضوع سے بحث کرتے ہیں۔ انسان ماضی میں کیا تھا اور موجودہ دور میں اس کے کیا مسائل ہیں۔ انفرادی

دائرے میں اسے کن دشواریوں سے واسطہ ہے اور اجتماعی سطح پر وہ کن مسائل سے دوچار ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کا لائحہ عمل خود بنانا چاہیے یا اس دائرے میں اس کی عافیت دوسروں کے دکھائے راستے کی پیروی میں ہے۔ موجودہ دور میں انسان جس سمت میں پیش رفت کر رہا ہے وہ اس کے لئے ترقی کی راہ ہے یا ایسا کر کے وہ اپنی ہلاکت کا سامان کر رہا ہے۔ آج کی دنیا میں دیہاتی زندگی کے کیا مسائل ہیں اور شہری زندگی میں انسان کو کن مسائل سے واسطہ ہے؟ پڑھا لکھا انسان اپنے کو کن حالات میں گھرا ہوا محسوس کر رہا ہے اور ناخواندہ انسان کی کیا الجھنیں اور کیا پریشانیاں ہیں؟ بہر حال گروہ انسانی کے یہ مسائل جن کا تعلق سماجی علوم سے ہے، دعوت کے موضوع سے بھی یہ براہ راست متعلق ہیں۔

۲ - دوسری خاص بات یہ کہ ان علوم سے واقفیت بہم پہنچا کر ہی صحیح معنوں میں آج کے انسان کو سمجھا جا سکتا ہے اور ان لوگوں کے سلسلے میں تو یہ چیز بالکل ہی ناگزیر ہے جن کا مرجع و معول یہی علوم ہیں۔ ان کے افکار و خیالات انھی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کی شخصیت کے جزو لاینفک بن گئے ہیں۔ اور یہ بات ایک داعی کے فریضہ منصبی میں شامل ہے کہ وہ لوگوں کے ذہنی و فکری پیمانوں کو سامنے رکھ کر ان سے بات کرے، اور جس زبان میں وہ چیزوں کو سمجھنے اور سمجھانے کے عادی ہیں اسی زبان میں وہ ان سے گفتگو کرے۔ اسی صورت میں صحیح معنوں میں ان تک دعوت پہنچانے کا حق ادا ہو سکے گا اور یہ کہا جا سکے گا کہ داعی اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہے۔ یہ چیز اسی وقت ممکن ہے جب کہ دونوں کے درمیان قدیم و جدید کی کوئی خلیج حائل نہ ہو۔ ان جدید علوم اور قدیم دینی علوم کے درمیان بڑا فاصلہ ہے، داعی جب تک اس مسافت کو طے نہیں کر لیتا ہے وہ آج کے انسان کی ذہنی کیفیات اور نفسیاتی الجھنوں کی پوری رعایت کرتے ہوئے اسے متاثر کرنے اور اپنی بات کو پوری وضاحت کے ساتھ اس کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب نہیں

ہوسکتا ہے۔

۳۔ تیسری بات یہ کہ ان علوم نے دورِ جدید کی تہذیب و ثقافت پر غیر معمولی اثرات ڈالے ہیں، زندگی کے مختلف میدانوں میں جن کے نقصانات اور جن کے مسموم اثرات کو ہر شخص بادی النظر میں محسوس کر سکتا ہے۔ اس حملے کی زد سے آج کا ہر پڑھا لکھا انسان متاثر ہے۔ آپ کوئی بھی کتاب، اخبار یا رسالہ اٹھائیں اس کے کچھ نہ کچھ جراثیم اس میں ضرور مل جائیں گے۔ اسی طرح ریڈیو کے نشریات جو رات دن ہمارے کانوں کو چیرتی رہتی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی انداز سے ہمیں اس کا زہر پلاتی رہتی ہیں۔ جب تک اس حملے کی اصل کمین گاہ تک آدمی کی نظر نہ ہو۔ اور پوری گہرائی میں اتر کر اس کے اصل سوتوں کا وہ پوری طرح پتہ نہ لگا چکا ہو اس کے نقصانات اور اس کے زہریلے اثرات کا کسی صورت مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اس واقفیت کے بغیر وہ خود اپنے آپ کو بچانے اور اپنی ذہن و فکر کو اس کے اثرات بد سے محفوظ رکھنے میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا، ہے۔ جب تک آدمی برائی کی جڑ اور اس کے پورے شجرۂ نسب سے واقف نہ ہو کہیں نہ کہیں وہ اس کی چوٹ کھائے بغیر رہ نہیں سکتا ہے۔

سماجی علوم کا مطالعہ — چند اہم ہدایات :-

ان سماجی علوم کا مطالعہ کرنے والے کے لئے چند باتوں کا نگاہ میں رکھنا بیحد ضروری ہے :

۱۔ پہلی بات تو یہ کہ ان علوم کے سلسلے میں خواہ کچھ بھی کہا جائے لیکن اتنا طے ہے کہ یہ حقیقت کی بے آمیز ترجمانی نہیں کرتے۔ بلکہ واقعات کی جو تعبیر اور ان کی جو توجیہ و تشریح پیش کی جاتی ہے وہ ان کے مختلف مکاتب فکر میں سے کسی نہ کسی کے زیرِ اثر ہوتی ہے۔ اور ان پر تو رنگ چڑھتا ہے اس میں بہت زیادہ دخل اس بات کا ہوتا ہے کہ مطالعہ کرنے والے کی خود سوچ کیا ہے اور وہ کس نقطۂ نظر اور کس رجحان کا حامل ہے۔

۲۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے جو آج ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اندر نت نئی گمراہیوں اور کج رویوں نے اپنا گھونسلا بنا رکھا ہے۔ جنھوں نے انسان کو راہ راست سے ہٹانے اور اسے جہنم میں جھونکنے کا پورا سامان کر رکھا ہے۔ مثال کے طور پر فرائڈ کی نفسیات، دورخائم کی سماجیات اور کارل مارکس کا پیش کردہ اقتصادی فلسفہ وغیرہ

۳۔ پھر چونکہ ان علوم کا تعلق کسی بے جان مادہ سے نہیں بلکہ انسان اور انسانی زندگی سے ہے جو سر تا پا حرکت اور ہر لحظہ تغیر پذیر ہے، اس لئے آدمی کے لئے اپنی عنانِ فکر کو دوڑانے اور اس کی لگام کو دراز کرنے کے لئے بہت وسیع میدان موجود ہے۔ یہاں نت نئے موضوعات اور خیالات کی ایک پوری دنیا آباد ہے۔ جہاں آدمی طرح طرح کے نتائج اخذ کرتا اور نہ جانے کس کس رنگ کے افکار و نظریات کا شیش محل تعمیر کرتا رہتا ہے۔ بلکہ سچ بات تو یہ ہے کہ ہر نیا دن اپنے ساتھ نئے افکار و خیالات لے کر آتا ہے۔ آج ایک نظریئے کے خلاف زبان کھولنا ممکن نہیں ہوتا لیکن چند ہی دن بعد اس کے تار و پود بالکل بکھرتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح کسی بھی فکر و خیال کے سلسلے میں یہ کہنا بہت مشکل ہو گیا ہے کہ آج جب کہ فضا میں ہر طرف اس کا شور سنائی دیتا ہے کل اس کا کیا انجام ہونے والا اور وہ کس حشر سے دوچار ہونے والا ہے۔ ایک مکتب خیال کوئی نظریہ پیش کرتا ہے دوسرے کی طرف سے فوراً ہی اس کی تردید آ جاتی ہے۔ ایک مفکر یا فلسفی جس بات کو پوری قوت اور پورے زور کے ساتھ ثابت کرتا ہے دوسرا اسی زور و قوت کے ساتھ اسے بے اصل ثابت کرنے کے لئے میدان میں اتر آتا ہے۔

۴۔ یہ تو خیر سماجی علوم کی بات ہے جن کا معاملہ بہت کچھ مختلف ہے خالص سائنس کے موضوعات مثلاً طبیعیات اور حیاتیات وغیرہ کے سلسلے میں بھی اس صورت حال کے اثر سے بچا نہیں جا سکتا ہے۔ ان علوم کے سلسلے میں بھی یہ چیز بڑا فرق پیدا کر دیتی ہے کہ کسی مادہ کی تشریح

کرنے والا فی الجملہ حیات وکائنات کے سلسلے میں کس طرح کے خیالات رکھتا اور حقائق زندگی کے سلسلے میں کس نقطۂ نظر کا حامل ہے۔ بہر حال وہ جس عقیدہ وفکر کا حامل ہوگا اس کی تحقیقات بھی اسی کی آئینہ دار ہوں گی۔ اور ان کا پڑھنے والا بھی اسی طرح سے ان کا مثبت یا منفی، اثر قبول کرنے کے لئے مجبور ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک ہی چیز کے سلسلے میں ایک مادہ پرست یہ کہے گا کہ یہ چیز نیچر (nature) کی پیدا کردہ ہے۔ جب کہ ایک مومن اور خدا پرست اس کی توجیہ اس طرح کرے گا کہ "یہ خالق کائنات کی پیدا کردہ ہے"۔ آپ نے دیکھا کہ جب اس طرح کے خالص تجرباتی علوم کے سلسلے میں مطالعہ کرنے والے کی ذہنیت اور اس کے عقیدہ وفکر کا یہ اثر پڑتا ہے تو سماجی علوم، کا دائرہ تو بہت وسیع ہے۔ وہاں تو اس کے امکانات اس سے سیکڑوں گنا زیادہ ہیں۔

۵ ۔ اسی لئے ہمارے خیال میں وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں ایسے ارباب قلم سامنے آئیں جن کا اسلام پر غیر متزلزل یقین ہو اور جنھوں نے مغرب کی فکری یلغار کا کوئی اثر قبول نہ کیا ہو۔ جب تک اس طرح کے مخلص اور بے باک مسلمان دانشوروں اور ماہرین کے ہاتھوں ان علوم کی تدوین نو عمل میں نہیں آتی۔ طالبین دعوت کے تئیں اس فریضۂ منصبی کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ لیکن جو لوگ اس کام کے لئے آگے بڑھیں ان کے لئے بھی چند باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے :

۱ ۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ جس موضوع پر قلم اٹھائیں اس میں انھیں 'اختصاص' کا مقام حاصل ہونا چاہئے۔ اگر موضوع کے متعلق ان کی معلومات سرسری ہوں گی اور اس پر عبور حاصل کئے بغیر وہ یوں ہی میدان میں اتر آئیں گے تو اس کے سلسلے میں وہ کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہ دے سکیں گے۔ اور دعوت کے سیاق میں اس سے کسی بڑے فائدہ کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔

۲ ۔ دوسری بات یہ کہ اس طرح کے طالب علم کو اسلام کی صداقت وحقانیت پر یقین کامل ہونا چاہئے۔ اس طور پر کہ یہ چیز اس کے رگ وریشے میں سرایت کرچکی ہو۔ باد مخالف کا سخت سے جھونکا بھی اسے اپنے مقام سے نہ ہلا سکے۔ اسی صورت میں وہ اپنے موضوع کو صحیح اسلامی رنگ میں پیش کرسکے گا۔ اور اسلام کے عطا کردہ تصور حیات وکائنات کی اس میں پورے طور پر جلوہ نمائی ہوسکے گی۔

۳ ۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کی روشنی میں ان علوم کی تدوین نو کا حق اسی وقت ادا ہوسکتا ہے جب کہ اس کام کو انجام دینے والے حضرات اپنے موضوع پر کامل عبور اور پوری دستگاہ رکھنے کے ساتھ بے پایاں طریق پر جذبۂ اسلامی سے بھی سرشار ہوں۔ ان کا ذہن اسلامی ہو، فکر ونظر اسلامی ہو اور ان کے قلب وضمیر میں یہ 'اسلامیت' کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو۔ وہ اسلام کو اپنے سینے سے لگانے والے ہوں اور دنیا کی ہر چیز کے مقابلے میں وہ انھیں عزیز تر ہو۔ ان کا سینہ اس حقیقت کے لئے بالکل کھلا ہوا ہو کہ اسلام ہی سب سے بہتر نظام زندگی ہے، کوئی بھی دوسرا فلسفۂ حیات اس سے بڑھ کر نہیں۔ اسے اپنائے بغیر کوئی سماج عدل وانصاف سے ہمکنار ہوسکتا ہے، نہ اسے سکون و اطمینان کی دولت نصیب ہوسکتی ہے۔

نفسیات :

اس سے ہماری مراد وہ علم نفسیات نہیں ہے جو کسی زمانے میں فلسفہ کی ایک شاخ کی حیثیت سے پڑھا پڑھایا جاتا تھا۔ نہ تو اس سے ہمارا مطلب فرائڈ کی ایجاد کردہ اس 'نفسیات' سے ہے جس کے اندر نظری طور پر نفس انسانی، کا تحلیل وتجزیہ کیا جاتا اور پھر اس کے نتیجے میں مختلف قسم کے مفروضے اور نظریات ترتیب دیئے جاتے ہیں جن کی بنیاد سرتا سر ظن وتخمین پر

ہوتی ہے۔ دلیل نام کی کوئی چیز ان کے ساتھ نہیں ہوتی ہے۔

اس موقعہ پر ہم جس نفسیات کی بات کر رہے ہیں اور اس پر زور دینا چاہتے ہیں وہ اس میں ابھرنے والا یہ تازہ رجحان ہے کہ خیالی بحثوں کے بجائے انسانوں پر عملی طور پر تجربات کئے جائیں اور اس جانچ پرکھ کے نتیجے میں اس کے باطنی احساسات اور نفسیاتی مظاہر کا پتہ لگایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ انسان کے سلسلے میں جو باتیں کی جائیں اور اس کی طرف جن چیزوں کا انتساب کیا جائے اس کی بنا کاغذ کے کچھ ٹکڑے نہ ہوں بلکہ اس کی شخصیت اور اس کے وجود کو براہ راست زیر بحث لایا جائے اور پھر تجربہ و مشاہدہ کے اصول پر جو بات سامنے آئے اسے بطور نظریہ کے پیش کیا جائے۔ بات واقعی تجربات اور اعداد و شمار کی زبان میں ہو مجرد مفروضات اور خود ساختہ خیالات کی بنیاد پر کوئی بات نہ کہی جائے۔

علم نفسیات کا ابھرنے والا یہ تازہ پہلو دین کے ایک داعی کے لئے مختلف حیثیتوں سے کافی مفید ہے:

۱۔ پہلی بات تو یہ کہ اس طرح کے تجربے اور واقعی مطالعہ کی روشنی میں وہ یہ بات پورے اعتماد سے کہہ سکے گا کہ آخرت سے پہلے دنیا کی اس زندگی ہی میں خدا کی ذات اور دیگر غیبی حقائق پر ایمان کی بدولت انسان سکون و اطمینان کی ایک لازوال نعمت سے سرشار ہوتا ہے۔ ایک سچے دیندار کو اپنی دینداری کا بہترین پھل اس دنیا ہی میں مل جاتا ہے۔ اور اس کی زندگی میں اس کے انتہائی خوشگوار اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

مشہور امریکی ماہر نفسیات ڈاکٹر ہنری لنک نے اپنی کتاب العودة الی الایمان (ایمان کی طرف واپسی) میں اس سلسلے میں جو عجیب و غریب انکشافات کئے ہیں اس کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل بے غبار ہو کر سامنے آجاتی ہے کبھی سال پہلے کی بات ہے کہ امریکہ میں اس کتاب کے سینتالیس (۴۷) ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

کتاب کے اندر اس نے دس ہزار آدمیوں پر تہتر ہزار سے زیادہ مختلف قسم کے نفسیاتی تجربے کئے ہیں۔ اور ان سب کے نتیجے میں جو حقیقت ابھر کے سامنے آئی ہے وہ یہ کہ:

"مذہب پرست اور عبادت گاہوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ان لوگوں کے بالمقابل جن کا کسی مذہب پر ایمان نہیں اور جن کی زندگی میں کسی قسم کی عبادت گذاری کے لئے کوئی خانہ نہیں، زیادہ مضبوط اور جاندار شخصیت کے مالک ہوتے ہیں"

اسی سے ملتی جلتی بات ڈاکٹر کارل یونج نے بھی اپنی کتاب الرجل العصری یبحث عن روح" (عصر حاضر کا انسان روح کی تلاش میں) میں کہی ہے۔ اس کے مطالعہ کا حاصل یہ ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی کے سفر کی آدھی منزل طے کر چکے ہیں وہ جن مسائل سے دوچار ہیں اور انھیں جس پریشانی کا سامنا ہے اس کا سرا کسی نہ کسی درجے میں اس بات سے اگر جڑتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایمان کی دولت سے محروم ہیں اور انھوں نے اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس طرح کے جتنے مریض بھی اس کے سامنے آئے انھیں اپنے مرض سے اسی وقت نجات مل سکی جب کہ انھوں نے اپنے ایمان کی بازیابی کرلی، اپنے مذہب کے احکام پر عمل کرنے اور اس کی منع کردہ چیزوں سے اجتناب کرنے لگے۔ اس اسلحے سے لیس ہوئے بغیر کشاکش حیات میں ان کے لئے اپنے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی صورت نہیں رہ گئی تھی۔

ان شواہد کی روشنی میں یہ موہوم خیال بالکل بے بنیاد ہو کر رہ جاتا ہے کہ مذہب ایک افیون ہے جو انسان کو ناکارہ بناتا ہے اور اس کے قوی کو تعطل کا شکار کر دیتا ہے۔

مشہور امریکی فلسفی 'ولیم جیمس' کا تو یہ کہنا ہے کہ:

انسان کے جملہ مسائل اور اس کی تمام پریشانیوں کا بس ایک حل ہے اور وہ یہ کہ

وہ ایمان کی دولت سے آراستہ ہو۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کے سلسلے میں دو رائے نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح ڈیل کارنیجی، ڈاکٹر اے۔ اے بریل، کے حوالہ سے نقل کرتا ہے کہ "یہ ایک حقیقت ہے کہ مذہبی آدمی کبھی کسی نفسیاتی بیماری کا شکار نہیں ہو سکتا" اس کے بعد وہ اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتا ہے:

"میرے تو خیال میں ہمارے دور کے یہ جو نفسیاتی معالجین ہیں اگر انھیں ایک نئے طرز کے 'وعظ کنندوں' کا نام دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ یہ ہمیں مذہب کی رسی کو مضبوط تھامنے کی تلقین کرتے ہیں تو صرف اسی لئے نہیں کہ ہم دوسری دنیا میں جہنم کی آگ سے بچ جائیں گے۔ مذہب پر عمل پیرا ہونے کی نصیحت یہ ہمیں اس لئے کرتے ہیں کہ ایک جہنم جو خود اس دنیا میں مجسم ہمارے سامنے کھڑی ہے، مذہب کا سہارا پکڑے بغیر ہم اس سے کسی صورت نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ جہنم ہے آدمی کے نظام ہضم کو متاثر کرنے والے امراض، اعصابی انحلال اور جنون اور پاگل پن وغیرہ[1]

۲ ۔ دوسری بات یہ کہ اس طریقۂ مطالعہ کی مدد سے آدمی بہت سے دینی نصوص کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا اور موجودہ دور کے ذہن و مزاج کی رعایت سے لوگوں کے سامنے ان کی ترجمانی و تشریح کا حق ادا کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ اِنَّمَا اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا	(اے نبی) کہہ دو میں تو تمہیں بس ایک بات کی
لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا۔	نصیحت کرتا ہوں یہ کہ تم کھڑے ہو اللہ کے لئے
(سبا: ۴۶)	دو دو اور ایک ایک کرکے، پھر غور کرو۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ہماری کتاب "الایمان والحیاۃ" (ایمان اور زندگی) میں اسی موضوع سے متعلق بحث بعنوان: الطب النفسی فی موکب الایمان، (ایمان بحیثیت ایک نفسیاتی علاج) (مصنف)

جس سے ہمیں علاوہ اور باتوں کے اس اہم نفسیاتی حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ صحت مند سوچ اور نفع بخش غور و فکر جس کے نتیجے میں آدمی حق و صواب تک رسائی حاصل کر سکتا ہے وہ سوچ اور فکر ہے جو تنہا یا زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے آدمی کے ساتھ ہو۔ اس کے برعکس سماج اور معاشرے کا جو ایک رخ بن جاتا ہے اور اس میں جن افکار و نظریات کی حکمرانی ہوتی ہے اس کے زیر اثر ہو کر جب آدمی کسی بات کو سوچتا یا کسی مسئلہ پر غور کرتا ہے تو اکثر و بیشتر اسے راہ صواب نہیں مل پاتی اور وہ کوئی متوازن اور ہم آہنگ رائے بنانے اور کسی نتیجہ خیز فیصلہ تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو پاتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے آج کا ترقی یافتہ علم نفسیات تسلیم کرتا ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے:

لَا يَقْضِي الْقَاضِيْ وَهُوَ غَضْبَانُ۔	(کوئی قاضی فیصلہ نہ کرے جب کہ وہ غصے کی
(بخاری)	حالت میں ہو)

جس سے ہمیں اس اہم نفسیاتی حقیقت کا سراغ ملتا ہے کہ اگر آدمی کے اوپر کچھ خاص جذبات طاری ہوں اور شدید طور پر کسی کیفیت کا شکار ہو تو اس صورت میں اس کے حواس معمول کے مطابق کام نہیں کرتے اور اس کا امکان بہت کم ہو جاتا ہے کہ وہ صحیح بات سوچ سکے اور مناسب فیصلے تک پہنچنے میں کامیاب ہو۔ موجودہ علم نفسیات اس کی حرف بہ حرف تصدیق کرتا ہے۔

۳ ۔ تیسری بات یہ کہ اس صورت میں دین کا ایک داعی شریعت کے بہت سے احکام کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے اور ان کی حکمتوں کا کما حقہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو سکے گا، جس کے نتیجے میں اس کے ایمان میں دن بدن اضافہ ہوتا جائے گا کہ الٰہی شریعت کے ذریعہ جس طرح بے پایاں انداز میں عدل و انصاف کی آبیاری ہوتی اور وہ جن عظیم حکمتوں اور مصلحتوں سے لبریز ہے، دنیا کا کوئی دوسرا قانون اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا ہے۔ جب اسے اس حقیقت

پر شرح صدر ہوگا تو دوسرے لوگوں کے سامنے وہ اس کی زیادہ بہتر ترجمانی اور اسے زیادہ بہتر طریقے پر پیش کر سکے گا۔ مثال کے طور پر اسلام نے خاندان کی دیکھ بھال اور اس کی نگرانی کی ذمہ داری بجائے عورت کے مرد کے سپرد کی ہے۔ ظاہر ہے اس سے اسلام کا مقصود مردوں کی جانبداری اور عورتوں کے ساتھ ظلم اور بے انصافی نہیں۔ اسلام کے سلسلے میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ خالق کائنات کا عطا کردہ ضابطہ حیات ہے جو یکساں طور پر مرد اور عورت دونوں کا پیدا کرنے والا ہے۔

پس اگر اسلام نے اس کا فیصلہ کیا ہے تو اس کے پیچھے گہری نفسیاتی بنیادیں موجود ہیں۔ اور جدید تحقیقات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر یوسف مراد نے کہا ہے:

"انسانی شخصیت، اس کی صلاحیتیں اور اس کے جذبات و میلانات کی جانچ پرکھ کے سلسلے میں مختلف آلات کو استعمال میں لاکر جب بہت سے بالغ مردوں اور عورتوں پر ان کا تجربہ کیا گیا تو اس کا جو نتیجہ سامنے آیا وہ یہ کہ دونوں جنسوں کے درمیان اپنی صلاحیتوں اور اپنے جذبات و میلانات کے اعتبار سے کافی نمایاں فرق ہے۔ مردوں کے اندر صبر و ثبات، عزم و استقلال اور مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت عورتوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ ان کی اعصابی قوت عورتوں کے بالمقابل کافی بڑھی ہوئی اور ان کے اندر خود اعتمادی بھی ان سے زیادہ ہوتی ہے۔ ان کے اندر غلبہ و سطوت کی صلاحیت ہوتی ہے، خطرات کو دیکھ کر ان کے اندر کمزوری اور گھبراہٹ پیدا نہیں ہوئی، اس کے برعکس وہ اس کا پوری پامردی اور جاں بازی کے ساتھ مقابلہ کر سکتے ہیں جب کہ عورتوں کے اندر ان سبھی معاملات میں صورت حال اس کے برعکس ہے۔[1]"

---

[1] ملاحظہ ہو ڈاکٹر موصوف کی کتاب: مبادی علم النفس ۲/۶۰۶، ۶۰۷

۴۔ چوتھی بات یہ کہ اگر اس کے اندر اس پہلو سے نفسیات کے اس فن سے مناسبت پیدا ہو جائے تو جن افراد و جماعات کو اسے اپنا مخاطب بنانا اور ان تک اپنی دعوت پہنچانی ہے اس کے ذریعہ اسے ان کی نفسیات اور ان کے جذبات و میلانات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ نتیجے کے طور پر وہ ان کے سامنے اپنی بات اس طور پر رکھ سکے گا کہ وہ ان کے اندر گھر کر سکے۔ پھر اس طرح وہ ان کے ذہنی اور فکری معیار کی بھی پوری پوری رعایت کر سکے گا جس کے بعد داعی کا پیغام انھیں اپنے دل کی آواز نظر آئے گا۔ اس کے برعکس اگر داعی لوگوں کے ذوق و مزاج اور ان کے جذبات و میلانات کی رعایت نہ کر سکے تو اس کے امکانات بہت کم ہو جاتے ہیں کہ لوگ اس کی باتوں کو سنیں اور ان پر توجہ دیں۔ بلکہ اکثر و بیشتر تو ایسا ہوگا کہ وہ ان کے اندر کوئی دلچسپی اور شوق و ولولہ پیدا کئے بغیر انھیں اکتاہٹ اور بیزاری کا شکار بنا دے گا۔ اور اس پر بھی چنداں تعجب نہیں کہ کچھ لوگ تنگ ہو کر اس کا ساتھ ہی چھوڑ دیں اور بجائے قریب ہونے کے اس سے دور رہنے کو زیادہ پسند کریں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماننے والوں کو یہ جو تاکید کی ہے کہ:

يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَبَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا۔ (متفق علیہ)	آسانیاں پیدا کرو، لوگوں کے لئے مشکلیں کھڑی نہ کرو انھیں خوشخبریاں سناؤ کہ دین سے قریب آئیں، اپنی کسی بات یا اپنے کسی طرز عمل سے انھیں دین سے متنفر نہ کرو۔

تو اس کی یہی معنویت ہے کہ مخاطب کے سامنے بات اس طور پر رکھی جائے کہ اس کے اندر اس کے تئیں رغبت اور میلان پیدا ہو۔ اسے دین سے بیزار اور متنفر نہ کیا جائے۔ حضرات صحابہ کرام رض کو آپ کے اس فرمان کا بڑا پاس تھا اور وہ اس کا بڑا اہتمام کرتے تھے یفقیہ

اُمت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہفتہ میں صرف ایک دن لوگوں کو وعظ و نصیحت اور ان کی تذکیر فرماتے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ : اے ابو عبدالرحمٰن جوان کی کنیت ہے، ہم چاہتے ہیں کہ آپ روزانہ ہماری اس تذکیر کا معمول بنالیں۔ آپ نے فرمایا : میں ایسا کرسکتا ہوں، لیکن صرف اس لئے نہیں کرتا ہوں کہ اس سے آپ لوگ اکتا جائیں گے۔ میں یہ جو وقفہ دے کر آپ لوگوں کو وعظ و تذکیر کرتا ہوں تو اس کا مقصد حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم کی پیروی کے سوا دوسرا نہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں بھی وقفہ وقفہ سے ہی وعظ و نصیحت اور تذکیر و یاد دہانی فرمایا کرتے تھے۔ اس وجہ سے کہ ہم لوگ اکتاہٹ اور بے دلی کا شکار نہ ہوں۔ (بخاری، مسلم، ترمذی)

کیا انسانی نفسیات کی رعایت کی اس سے بہتر کوئی مثال ہوسکتی ہے ؟

سماجیات :

اسی طرح 'سماجیات' کا علم ہے جس کا موضوع مختلف پہلوؤں سے انسانی سماج کا مطالعہ ہے۔ سماج کا کیا حال ہے اور اس کے کیا مسائل ہیں نیز وہ کونسے اصول و ضوابط ہیں جن کی رعایت سے کوئی سماج ترقی کی منزلیں طے کرتا اور انھیں نظر انداز کرنے کی صورت میں پستی اور رسوائی اس کی قسمت بن جاتی ہے۔

اہل مغرب اس علم کا بانی فرانسیسی فلسفی 'اوگست کومٹ (August Comte) کو قرار دیتے ہیں، اور اسے علم سماجیات کے 'باوا آدم' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ پتہ نہیں یہ لوگ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہیں یا جان بوجھ کر لوگوں کو دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں کہ اس فن میں علامہ ابن خلدون کا جو عظیم الشان کارنامہ ہے اور اس کے ذیل میں اس نے جو عجیب و غریب اور نادر تحقیقات پیش کی ہیں، ان حضرات کی اس پر بالکل نظر ہی نہیں پڑتی۔ حالانکہ اس کے شاہکار 'مقدمہ' کا مطالعہ کرنے والا کوئی بھی شخص اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرسکتا ہے [1]

---

[1] اس کے ایک مختصر سے جائزے کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ مذکور، پر ڈاکٹر علی عبدالواحد وافی کا دیباچہ مطبوعہ دار البیان۔

دوسرے اور بہت سے شعبوں کی طرح علم سماجیات کے سلسلے میں بھی مختلف مکاتب فکر ہیں، اس کی مختلف شاخیں ہیں جن کا اپنا الگ میدان ہے۔ مختلف رجحانات ہیں اور تجزیہ و تحلیل کے بے شمار طریقے ہیں جنھیں لوگ اپنے اپنے میدانوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اس کی انہی پیچ در پیچ شاخوں اور بے شمار کتب ہائے فکر کو دیکھ کر کسی صاحب نظر نے اس پر بڑا اچھا تبصرہ کیا تھا کہ 'علم سماجیات' کی شاخیں اور اس کے سلسلے میں پائے جانے والے نقطہائے نظر تو بے شمار ہیں لیکن اس سے حاصل ہونے والے نتائج پر نظر ڈالی جائے تو معاملہ بالکل صفر نظر آتا ہے [1]

داعی کے لئے ضروری ہے کہ اسے اس علم کے بنیادی اصولوں اور اس کے موٹے موٹے مسائل سے واقفیت ہو۔ اور اسے اطلاع رہے کہ اس فن کی تازہ ترین تحقیقات کیا ہیں۔ اس کے ماہرین کے یہاں اس وقت کونسے مسائل زیر بحث ہیں اور ان کے آخری (Final) نتائج فکر کیا ہیں ؟

ایسا اس لئے ضروری ہے کہ اس علم کے انہی مواد کو لے کر لوگ مختلف سمتوں سے دین پر حملے کرتے اور اس طرح دعوت دین کی راہ میں روڑے اٹکاتے اور طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کومٹ، کا تاریخ انسانی کے تئیں تین ادوار کا تصور جس کی رو سے جس طرح مابعد الطبیعی فلسفہ کا دور ختم ہوچکا، اسی طرح مذہب کا دور بھی اپنی مدت پوری کرچکا ہے۔ اب جو دور باقی ہے وہ صرف تجرباتی علم کا [2] ہے، جس میں صرف

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو استاذ بونور کی کتاب 'تمہید فی علم الاجتماع' ترجمہ ڈاکٹر محمد الجوہری وغیرہ

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ڈاکٹر عبداللہ دراز کی کتاب 'الدین' ص ۹۴ اور اس سے آگے۔ مطبوعہ دار القلم کویت ؟ توفیق الطویل کی کتاب 'اسس الفلسفۃ' ص ۲۰۷، ۲۰۹۔ تیسرا ایڈیشن۔

مادہ زیر بحث آتا ہے جسے آدمی اپنے مشاہدہ میں لاسکتا اور تجربے کی خراد پر چڑھا سکتا ہے۔ روحانیت اور مابعد الطبیعیاتی مسائل سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ ظاہر ہے یہ چیز خود نفس مذہب کی جڑ کاٹنے والی ہے، اس کی طرف لوگوں کو بلانے اور ان کی زندگیوں کو اس کے سانچے میں ڈھالنے کا سوال کیا پیدا ہوتا ہے) اسی طرح کومٹ اور اس کے علاوہ دوسرے فلاسفہ کا پیش کردہ یہ تصور کہ مذہب انسانی سماج کی پیداوار اور بس ایک 'سماجی عمل' ہے۔ پھر اپنے اپنے ادوار کی نسبت سے وہ انبیائی دعوتوں کو بھی یہی رنگ دے کر پیش کرتے ہیں جس سے ان کا مقصود یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ 'مذہب' انسان کا ایجاد کردہ ہے۔ اسے آسمانی اور منزل من اللہ کہنا صرف ایک دھوکا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اسی سے ملتا جلتا 'دورخائم' وغیرہ فلاسفہ کا یہ خیال بھی ہے کہ مذہب ارتقاء کی مختلف منزلیں طے کرتے ہوئے 'توحید' کی موجودہ صورت تک پہنچا ہے۔ اس کا ابتدائی نقطہ شرک (Polytheism) تھا پھر وہ ایک لمبی مسافت طے کرنے کے بعد توحید (Monotheism) کے موجودہ مقام تک پہنچا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے تمام تصورات انسان کو نفس مذہب سے برگشتہ کردینے کے لئے کافی ہیں۔ جب کہ قرآن وسنت ہمارے سامنے ان مسائل کے سلسلے میں بالکل دوسرا ہی تصور پیش کرتے ہیں۔ جب تک ان مخالف تصورات کی مدلّل تردید نہ ہو، دین اور دعوت دین پر گفتگو کے دروازہ کھلنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اور اسی پہلو سے ان مخالف اسلام تصورات سے واقفیت بہم پہنچانے کی ضرورت ہے۔

'سماجیات' کے باب میں اسی طرح 'دورخائم' کا پیش کردہ یہ خیال بھی ہے کہ انسانی زندگی میں 'فرد' (Individual) کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے ذرا مختلف نہیں جسے سماج (society) جس طرح چاہے نچاتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے یہ خیال اسلام کے پیش کردہ اس تصور کے بالکل الٹ ہے کہ 'فرد' کے اندر خیر و شر کے پہچاننے کی صلاحیت ہے، وہ اپنے لئے نیک و بد

کا انتخاب کرسکتا ہے۔ وہ سماج کے ہاتھوں مجبور محض نہیں بلکہ ایک با اختیار اور ذمہ دار ہستی ہے۔ اور اسی نسبت سے اسے اپنے ہر عمل کے سلسلے میں خدا کے حضور جواب دہی کرنی پڑے گی۔ اور ثواب یا عذاب کی صورت میں اپنے اچھے یا برے اعمال کا نتیجہ بھگتنا ہوگا۔

اس پس منظر میں یہ بات بالکل ناگزیر ہوجاتی ہے کہ دیگر علوم کی طرح 'سماجیات' کے اس علم کو بھی از سر نو اسلامی نقطۂ نظر سے مدون کیا جائے۔ یہ مہم اسی وقت سر کی جاسکتی ہے جب کہ ایسے افراد سامنے آئیں جن کی اسلام پر گہری نظر ہو اور 'سماجیات' کے اس فن سے بھی وہ اچھی طرح واقف ہوں۔ اسی صورت میں وہ انسانی تاریخ، اور انسانی سماج، اور انسان کے مسائل کے سلسلے میں اس نقطۂ نظر کی ترجمانی کرسکیں گے جسے اسلام پیش کرتا ہے۔ اور جس کے اپنانے ہی میں انسان کی دنیا وآخرت کی فلاح وابستہ ہے[1]

فلسفہ: اسی طرح داعی کے لئے فلسفۂ جدیدہ، اس کے مختلف مکاتب فکر اور مختلف رجحانات سے بھی واقفیت بہم پہنچانی ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی انسانی علوم وافکار کی تاریخ خاص طور پر فکر اسلامی کی تاریخ سے بھی اس کا آگاہ ہونا ضروری ہے۔ اس واقفیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آدمی ان فلسفیانہ افکار وخیالات کا گرویدہ ہوجائے اور الٰہیات، اخلاقیات اور اجتماعیات

---

[1] خوشی کی بات ہے کہ اس سلسلے کی بہت سی کامیاب کوششیں ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ مثال کے طور پر مختلف ارباب قلم کی درج ذیل کتابیں:

(۱) ڈاکٹر مصطفیٰ محمد حسین: المدخل الی المدرسۃ الاسلامیۃ فی علم الاجتماع (۲) استاذ عمر عودہ فی خطیب: المسألۃ الاجتماعیۃ بین الاسلام والنظم البشریہ (۳) ڈاکٹر احمد عسال: الاسلام وبناء المجتمع۔ (۴) ڈاکٹر محمد ابراہیم الفرمی: قضایا فی الاجتماع الاسلامی المعاصر (۵) استاذ محمد مبارک: المجتمع الاسلامی المعاصر وغیرہ (مصنف)

وغیرہ کے میدانوں میں انہی کے مطابق اپنے نقطۂ نظر کی تشکیل کرنے لگے نہیں بلکہ اس واقفیت کی ضرورت بعض دوسرے مقاصد کے پیشِ نظر ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ اسی صورت میں اس کے لیے ان افکار و خیالات اور فلسفیانہ نظریات کا سمجھنا ممکن ہو سکے گا جنھوں نے بے شمار مسلمانوں کے ذہن و فکر کو مسموم کر رکھا ہے۔ یہاں تک کہ خود عالم اسلام کے اندر ان کا علم بلند کرنے والے اور ان کی ترویج و اشاعت کا بیڑا اٹھانے والے لوگ پیدا ہو چکے ہیں ان میں یونیورسٹی اور کالج کے اساتذہ بھی ہیں۔ ادیب اور شاعر حضرات بھی۔ اور وہ لوگ بھی جن کا تعلق صحافتی دنیا اور رسل و رسائل اور وسائل نشر و ابلاغ سے ہے۔ یہ لوگ مختلف فلسفیانہ مکاتب فکر کے گرویدہ ہیں۔ کوئی مارکسی نقطۂ نظر کا حامل ہے تو کوئی وجودی فلسفے کا قائل ہے کسی کا تعلق دائیں بازو سے ہے تو کوئی بائیں بازو سے تعلق رکھنے والا ہے۔ بہر حال آپس میں ان کا یہ فکری اختلاف جیسا کچھ بھی ہو لیکن اس پر سب یک زبان ہیں کہ اسلام قابل رد ہے اور اس سے دامن بچا کر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس صورت میں جب کہ ہمارے سماج پر ان افکار و نظریات کا یہ غلبہ ہے، اس پر خاموشی اختیار کرنے کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ہم شتر مرغ کے مانند کمال سادہ لوحی کے ساتھ حقائق سے آنکھیں موند لینے کو کافی سمجھتے ہیں۔ جب کہ یہ افکار و نظریات خود ہمارے اپنے گھروں کے اندر ہم سے بر سر پیکار ہیں اور ہماری آنکھوں کے سامنے ہماری جڑ کھودنے پر تلے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلام کے نام لیوا بڑی تعداد میں ان کے دام فریب میں گرفتار ہو رہے ہیں۔ فلسفۂ جدیدہ کی اس یلغار کا مقابلہ ہم اسی وقت کر سکتے اور اس کی پیدا کی ہوئی صورت حال سے کامیابی کے ساتھ اسی وقت عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جب کہ ہم خود اس کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہوں اور اس کی باریکیوں سے ایک ایک کر کے واقف ہوں۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ جب تک آدمی کو کسی فکر

گہری واقفیت نہ ہو وہ اس کی تردید کا حق ادا نہیں کر سکتا ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ اسی صورت میں وہ اسلام کے مخالف ان افکار و نظریات کی خود انہی کی زبان میں اور انہی کی اصطلاحات میں تردید کرنے کے قابل ہو سکے گا۔ جب کہ اس کے بغیر اس تردید کا حق ادا نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ ظاہر بات ہے کہ اسلام کے مخالفین کے سامنے قرآن و حدیث کے دلائل قائم کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب ان کا ان پر ایمان ہی نہیں ہے تو ان کے دلائل سے متاثر ہونے کا سوال کیا پیدا ہوتا ہے۔ امام غزالیؒ نے "تہافت الفلاسفہ" لکھ کر اگر یونانی فلسفہ کے دلدادوں کی زبانیں بند کر دیں، اسی طرح علامہ ابن تیمیہؒ نے "تعارض العقل والنقل" یا "موافقہ صحیح المنقول لصریح المعقول" اور "نقض المنطق"[1] وغیرہ جیسی اپنی کتابوں سے اپنے زمانہ کے مخالفین اسلام کو لا جواب کر دیا تو ایسا اسی

---

[1] اس مقام پر غالباً ٹائپ کے الٹ پھیر سے علامہ کی اس کتاب کا نام بجائے "نقض المنطق"، "نقد المنطق" چھپ گیا تھا۔ ہم نے اصل کو بحال کر دیا ہے۔ فتاوی ابن تیمیہؒ کی نئی ترتیب کی نویں جلد کتاب المنطق ہیں صفحہ ۵ سے صفحہ ۱۷ تک کا مواد اسی کتاب کا انتخاب ہے۔ علامہ کی اس موضوع سے متعلق دوسری مشہور کتاب اور زیادہ تر یہی کتاب زبان زد عوام و خواص ہے "نصیحۃ اہل الایمان فی الرد علی منطق الیونان" ہے۔ جو "الرد علی المنطقیین" کے نام سے زیادہ معروف ہے۔ فتاوی کی جلد مذکور میں یہ کتاب صفحہ ۸۲ سے شروع ہو کر صفحہ ۲۵۴ پر ختم ہوتی ہے جو دراصل علامہ سیوطیؒ کی تلخیص ہے۔ سیوطی کے بیان کے مطابق علامہ موصوف نے منطق کے موضوع پر دو کتابیں تصنیف کی تھیں جن میں ایک چھوٹی اور دوسری بہیں طویل اجزاء پر پھیلی ہوئی تھی۔ سیوطی نے اسی ثانی الذکر کی تلخیص کی ہے جو مذکورہ نام سے معروف اور ذکر کردہ تفصیل کے ساتھ فتاوی کی ترتیب جدید میں شامل ہے۔ اس موضوع سے متعلق علامہ کے دیگر مختصر رسائل صفحہ ۲۵۵ سے آگے ختم کتاب صفحہ ۳۱۹ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ (مترجم)

لئے تو ممکن ہو سکا کہ یہ حضرات اسلام پر سند ہونے کے ساتھ ساتھ مخالف اسلام تصورات اور فلسفوں کو بھی اسی طرح ہضم کئے ہوئے تھے کہ ان کے بڑے سے بڑے مخالفین کے لئے بھی کہیں انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں نکل سکی۔ نتیجہ ہوا کہ ان کے لئے اسلام کی صداقت وحقانیت کے سامنے سپر ڈالنے کے سوا چارہ نہ رہا۔

دین کا ایک داعی جب بھی اس فریضے کو ادا کرنا چاہے گا اسے اپنے وقت کے مخالف اسلام تصورات اور فلسفوں سے اسی طرح واقفیت بہم پہنچانی ناگزیر ہوگی۔ اس کے بغیر وہ ان کی تردید کا حق ادا کر سکتا ہے اور نہ لوگوں کو اسلام کی صداقت کا قائل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

۳۔ ان افکار ونظریات اور فلسفوں کے مطالعہ کے ضمن میں ان کی تاریخ اور مختلف ادوار میں ان کی بدلتی ہوئی شکلوں سے واقفیت کے نتیجے ہی میں وہ موجودہ دور کے لادینی افکار و نظریات اور فلسفیانہ رجحانات کے اصل سوتوں اور ان کی جڑوں سے آگاہی حاصل کرنے اور ان کا پتہ لگانے میں کامیاب ہو سکے گا۔ مثال کے طور پر مادہ پرستی، اشتراکیت اور فلسفۂ وجودیت وغیرہ۔ اس مطالعہ کے نتیجے میں وہ ان افکار ونظریات کا سرا پکڑنے اور علمی انداز میں ان پر تنقید اور ان کی مدلل تردید کا حق ادا کر سکے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس مطالعہ کی بدولت مختلف ادوار میں آسمانی مذاہب میں جو تحریفات اور تبدیلیاں واقع ہوئیں تاریخ سے ان کا سرا ملانے اور ان کی جڑوں کا پتہ لگانے کے سلسلے میں اسے کافی مدد ملے گی۔ مثال کے طور پر عیسائیت کے اندر تثلیث، حضرت مسیحؑ کی سولی، گناہوں کے کفارہ کا اور حضرت عیسٰیؑ کے ابن اللہ ہونے کا عقیدہ وغیرہ۔ کہ پیروان مسیح کے اندر دیگر اقوام کے افکار ونظریات کی پیروی کے نتیجے ہی میں یہ چیزیں پیدا ہوئیں۔ جیسا کہ قرآن نے درج ذیل آیت میں اس حقیقت کی

کی طرف اشارہ کیا ہے:

ذٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ۔ (توبہ - ۳۰)

(یہ ان انصاریٰ) کا حضرت مسیح کو ابن اللہ کہنا) بس ان کے منہ سے نکالی ہوئی بات ہے جس سے یہ جوڑ ملاتے ہیں اپنے سے پچھلی کافر قوموں کا)

۴۔ پھر اس مطالعہ کی بدولت ہی اسے اس حقیقت سے آگاہی نصیب ہو سکتی ہے کہ انسان وحی آسمانی کے بغیر اور ہدایت الٰہی سے محروم ہو کر جب صرف اپنی عقل نارسا کی وجہ سے اور اپنی ذات پر اعتماد کر کے حیات وکائنات کے مسائل پر غور کرتا ہے اور اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت یعنی وجود باری تعالیٰ کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو کس طرح وہ راہ راست سے بھٹکتا اور دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ مابعد الطبیعی مسائل کے سلسلے میں صرف عقل کی روشنی میں اخذ کردہ نتائج کی بابت مشہور فلسفی کانٹ، نے کتنی حقیقت پسندانہ بات کہی ہے کہ "یہ وہ سکے ہیں جن کے کھرے یا کھوٹے ہونے کے سلسلے میں ہم اعتماد کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

کوئی شک نہیں کہ اس مطالعہ کی بدولت آدمی کے ایمان میں اضافہ ہوگا اور وحی الٰہی کی صداقت وحقانیت پر اس کا یقین دن بدن بڑھتا جائے گا۔ وہ ایک باطنی اطمینان کی بے پایاں دولت سے سرشار ہوگا اور دوسروں کو بھی اس سے سرشار کرنے کی کوشش کریگا۔

۵۔ پھر یہ کہ اس مطالعہ کی بدولت جب اسے اسلام کی صداقت وحقانیت پر شرح صدر حاصل ہو چکا ہوگا تو عقل انسانی کے ان نتائج فکر اور اس کی تلاش کردہ حکمت کی ان باتوں کو وہ وحی الٰہی کی صداقت وحقانیت کے اثبات کے سلسلے میں استعمال کر سکے گا۔ اس لئے کہ حکمت بھری بات جہاں کہیں بھی ہو وہ صاحب ایمان ہی کا حصہ ہے جیسا کہ ارشاد نبوی ہے۔

اَلْكَلِمَةُ الْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ اَنّٰى وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

(حکمت کی بات مومن کی گم شدہ متاع ہے، اسے وہ جہاں کہیں ملے وہ اس کا زیادہ حقدار ہے)

بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کوشش کے ضمن میں اکثر و بیشتر اسے یہ دیکھنے کو ملے گا کہ عقل انسانی وحی الٰہی کے ساتھ پورے طور پر ہم آہنگ ہے اور زبان نبوت سے جو کچھ نکلا ہے فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ کوئی شک نہیں کہ عقل و نقل کی اس ہم آہنگی کی صورت میں معاملہ نورٌ علیٰ نورٍ ہوگا اور اسلام کی صداقت پورے طور پر بے نقاب ہو چکی ہوگی۔ اور صحیح بات تو یہ ہے کہ عقل صریح اور نقل صحیح کے درمیان کبھی تعارض اور ٹکراؤ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ یہ دونوں ہی چیزیں خداوند ذوالجلال کی طرف سے اپنے بندوں کے ساتھ مہر و محبت کا مظہر ہیں۔ اگر وحی الٰہی ایک عظیم ترین عطیہ ربانی ہے تو عقل انسانی بھی خدا تعالیٰ کا وہ عطیہ ہے جس پر اس کا جس قدر بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ پس صحیح معنوں میں عقل و نقل کے درمیان تعارض اور ٹکراؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تعارض تو اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ عقل جادۂ اعتدال سے ہٹ جائے اور عقل کے نام پر بے عقلی کی بات کی جانے لگے۔ یا پھر یہ کہ نقل کے نام پر جس چیز کا حوالہ دیا جا رہا ہو وہ چیز خود محل نظر ہو اور اس کی صحت مشتبہ ہو۔ ورنہ اگر عقل راہ راست پر قائم رہے اور بات قرآن و سنت کے ثابت شدہ نصوص کی ہو تو ان کے درمیان کبھی ٹکراؤ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر بظاہر ٹکراؤ نظر بھی آئے گا تو ہلکے سے غور و فکر سے وہ رفع ہو جائے گا۔ اور عقل و نقل کی ہم آہنگی بے غبار ہو کر سامنے آجائے گی۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے اپنی مذکورہ کتاب میں اس مسئلے پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔

اس کے ساتھ ہی اس مقام پر اس اہم ترین حقیقت کی نشاندہی بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے فلسفۂ جدیدہ کی تشکیل جدید کے بغیر چارہ نہیں۔ ضرورت اس

بات کی ہے کہ ایسے مسلمان مفکرین اور ارباب قلم سامنے آئیں جنھیں اسلام کے گہرے مطالعہ کے ساتھ ساتھ معاصر فلسفہ پر بھی عبور حاصل ہو اور اس میں اختصاص کا درجہ رکھتے ہوں۔ اسی صورت میں وہ صحیح معنوں میں فلسفۂ جدیدہ، اس کی تاریخ، اس کے اہم ترین مسائل اور اس کے تازہ ترین رجحانات کے سلسلے میں اسلام کے نقطۂ نظر سے بحث و نظر کا حق ادا کر سکیں گے۔ اسلام کی صداقت پر کامل یقین کے بغیر اس دائرے میں کسی قابل قدر اور قابل اعتماد کوشش کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ وہ لوگ جو خود مغربی افکار سے مرعوب ہیں اور جن کا اسلام کا مطالعہ سرسری اور سطحی اور اس پر یقین و ایمان کی دولت سے محروم ہیں، ان کی طرف سے اگر اس ذیل میں کوئی کوشش ہوتی بھی ہے تو وہ قابل اعتنا نہ ہوگی اور اعتماد تو اس پر ایک فیصد بھی نہیں کیا جا سکتا ہے[1]

علم الاخلاق و فلسفہ ہی کی ایک شاخ علم الاخلاق بھی ہے۔ فلسفہ ہی کی طرح اس کے بھی بے شمار مکاتب فکر ہیں اور اس کے ذیل میں بھی طرح طرح کے افکار و نظریات پائے جاتے ہیں۔ البتہ اسے عام معنوں میں علم کی مروجہ اصطلاح سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے جیسا کہ مشہور فرانسیسی فلسفی لیفی برول، کا کہنا ہے۔ اس لئے کہ علم، جس چیز کا نام ہے اس میں ان حقائق

---

[1] مسرت کا مقام ہے کہ مخلص اسلامی مفکرین کی طرف سے اس ذیل میں انتہائی قابل قدر کوششیں سامنے آچکی ہیں۔ مثال کے طور پر مختلف مصنفین کی مندرجہ ذیل کتابیں۔

(۱) ڈاکٹر محمد عبداللہ دراز: الدین (۲) محمد البہی: الجانب الالٰہی من التفکیر الاسلامی، الفکر الاسلامی الحدیث وصلتہ بالاستعمار الغربی نیز تہافت الفکر المادی التاریخی (۳) ندیم الجسر: قصۃ الایمان بین العلم والفلسفہ (۴) ڈاکٹر عبدالحلیم محمود: التفکیر الفلسفی فی الاسلام نیز الاسلام والعقل (۵) ڈاکٹر علی شامی نشار: نشأۃ الفکر الفلسفی فی الاسلام نیز مناہج البحث عند مفکری الاسلام۔ (مصنف)

کے متعلق گفتگو ہوتی ہے جو موجودہ ہوتی ہیں۔ جب کہ اخلاق کے اندر بحث اس سے ہوتی ہے کہ کیا ہونا چاہئے۔ فلسفہ کا موضوع بنیادی طور پر تین چیزیں ہیں: سچائی، بھلائی اور حسن و جمال۔ اخلاق کا موضوع ان میں سے 'بھلائی' اور اس سے تعلق رکھنے والے مسائل ہیں۔ جو ایک جانی پہچانی حقیقت ہے۔ ہمارے دور میں اس موضوع سے متعلق بہت سی بہتر ین کوششیں سامنے آئی ہیں جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:

۱۔ الفلسفۃ الخلقیۃ : ڈاکٹر توفیق الطویل
۲۔ المشکلۃ الاخلاقیہ والفلاسفۃ : ڈاکٹر عبدالحلیم محمود اور استاذ ابوبکر ھلال ذکری
۳۔ مباحث فی فلسفۃ الاخلاق : ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ
۴۔ کلمات فی مبادئ علم الاخلاق : ڈاکٹر عبداللہ دراز
۵۔ تہذیب الاخلاق : ابن مسکویہ

جہاں تک فلسفۂ اخلاق کے موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث و گفتگو کا سوال ہے تو اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ اس سلسلے کی سب سے جامع اور گہرائی کی حامل ڈاکٹر محمد عبداللہ دراز مرحوم کی کتاب 'دستور الاخلاق فی القرآن'[1] ہے۔

---

[1] ڈاکٹر دراز کی یہ کتاب اصلاً فرانسیسی میں تھی جسے موصوف نے ابتداءً سوربون یونیورسٹی سے فلسفہ اور سماجیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے پیش کیا تھا۔ اس کا عربی ترجمہ ڈاکٹر عبدالصبور شاہین نے کیا ہے جو وزارت اوقاف و شؤون اسلامی مراکش کی طرف سے چھپ رہا ہے، فرانسیسی ایڈیشن بھی تقریباً چالیس سے زائد سے نایاب تھا۔ وزارت مذکور کی طرف سے یہ فرانسیسی ایڈیشن بھی عنقریب ہی شائع ہونے والا ہے۔ (مترجم)

فن تربیت: مذکورہ بالا ان علوم کے علاوہ داعی کے لئے فن تربیت سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ جب کہ موجودہ تعلیمی نظام میں اس کی اہمیت غیر معمولی ہے اور ہر سطح پر اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کی بے شمار شاخیں ہیں اور اس کے نام پر مختلف شعبوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ (لیکن ایک داعی ان کا فائدہ صحیح طور پر اسی وقت اٹھا سکتا ہے جب کہ وہ انھیں اسلامی رنگ دے سکے اور اس میدان میں کئے گئے تجربات کی اسلام کے نقطۂ نظر سے جانچ پرکھ کر سکے۔) ورنہ تربیت کا موجودہ فلسفہ اس کا نقطۂ نظر اور اس کے رجحانات کی کورانہ تقلید کر کے وہ مطلوبہ نتائج تو کیا حاصل کر سکے گا مختلف پہلوؤں سے یہ چیز اس کے لئے مضرت رساں ہی ثابت ہوگی اس لئے کہ جیسا کہ ابھی اشارہ کیا گیا دیگر علوم و فنون کی طرح اس فن کے بھی بے شمار مکاتب فکر ہیں جن کا الگ الگ نقطۂ نظر ہے جن کے مابین بسا اوقات بعد المشرقین ہوتا ہے اور ایک کا نقطۂ سفر اگر ایک منزل کی طرف ہوتا ہے تو دوسرے کی سمت سفر اس کے بالکل مخالف ہوتی ہے۔

جہاں تک نفس اس فن کی اہمیت و ضرورت کا سوال ہے تو اس میں شک نہیں کہ داعی کے لئے تربیت کے اس فن کی اہمیت غیر معمولی ہے۔ اس لئے کہ 'دعوت' دراصل دوسرے لفظوں میں تربیت ہی کا دوسرا نام ہے۔ دونوں کا موضوع ایک ہے یعنی کہ انسان کے اندر کچھ خاص افکار و خیالات کا بیج بویا جائے اور اس کے جذبات و میلانات کو ایک خاص رخ عطا کیا جائے۔ اس طور پر کہ اس کے اندر کچھ مخصوص رجحانات کی آبیاری ہو سکے اور اس کے اخلاق و کردار ایک مخصوص سانچے میں ڈھل جائیں۔

اس طرح اگر ایک داعی کو مربی کا نام دیا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ اپنے اپنے دائرے میں ہر ایک وسائل و ذرائع تو الگ الگ اختیار کرے گا جن کے سلسلے میں اس گفتگو کی گنجائش تو ضرور باقی رہے گی ان میں کونسی چیزیں زیادہ بہتر اور قابل ترجیح ہیں لیکن اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ داعی کو بسا اوقات مربی کا فرض

انجام دینا ہوگا اور 'مربی' کے لئے اپنے کو 'داعی' کے روپ میں پیش کرنا پڑے گا۔

اس پس منظر میں دین کے ایک داعی کے لئے یہ بات ناگزیر ہوجاتی ہے کہ وہ علم تربیت کے مختلف شعبوں، اس دائرے میں کی گئی نت نئی تحقیقات اور اس فن کے ماہرین کے تجربات سے بھرپور طریقے سے فائدہ اٹھائے۔ اس طرح اسے یہ بات زیادہ بہتر طور پر معلوم ہوسکے گی کہ چھوٹوں کو سکھانے بتانے کے کیا طریقے ہیں اور بڑوں کو بتانے سمجھانے کے سلسلے میں کن اصولوں اور طریقوں کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ معاصر علم تربیت کے مطالعہ سے اسے اس بات کا بھی بہتر تجربہ ہوگا کہ مخاطب کے اوپر اثر انداز ہونے اور اس کے اندر اپنی بات کے لئے آمادگی پیدا کرنے کے سلسلے میں کن تدبیروں کے اپنانے اور کن امور کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ اپنے مخاطب کے سامنے بات کس طرح رکھی جائے اور اس کے ذہن و فکر کو اس کے لئے کیوں کر تیار کیا جائے۔ کس طرح اس کے اندر نیکی اور بھلائی کے جذبات کو ابھارا جائے اور بدی اور برائی کے محرکات سے اسے دور رکھا اور بچانے کی کوشش کی جائے۔ ان امور کے سلسلے میں آدمی کے اندر کما حقہ آگاہی اور واقفیت اسلامی نقطۂ نظر سے آشنا ہونے کے ساتھ ساتھ معاصر علم تربیت کے مطالعہ سے ہی حاصل ہوسکتی ہے البتہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اس فلسفۂ تربیت کو بالکل آنکھ بند کر کے اپنا لینا مفید مطلب نہ ہوگا اس لئے کہ اس کے اندر اگر قیمتی تجربات اور کام کی باتیں ہیں تو ساتھ ہی مضرت رساں اور نقصان دہ مواد بھی کافی بڑی مقدار میں موجود ہے اس لئے داعی اس کا صحیح فائدہ اسی صورت میں اٹھا سکے گا کہ جب کہ وہ اسلام کے نقطۂ نظر سے اس فن کی چھان پھٹک کر سکے اور اس کے اندر یہ فیصلہ کرنے کی استعداد پیدا ہوجائے کہ کونسی چیزیں اس کے اندر سے لینے کے قابل ہیں اور کن سے دور رہنے اور دامن بچا کر چلنے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں ہم داعی کو اپنے دور کے اسلامی مفکرین اور ارباب قلم کی درج ذیل تصنیفات کے مطالعہ کا مشورہ دیں گے :

فلسفۃ التربیۃ الاسلامیہ : ڈاکٹر عمر تومی شیبانی

فی اصول التربیۃ الاسلامیہ : ڈاکٹر عبد الغنی عبود

من الاصول التربویۃ فی الاسلام : ڈاکٹر عبد الفتاح جلال

منہج القرآن فی التربیۃ : استاد محمد شدید

نحو التربیۃ الاسلامیۃ الحرۃ[1] : مولانا ابوالحسن علی ندوی

---

[1] اس ذیل میں جناب افضل حسین ایم۔اے ایل۔ٹی کی کتاب 'فن تعلیم و تربیت' غیر معمولی قدر و قیمت کی حامل ہے۔ معاصر تعلیم و تربیت کے نظریات کو اسلام کے نقطۂ نظر سے جانچ پرکھ کر استعمال کرنے اور انھیں کام میں لانے کے سلسلے میں یہ ایک کامیاب کوشش ہے۔

علمی ثقافت

لیکن اس مقام پر ’علم‘ سے ہماری مراد اس کے وہ معنی نہیں ہیں جو اہل لغت کے یہاں سمجھے جاتے ہیں۔ نہ تو اس سے اس کا وہ اصطلاحی مفہوم مراد ہے جو زمانہ قدیم میں علمائے منطق، متکلمین اور فلاسفہ کے یہاں رائج تھا۔ اور نہ اس سے اس کا وہ اسلامی مفہوم ہی مراد ہے جس میں اسے قرآن وسنت میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس گفتگو میں ’علم‘ سے مراد اس کا وہ جدید اصطلاحی مفہوم ہے جو اہل مغرب کے یہاں رائج ہے۔ اور جسے جدید دنیا میں ایک معروف اصطلاح کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ چنانچہ ہر جگہ ’علم‘ کے نام پر اسی چیز کا چرچا ہے۔ اس جدید اصطلاح کی رو سے علم اس چیز کا نام ہے جسے تجربہ ومشاہدہ کی بنیاد پر ایک حقیقت مسلمہ کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہو، جسے جانچا اور پرکھا جاسکتا ہو اور کچھ دوسری چیزوں پر اسے قیاس کرنے کی گنجائش ہو۔ مثال کے طور پر علم طبیعیات، علم الکیمیا، نباتیات اور حیوانیات، ارضیات، فلکیات، علم طب اور اس کی مختلف شاخیں وغیرہ۔ بالفاظ دیگر ’علم‘ سے اس مقام پر ہماری مراد سائنس اور علوم سے سائنسی علوم ہیں۔

اس سلسلے میں دین کے ایک داعی سے ہمارا یہ مطالبہ نہیں کہ وہ ان سائنسی علوم کی تہ میں اتر کر پوری گہرائی کے ساتھ ان کا مطالعہ کرے۔ اس لئے کہ دعوت کے دیگر تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس مختصر سی حیات مستعار میں یہ چیز ممکن نہیں ہوسکتی ہے۔ یہ ایک ایسا بوجھ ہوگا جسے اٹھانا انسان کے بس سے باہر ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب کہ آج سائنسی علم ایک اتھاہ سمندر ہوگیا ہے جس کی ایک تہ کو انسان چھونے کے قریب آتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ ابھی بے شمار تہیں ہیں جن تک اس کی رسائی نہیں ہوسکی ہے۔

ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ صرف یہ کہ داعی کو اس سلسلے کا ایک عمومی مطالعہ ضرور ہونا چاہئے سائنسی علوم کے سلسلے میں ایسی کتابیں برابر چھپتی رہتی ہیں اور رسائل وجرائد میں اس طرح کے مضامین بھی شائع ہوتے رہتے ہیں جن کے مخاطب ان فنون کے ماہرین نہیں بلکہ عام پڑھے لکھے لوگ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے اس سے کمتر معیار کی توقع ایک داعی سے نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس پہلو سے اسے ان علوم سے یکسر بے بہرہ رہنا زیب نہیں دیتا ہے۔ لیکن اس کا حق بھی وہ اسی وقت ادا کرسکتا ہے جب کہ اس سے پہلے تعلیم کے ابتدائی مراحل میں اس نے اس سلسلے کی بنیادی چیزوں کو پڑھ لیا ہو اور ان کے اصول وکلیات سے واقفیت بہم پہنچائی ہو۔ اس لئے کہ کسی فن کی مبادیات اور اس کی موٹی موٹی باتوں سے واقفیت بہم پہنچائے بغیر کوئی شخص اس کے عمومی مباحث کو بھی سمجھنے اور اس کے نکات کو گرفت میں لینے کے قابل نہیں ہوسکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس دور میں ہر پڑھے لکھے آدمی کے لئے اس ’علمی ثقافت‘ سے آراستہ ہونا ایک ناگزیر ضرورت بن گئی ہے۔ یہی پڑھا لکھا طبقہ داعی کا اولین مخاطب ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں اس کے لئے اس ’ثقافت‘ سے واقفیت کی جیسی کچھ اہمیت ہوسکتی ہے اس کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ داعی کی کے لئے اس واقفیت کی ضرورت مختلف پہلوؤں سے ہے۔

۱ ۔ پہلی بات تو یہ کہ اس کے بغیر معاصر دور کی زندگی کو صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ آج زندگی کے معاملات میں یہ علوم اس طرح سرایت کر گئے ہیں جس طرح رگوں میں خون سرایت کئے ہوتا ہے اور ہر سطح پر ان کے اثرات نمایاں ہیں۔ آج کوئی گھر ایسا نہیں جو جدید سائنس کی کرنوں سے ضیا بار نہ ہو رہا ہو۔ ہر گھر میں بجلی موجود ہے۔ اور زندگی کو آسان بنانے والی دوسری بے شمار سہولتیں میسر ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کی فیض رسانی مسجد و محراب تک وسیع ہو چکی ہے آج تقریباً ہر مسجد میں ایک دیوار گھڑی موجود ہوتی ہے۔ اذان اور نماز کے لئے لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ایک عام بات ہے۔ اس کے علاوہ مسجد میں آب رسانی اور سردی و گرمی سے محفوظ رہنے سے متعلق سہولتیں بھی بالعموم دستیاب ہیں۔ یہ تمام چیزیں اسی جدید سائنس کا عطیہ ہیں۔ دین کے ایک داعی کے لئے یہ بات کسی صورت زیب نہیں دیتی کہ وہ اپنے شب و روز بسر کرے تو ایک ایسی دنیا میں جس کی باگ ڈور تمام تر سائنس کے ہاتھ میں ہو اور اس کے بغیر زندگی کی گاڑی ایک قدم آگے حرکت نہ کر سکتی ہو، لیکن اسے اس سائنس کی مبادیات اور اس کی موٹی موٹی باتوں کا بھی کچھ پتہ نہ ہو۔

۲ ۔ دوسری بات یہ کہ ان سائنسی علوم کے اندر بے شمار ایسے مضامین بھی موجود ہیں جن سے متعلق کتابوں میں ان پر بھرپور مواد فراہم کیا گیا ہے اور خوب خوب بحثیں کی گئیں ہیں۔ اور ان سب کا منشا یہی ہے کہ مذہب کے سلسلے میں ذہنوں کے اندر شکوک و شبہات پیدا کئے جائیں اور اس کی تعلیمات کو غلط اور بے بنیاد ثابت کیا جائے۔ مثال کے طور پر ڈارون کا پیش کردہ نظریہ ارتقاء جس کی رو سے کائنات اور اس کے اندر بسنے والی تمام مخلوقات اپنے آپ نشو و ارتقا کے مراحل طے کرتے ہوئے وجود پذیر ہوئی ہیں (ان کے پیچھے کسی ما فوق الفطری ارادے کی کارفرمائی نہیں ہے) دین کے ایک داعی کو اس طرح کے نظریات کے سلسلے میں ضروری حد تک معلومات لازماً ہونی چاہئیں۔ اور اسے اس پوزیشن میں ہونا چاہیے کہ وہ علمی طور پر اس کی قدر و قیمت کو متعین کر سکے۔

اسی صورت میں وہ ان نظریات کے سلسلے میں کوئی دو ٹوک رائے دے سکے گا۔ اور اس قابل ہو سکے گا کہ ان کے تئیں ایک متعین موقف اختیار کر سکے۔ سرسری معلومات اور سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر وہ ان کے سلسلے میں کوئی وزن دار بات نہ کہہ سکے گا۔ یقیناً جب تک آدمی کو کسی مسئلہ پر فی الجملہ نظر نہ ہو اس کے سلسلے میں موافق یا مخالف کوئی وزن دار بات کہنے کے قابل وہ ہو بھی کیسے سکتا ہے؟

۳ ۔ تیسری بات یہ کہ ان علوم کی روشنی میں جو بہت سے علمی حقائق سامنے آئے ہیں ان کے ذریعہ ایک داعی حق دینی حقائق کی تائید و توثیق اور اس سے متعلق مسائل و معاملات کی توضیح و تشریح کا کام لے سکتا اور انھیں اسلام کے دفاع کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان کی مدد سے دشمنان اسلام کے پیدا کردہ شکوک و شبہات اور اس پر لگائے گئے بیجا الزامات و اتہامات کا جواب بھی فراہم کر سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل گفتگو کی روشنی میں اس حقیقت کو نسبتہً آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے :

۱ ۔ ان تجرباتی علوم کی مدد سے اور ان کی زبان اور مصطلحات کو کام میں لاتے ہوئے اسلامی عقائد کے بہت سے اجزا نیز ان کے علاوہ بے شمار دیگر دینی حقائق کو معاصر دور کے انسان کے ذہن و مزاج کے لئے نسبتہً زیادہ قابل قبول اور قریب الفہم بنایا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اثبات وجود باری تعالیٰ کے مسئلہ ہی کو لے لیجئے جو دین کے مسائل میں سرفہرست اور سب پر مقدم ہے۔ علم جدید اس کے سلسلے میں انتہائی موثر اور تعمیری کردار ادا کر سکتا ہے۔ اور اس کی مدد سے مادہ پرستوں اور بے دینوں اور ملحدوں کی طرف سے پھیلائے گئے فاسد خیالات اور ان کے باطل افکار و نظریات کا تریاق بہت آسانی کے ساتھ فراہم کیا جاسکتا ہے۔ ان سائنسی علوم کی مدد سے اپنے دعویٰ کے حق میں ایسے مضبوط دلائل سامنے لائے جاسکتے جن کے ذریعہ منکرین خدا کی طرف سے شکوک و شبہات کے جو جال بچھائے گئے ہیں ان کے تمام تر تار و پود بکھرتے نظر آئیں

گے۔ ریاضی، فلکیات، طبیعات، علم الکیمیا، حیوانیات، نباتیات، طب جدید وغیرہ ان تمام علوم کے اندر ہمیں وہ مواد مل سکتا ہے جس کے ذریعہ وجود باری تعالیٰ کے مسئلے کو ایک بدیہی حقیقت کے طور پر واشگاف انداز میں ثابت کیا جاسکتا ہے۔ جس کا بہترین نمونہ اے کریسی موریسون کی کتاب 'الانسان لایقوم وحدہ' ہے[1] جس کا عربی ترجمہ 'العلم یدعوالی الایمان' کے نام سے ہمارے سامنے آچکا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے دور کے چالیس امریکی سائنس دانوں کے بیانات پر مشتمل تصنیف 'اللّٰہ یتجلّٰی فی عصر العلم'[2] بھی اس کا ایک اچھا نمونہ پیش کرتی ہے۔ ڈاکٹر احمد زکی کی کتاب 'مع اللّٰہ فی السماء' کو بھی ہم اس سلسلے کی ایک بہترین کوشش قرار دے سکتے ہیں۔

یہ تو خیر اغیار کی کاوشوں کا ذکر تھا مسلمان دانشور اور ارباب قلم بھی اس میدان میں پیچھے نہیں رہے ہیں۔ چنانچہ اس پہلو سے دینی حقائق کے اثبات کے سلسلے میں ان کی طرف سے بھی بہت سی بہترین کوششیں سامنے آچکی ہیں جس کے سلسلے میں ہم شیخ ندیم الجسر کی کتاب 'قصۃ الایمان بین الدین والعلم والفلسفۃ' اور ہندوستانی اہل قلم جناب وحید الدین خاں کی بہترین کتاب 'الاسلام یتحدی (علم جدید کا چیلنج)' کا حوالہ دے سکتے ہیں موخر الذکر کے مُراجع ڈاکٹر عبد الصبور شاہین نے اس کا ایک ذیلی نام بھی تجویز کیا ہے جو اس میں شک نہیں کہ اس کے مضامین کے عین ہم آہنگ ہے۔ یعنی 'مدخل علمی للایمان' (ایمان تک رسائی سائنس کے دروازے سے)

قدیم زمانے میں فلاسفہ و متکلمین اس بات کو بعید از امکان بلکہ ناممکنات سے تصور کرتے

---

[1] اے کریسی موریسون A. Crassy Morrison کی یہ کتاب 'Man does not stand alone' اب ہمارے یہاں اہل علم میں متداول ہے۔ (مترجم)
[2] یہ جان کلور مونزما Jhon Clover Monsma کی مرتب کردہ کتاب 'The Evidence of God in an Expanding World' ہے جس کا اُردو ترجمہ 'خدا موجود ہے' اب ہندوستان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ مصنف موصوف نے غالباً سبقت قلم سے ان سائنس دانوں کی تعداد بجائے چالیس کے تیس بتلادی تھی ہم نے حاشیہ میں اسے ٹھیک کردیا ہے۔ (مترجم)

تھے کہ دنیا کی اس زندگی کے بعد آدمی آخرت میں اپنے اعمال کو ان کی اصل شکل وصورت میں دیکھ سکے گا۔ اس لئے کہ ان کے خیال کے مطابق اعمال کا شمار اعراض میں ہوتا ہے جن کا خاصہ یہ ہے کہ وہ دو اوقات تک باقی نہیں رہ سکتے۔ اسی بنا پر وہ قرآن حکیم کی اس طرح کی آیات:

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ	(زلزال - ۶)	اس روز لوگ مختلف جتھوں میں پلٹیں گے تاکہ انھیں ان کے 'اعمال' دکھائے جائیں۔

نیز

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِن سُوءٍ	(آل عمران - ۳۰)	اس دن جب کہ ہر شخص نے جو بھلائی کی ہوئی ہوگی اسے اپنے روبرو دیکھے گا اور جو برائی کی ہوگی (وہ بھی اس کے سامنے موجود ہوگی)۔

کی تاویل اس طرح کرتے تھے کہ ان مقامات پر 'اعمال' سے مراد ان کی جزاء اور ان کا بدلہ ہے یعنی لوگ اپنے اعمال کی جزاء اور ان کے بدلے کو دیکھیں گے۔ لیکن آج جدید سائنس کی بدولت یہ حقیقت طشت ازبام ہو چکی ہے کہ انسان کے ہر قول وفعل کا ریکارڈ فضا میں موجود ہے۔ اور بہت آسانی کے ساتھ ان کو گرفت میں لایا جاسکتا، ان کی فلم بنائی جاسکتی اور انھیں محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ اور طویل سے طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی جب چاہیں ان کو مشاہدہ میں لاسکتے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک انسان اس طرح کا کوئی آلہ تیار کرنے میں تو کامیاب نہیں ہوسکا ہے لیکن سائنس جس رفتار سے ترقی کر رہی ہے اس کی روشنی میں یہ چیز بعید از امکان نہیں رہ جاتی ہے۔

اس کا مطلب ہوا کہ انسان نے اپنی پوری مدت حیات میں جو کچھ کہا یا کیا ہوگا، ایک 'فلم' کی صورت میں اس کے سامنے اس پورے ریکارڈ کو پیش کر دیا جائے گا جو اس کے ہر قول

فعل کی زندہ تصویر پیش کر رہا ہوگا۔ جس میں کسی چیز کے چھوٹنے اور شمار میں نہ آنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح ہر انسان گویا اپنے اعمال کو کوئی مجاز و کنایہ نہیں بلکہ حقیقت کے روپ میں اپنے سامنے دیکھ لے گا۔

۲۔ شریعت کے احکام میں انسان کے لئے مصالح کے حصول اور مفاسد سے بچنے کی جو بات کہی گئی ہے، آج جدید سائنس کی طرف سے ان کے سلسلے میں جو تحقیقات اور انکشافات سامنے آچکے ہیں ان سے ان دینی حقائق کی بھرپور تائید و توثیق ہوتی ہے۔ ایک سچے مسلمان کے لئے اگر یہ چیز مسرت و انبساط کا جانفزا پیام عطا کرتی اور اس کے ایمان پر اضافے کا موجب بنتی ہے تو دوسری طرف وہ لوگ جو شریعت اسلامی کی جامعیت و کاملیت نیز ہر دور اور ہر زمانے کے لئے اس کے قابل عمل ہونے کی صلاحیت کے سلسلے میں شکوک و شبہات رکھتے اور اس کے تئیں طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، اس طرح کے لوگوں کے لئے یہ چیز تازیانے کا کام دیتی اور ان کی تمام مخالفانہ حرکتوں پر پانی پھیر دینے کے لئے بالکل کافی ہے۔

مثال کے طور پر آج شراب کے سلسلے میں جو جدید طبی تحقیقات سامنے آچکی ہیں ان کی روشنی میں اس حقیقت کا اندازہ زیادہ بہتر طور پر کیا جاسکتا ہے کہ آدمی کے ذہن و دماغ ہی نہیں اس کے جسم پر بھی اس کے کس قدر غیر معمولی مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ پھر معاملہ انفرادی کا نہیں اس سے پورا خاندان بلکہ پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے اس کے نتیجے میں کوئی سماج روحانی اور اخلاقی طور پر جس دیوالیہ پن کا شکار ہوتا ہے وہ اپنی جگہ، مادی حیثیت سے بھی اس کا اسے ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔

ان تحقیقات کی روشنی میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام نے شراب کی اس کی اس کی تمام قسموں کے ساتھ حرام اور اس کی خرید و فروخت کی جملہ صورتوں کو ممنوع قرار دے کر کس قدر

بیدار مغزی اور بالغ نظری اور حکمت اور دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے۔

پھر اسی دائرے کو مزید وسعت دیتے ہوئے اسلام نے ہر نشہ آور چیز کو خواہ وہ تھوڑی مقدار میں ہو یا زیادہ، نیز یہ کہ وہ جس صورت میں بھی پائی جاتی ہو، حرام اور ممنوع قرار دیا ہے۔ آج انسان کے ذہن و دماغ کو ماؤف اور اس کے احساس و شعور کو بیکار کرنے والی اشیاء (مخدرات) کا استعمال عام ہے اور اس کی بے شمار صورتیں رائج ہیں۔ جو لوگ بھی ان مخدرات کے عادی ہیں ان کی زندگیوں پر ایک نظر ڈالنے ہی سے اس کے بے پناہ مضر اثرات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ انفرادی حیثیت میں اس طرح کے لوگوں کو مادی نقصانات کے علاوہ جو زبردست اخلاقی اور نفسیاتی نقصانات پہنچتے ہیں اس کا اندازہ تو خیر ہر شخص کر سکتا ہے بحیثیت مجموعی پورے معاشرے کو اس کی جو قیمت چکانی پڑتی ہے اہل نظر اس سے کچھ ناواقف نہیں ہیں۔

اسی طرح مثال کے طور پر اسلام نے زنا کو حرام اور ایک قابل تعزیر جرم قرار دیا ہے۔ آج جدید طبی تحقیقات کی روشنی میں مرد و عورت ہر ایک کے لئے مختلف پہلوؤں سے اس کے جو عظیم نقصانات بالکل سامنے کی حقیقت بن گئے ہیں اسے دیکھ کر اسلام کی صداقت و حقانیت پر آدمی کے اعتقاد میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ کسی بھی سماج کے اندر زنا کاری کے انتشار سے مردوں اور عورتوں کی صحت و تندرستی پر جو مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں اور جس طرح لوگ وبائی طور پر جنسی امراض کا شکار ہوتے ہیں، اس کے علاوہ اس کی وجہ سے متوازن طور پر افزائش نسل کا عمل جس بری طرح متاثر ہوتا ہے جب کہ اسی پر انسانی سماج کی بقا کا انحصار ہے۔ نیز اختلاط نسب کی جو وبا پھوٹتی ہے اور خاندانی نظام کا شیرازہ جس طرح منتشر ہوتا ہے اور ان سب کے نتیجے میں لوگوں کے اخلاق و کردار جس طرح برباد ہوتے اور پورا سماج اخلاقی گراوٹ کے جس گرداب میں آپھنستا ہے وہ سب اس پر مستزاد ہے۔ قرآن نے اس مختصر سی آیت میں ان تمام حقائق کو

سمیٹ دیا ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً   اور زنا کے قریب مت جاؤ۔ یہ (کھلی ہوئی) بے حیائی
وَسَآءَ سَبِيْلًا   (اسراء - ۳۲)   ہے اور بہت بُرا راستہ ہے۔

اس طرح مثلاً حیاتیات، علم الاعضاء نیز طب جدید کے مختلف شعبوں کے ذیل میں جو تحقیقات ہمارے سامنے آئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان پیدائشی طور پر کتنا فرق ہے اور دونوں کی ساخت اور ان کے رجحانات و میلانات میں کتنا زبردست تفاوت پایا جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ فرق اور یہ تفاوت بلاوجہ نہیں ہو سکتا ہے۔ پس زندگی کی دوڑ میں ان میں سے ہر ایک کے لئے قانون وضع کرنے، ان کی تعلیم و تربیت نیز ان کے لئے سماجی اور معاشی جدوجہد کے دائرہ کار کے تعین کے سلسلے میں اس چیز کو لازماً ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ اسے نظر انداز کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ زندگی کی گاڑی صحیح پٹری سے اتر جائے اور سماج کو ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑے۔ مرد اور عورت کی شخصیت کے صحت مند اور متوازن ارتقاء نیز فی الجملہ پورے سماج کی بھلائی اور بہتری اس سے وابستہ ہے کہ زندگی کی دوڑ میں دونوں کا دائرہ کار الگ الگ ہو۔ ہر ایک کو کرنے کا وہ کام ملے جو اس کی فطری صلاحیتوں کے مطابق اور اس کے ذہن و مزاج اور رجحانات و میلانات سے ہم آہنگ ہو۔ ان جدید تحقیقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان دونوں کی صلاحیتوں کا بہتر اندازہ کیا جا سکتا، اور ان کے لئے دائرہ کار کا تعین اس طور پر کیا جا سکتا ہے جو ان دونوں کی فطرت کے عین مطابق ہو۔ اس سے ہٹ کر جو راہ بھی اپنائی جائے گی۔ وہ فطرت سلیمہ سے انحراف کی راہ ہوگی جس کا انجام تباہی و بربادی کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا ہے۔

اس موقعہ پر ہمارے لئے موجودہ دور کے تجرباتی سائنس کے مشہور اسکالر ڈاکٹر الکسیس کاریل کے درج ذیل خیالات کا نقل کر دینا کافی ہوگا جس کا اظہار انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب

'الانسان ذٰلک المجہول' (انسان — جس کی حقیقت ہنوز پردۂ راز میں ہے) میں کیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"مرد اور عورت کی فطری صلاحیتوں اور ان کے میلانات و رجحانات کے درمیان جو زبردست فرق پایا جاتا ہے، اس کی وجہ ان کے جنسی اعضاء کا جداگانہ نوعیت کا حامل ہونا یا عورت کے جسم میں رحم کا وجود اور اس کا حمل کی تکلیف برداشت کرنا وغیرہ نہیں۔ اور نہ اس کا سبب یہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں کی پرورش و پرداخت اور ان کی تعلیم و تربیت میں الگ الگ طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ بلکہ اس تفاوت کا سبب کچھ اور ہے اور اس کی جڑیں بہت گہرائی تک اتری ہوئی ہیں جس کا سرا عین ان کی پیدائش سے ملا ہوا ہے۔ مرد اور عورت کے مادۂ تخلیق ہی میں مختلف نوعیت کے غدود پائے جاتے ہیں اور ان کے وجود کو تشکیل دینے والے اجزاء ترکیبی خود جداگانہ خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ مرد اور عورت کے جسمانی اعضاء کی جداگانہ کارکردگی اور ان کے الگ الگ رجحانات و میلانات ان کے مادۂ تخلیق کے اسی جوہری اختلاف کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ آج جو لوگ آزادی نسواں، کی تحریک کا علم بلند کئے ہوئے ہیں اور اس بات کی وکالت کرتے ہیں کہ مرد اور عورت دونوں کی دلچسپی کا میدان ایک ہے اور زندگی کی دوڑ میں یکساں نوعیت کی ذمہ داریاں ان کے سپرد کی جانی چاہئیں۔ انھوں نے مرد اور عورت کے جداگانہ طرز تخلیق اور اپنی فطری صلاحیتوں کے مذکورہ جوہری تفاوت کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مختلف پہلوؤں سے عورتوں کا معاملہ مردوں سے بالکل جداگانہ نوعیت کا حامل ہے۔ عورت کے جسم کا ہر خلیہ اپنی الگ خصوصیات رکھتا ہے، اسی طرح اس کے جسم کے تمام اعضاء بالخصوص اس کا اعصابی نظام بالکل الگ نوعیت کا حامل ہے۔ اس پس منظر میں عورت کے جسمانی نظام کی مثال ہم کائنات کے نظام شمسی سے دے سکتے ہیں جس طرح انسان اس شمسی نظام کے سامنے سپر ڈالنے کے لئے مجبور ہے اور اس

کی کارکردگی میں سرمو تبدیلی لانے سے عاجز ہے اسی طرح عورت اور مرد کے جداگانہ جسمانی نظاموں کے سلسلے میں بھی انسان بالکل بے بس ہے۔ اور فطرت نے ہر ایک کے لئے جو دائرہ کار اور ہر ایک کی جو خصوصیات اور استعدادات قرار دے دی ہیں آدمی چاہے نہ چاہے ان کی رعایت کرنے کے لئے مجبور ہے۔ پس اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ مرد اور عورت کے ذوق و مزاج میں بنیادی نوعیت کا تفاوت ہے اور ہر ایک کے رجحانات و میلانات جداگانہ ہیں۔ سمجھ داری اور انصاف کی بات یہ ہے کہ عورت حقیقت واقعہ سے آنکھیں موندتے ہوئے مردوں کی نقل اتارنے کے بجائے اپنی مخصوص صلاحیتوں کو پروان چڑھانے اور انھیں نشو و نما دینے کی طرف توجہ کرے اور زندگی کی دوڑ میں فطرت نے اس کے لئے جو سمت سفر مقرر کی ہے الٹے پاؤں چلنے کے بجائے اسی مطلوبہ سمت میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ تہذیب کے ارتقاء اور سماج کی گاڑی بڑھانے کے سلسلے میں عورت کے اس مخصوص کردار اور اس کے جداگانہ دائرہ کار کی اہمیت مرد کی دوڑ دھوپ اور اس کی جد و جہد سے ذرا بھی کم نہیں۔ بلکہ بعض پہلوؤں سے اس کی اہمیت اس سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ عورت اپنے حقیقی دائرہ عمل کو چھوڑ کر فطرت سے جنگ کے جرم کی مرتکب تو ہوگی ہی تمدن کے صالح ارتقاء پر اس کے جو اثرات مرتب ہوں گے ان کی خطرناکی کچھ کم نہ ہوگی۔"

آگے یہی مصنف مزید رقم طراز ہے:

"عورت کا بچہ جننا اور زچگی کے مراحل سے گذرنا، اس کی شخصیت کی اٹھان اور اس کے صحت مند ارتقاء کے پہلو سے کس قدر غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے عام طور پر لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں عورت کے حق میں اس سے بڑھ کر بے عقلی اور غیر دانشمندی کی بات کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ اسے ماں ہونے سے باز رکھا جائے۔ زندگی کی دوڑ میں مرد اور عورت کا دائرہ عمل ایک نہ ہو سکتا، نہ وہ زندگی کے اندر ایک ہی نہج و انداز کی پیروی کر سکتے ہیں اور نہ ایک ہی آئیڈیل کو ہر ایک

کے لئے اپنا مطمح نظر قرار دینا درست ہوگا۔ تعلیم و تربیت اور پرورش و پرداخت کی ذمہ داری جن لوگوں کے بھی سپرد ہے ان کا فرض ہے کہ وہ مرد اور عورت کے مابین ان ذہنی اور جسمانی فروق و اختلافات کو پورے طور پر ملحوظ رکھیں۔ کہ یہ وہ چیزیں ہیں جو پیدائشی طور پر ان کے اندر ودیعت ہیں۔ لاکھ کوشش کر ڈالی جائے ان اختلافات کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر انسانی تمدن کا صحت مند ارتقاء مطلوب ہے اور دنیا کو تباہی و بربادی سے بچانا ہے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا اور زندگی کی دوڑ میں اس کی رعایت ملحوظ رکھنے پڑے گی۔"

۳۔ اس کے علاوہ ایک دوسرا میدان بھی ہے جس میں ہم جدید سائنسی تحقیقات کو دینی حقائق کی تائید و توثیق کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ہمیں قرآن و سنت کے مدلولات میں ذرا گہرائی پیدا کرنی، اور ان کے مفہوم و مدعا کے دائرے کو تھوڑی وسعت دینی پڑے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ سائنس کی نت نئی تحقیقات اور اس کے نتائج فکر کی بدولت ہم ان کے مدعا کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے اور ان کے سلسلے میں مزید گہرائی تک اتر سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر شہد کے سلسلے میں قرآن اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے:

يَخْرُجُ مِنْ بُطُونِهَا شَرَابٌ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ ۔ (نحل - ۶۹)	(ان شہد کی مکھیوں) کے پیٹ سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے مختلف رنگتوں کی حامل۔ اس کے اندر بڑی شفا ہے لوگوں کے لیے)

آج نباتات و حیوانیات، کیمیا، طب اور علم الاغذیہ وغیرہ جس قدر آگے بڑھ چکے ہیں اور ان کے دائرے میں تحقیق و تفتیش کے جو نت نئے طریقے ایجاد ہو چکے ہیں ان کی مدد سے اس حقیقت کو زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ شہد کے اندر وہ کونسے کیمیاوی اجزاء ہیں جن کے سبب اس کے اندر شفا بخشی کی یہ قوت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کی مختلف رنگتیں کیونکر وجود میں آئی ہیں؟

اور ہر رنگ کی اگر کچھ الگ خصوصیات ہیں تو وہ کیا ہیں نیز یہ کہ اس کا سارا مرحلہ اس خوش اسلوبی کے ساتھ کیونکر انجام پاتا ہے ؟

اسی طرح مثال کے طور پر اشیاء کائنات کے سلسلے میں قرآن اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (قمر - ۴۹) ہم نے ہر چیز کو ایک اندازہ سے پیدا کیا ہے۔

نیز یہ کہ :

خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا۔ ہر چیز اس نے پیدا کی پھر اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ قائم کیا۔ (فرقان - ۲)

اب تک قرآن کے اس بیان کو سادہ انداز میں سمجھ لیا جاتا تھا لیکن آج جدید سائنس اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ اشیاء کائنات میں اس اندازہ کرنے کی کیفیت کو زیادہ باریک بینی کے ساتھ بیان کر سکتی اور اس کے سلسلے میں انتہائی نازک حقائق کی نشاندہی کر سکتی ہے۔ مثال کے طور پر زمین کا ایک خاص حجم، سورج سے اس کا ایک خاص فاصلے پر ہونا اور ایک خاص رفتار سے اس کے گرد گردش کرنا، اسی طرح چاند کا زمین سے ایک خاص فاصلے پر ہونا اور ایک خاص رفتار سے اس کے گرد گردش کرنا، پھر خود زمین کا ایک خاص تناسب کے ساتھ خشکی اور تری پر مشتمل ہونا اور پانی اور سمندروں میں پانی کی ایک متعین مقدار اور خشکی کے علاقوں کا ایک مخصوص تناسب، پھر اس کے اندر بھی ایک خاص تناسب اور ایک خاص اندازے سے ندی نالوں اور گڈھے تالابوں کا ہونا وغیرہ وغیرہ یہ تمام باتیں اس حقیقت کا پتہ دیتی ہیں کہ اشیاء کائنات کے ایک خاص اندازے پر ہونے کی جو بات قرآن کی مذکورہ بالا آیتوں میں کہی گئی ہے وہ کتنی گہرائی اور گیرائی کی حامل ہے۔ کتنی زبردست قدرت اور حکمت ہے جو ان تخلیقات کے پس پشت کارفرما ہے۔ کوئی شک نہیں کہ ان حقائق کو معلوم کر کے قرآن کی صداقت وحقانیت پر ہمارے یقین میں اضافہ ہوتا اور قلب و دماغ طمانیت کی اعلیٰ ترین کیفیات سے سرشار ہوتے ہیں۔

اسی طرح مثلاً جب قرآن حق تعالیٰ کے محامد بیان کرتے ہوئے یہ کہتا ہے :

الَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ (اعلیٰ - ۳) (جس نے اندازہ قائم کیا پھر راہ دکھائی)

اور : الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ (طٰہٰ : ۵۰) (جس نے ہر چیز کو اس کی صورت عطا کی، پھر راہ بتائی)

تو جدید سائنس کی مدد سے کائنات کے اندر خداوند تعالیٰ کے راہ دکھانے کی کیفیت کو زیادہ وسعت اور گہرائی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔ سورج، چاند اور ستارے، سمندر، دریا اور پہاڑ اسی طرح انسان اور حیوان، نباتات اور جمادات ہر ایک کے اندر ہم اس راہ دکھانے کی کیفیت کو جداگانہ نوعیت میں محسوس کر سکتے ہیں۔ ہر ایک کا متعین راستہ ہے جس پر وہ گامزن ہے اور اپنے مقصد کو پورا کرنے میں لگا ہوا ہے۔ پھر یہ کہ پورے کائناتی نظام میں ایسی سازگاری نظر آتی ہے جس سے لگتا ہے کہ ہر ایک دوسرے کو اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں دیکھنے کے لئے بے چین اور مضطرب ہے۔ کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز میں اس اصول کی کارفرمائی نظر آتی ہے، ذرہ ہو یا پہاڑ ہر ایک اپنے طرز اور روش سے اس حقیقت کا پتہ دیتا ہے۔

۴ - اس کے علاوہ ایک چوتھا دائرہ بھی ہے جس میں جدید سائنسی تحقیقات سے دینی حقائق کی بھرپور طریقے پر تصدیق ہوتی نظر آتی ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کا انکشاف قرآن نے آج سے چودہ سو برس پہلے کر دیا تھا جب کہ سائنسی انکشافات کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا جیسا کہ قرآن کے علمی اعجاز پر گفتگو کرتے ہوئے اس سے پہلے ہم اس کی کچھ تفصیل بیان کر چکے ہیں۔

البتہ ہمارے زمانے میں اکثر و بیشتر لوگ اس کے سلسلے میں افراط و تفریط کی دو انتہاؤں پر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے اگر اس پہلو سے قرآنی حقائق کی توضیح و تشریح کے سلسلے میں غلو پسندی سے کام لیا ہے تو دوسرے لوگ اس انداز سے قرآنی اعجاز پر گفتگو کو سرے سے روا ہی نہیں رکھتے۔ حالاں کہ صحیح راہ اس کے بیچ ہے۔ اگر سائنس کے ہر نئے انکشاف کی تصدیق کی

کسی صورت سے کھینچ تان کر قرآن سے کرانے کی روش پسندیدہ نہیں تو اس پہلو کو یکسر نظر انداز کر دینے کے رویہ کو بھی قابلِ تعریف قرار نہیں دیا سکتا ہے۔ ہم افراط و تفریط کے درمیان اسی جادۂ اعتدال کے قائل ہیں۔ سائنس کی موافقت تلاش کرنے کی غرض سے ہم قرآنی آیات کی دور از کار تاویلیں ایجاد کرنے کے قائل نہیں، نہ اسے پسند کرتے ہیں کہ خواہ مخواہ قرآنی الفاظ و تراکیب کو ان کے ظاہری لغوی مفاہیم سے نکال کر ان کو نت نئی تعبیرات کا جامہ پہنائیں۔ سائنس کے مفروضے جن کی مدتِ حیات کا کچھ پتہ نہیں ان کے چکر میں قرآن کے ثابت شدہ حقائق میں توڑ مروڑ کی کوشش کو ہم کسی صورت جائز قرار نہیں دے سکتے۔ عام انسانوں کے لئے قرآنی حقائق کو قریب الفہم بنانے کے لئے ہم سائنس جدید کے انکشافات سے فائدہ اٹھانے کو غلط تصور نہیں کرتے البتہ یہ چیز اسی وقت تک محمود قرار پا سکتی ہے جب کہ قرآن کی بالادستی قائم رہے اور اس کی ابدیت و حقانیت پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔

عصرِ حاضر میں قرآنی حقائق کی تفہیم و تشریح کے پہلو سے جادۂ اعتدال پر قائم رہتے ہوئے جدید سائنسی تحقیقات سے جن لوگوں نے استفادہ کیا ہے ان میں نمایاں مثال علامہ رشید رضا مصری کی ہے جنھوں نے اپنی شاہکار تفسیر قرآن 'المنار' میں اس پہلو سے خوب خوب دادِ تحقیق دی ہے۔ 'الوحی المحمدی' میں یہ رنگ اور بھی نمایاں ہے جو تفسیر سے الگ کتابی صورت میں متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قرآن نے کائنات کی پیدائش اور انسانی تاریخ کے سلسلے میں جو باتیں ہمیں بتائی ہیں ان کے تئیں اس کا اعجاز دو پہلوؤں سے ہے۔ یہ ایک ایجابی معجزہ ہے اس لئے کہ اس سلسلے میں قرآن نے جو باتیں کہی ہیں ماضی قریب میں جدید سائنسی انکشافات اور تازہ ترین تاریخی حقائق کے سامنے آنے سے پہلے واقعہ یہ ہے کہ ان کی معنویت صحیح طور پر سمجھی نہیں جا سکتی تھی زمانہ نزولِ قرآن میں

لوگ اجمالی طور پر اس طرح کی آیات قرآنی کا مفہوم تو سمجھ سکتے تھے لیکن اس کی واقعی معنویت تک ان رسائی ممکن نہ تھی۔ پھر اس ایجابی معجزے کے ساتھ یہ ایک سلبی معجزہ بھی ہے اس لئے کہ ترقی کے بے شمار مراحل طے کر لینے کے باوجود آج تک سائنس کی طرف سے ایسی کوئی ایک بات بھی سامنے نہیں آئی جس سے قرآن کے بیان کردہ ان حقائق کی کسی بھی درجے میں تردید یا نفی ہوتی ہو۔ ورنہ حالانکہ قرآن نے یہ باتیں آج سے چودہ سو سال پہلے کہی تھیں جب کہ ان علوم کا کہیں پتہ نہ تھا۔ قرآن کے اس اعجاز کی تابانی مزید بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن نے ان حقائق کی نشاندہی باقاعدہ موضوع بنا کر نہیں کی، بلکہ عبرت پذیری، پند و موعظت اور انسان کو خدا سے جوڑنے کی اپنی بنیادی دعوت کے ذیل وہ ان کی طرف متوجہ کرتا گیا ہے۔ ظاہر ہے اس پس منظر میں اسی قدر کافی ہے کہ ان کائناتی حقائق کے ضمن میں وہ بات کہہ دی جائے جس سے عوام الناس آشنا ہوں اور جو آسانی کے ساتھ ان کی گرفت میں آ سکتی ہو۔ اس سے متعلق باریک باتوں اور ان کی تفصیلات کا بیان اس سیاق میں کچھ زیادہ جوڑ نہیں رکھتا ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی بعثت اس مقصد کے لئے نہیں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ فرض کیجیے اگر اس کی باریکیاں اور اس کی تفصیلات بیان بھی کر دی جاتیں تو اس دور کے انسان کے لئے اس کی چنداں افادیت نہ تھی اس کا کوئی فائدہ تو اسی وقت ہوتا جب کہ لوگ ان باریکیوں سے آشنا ہوتے اور ان کے پاس ان کی تحقیق و تفتیش کے وسائل موجود ہوتے۔ ظاہر ہے کہ قرنِ اول کے لوگوں کو یہ چیز حاصل نہ تھی۔ وحی الٰہی نے پہلی بار ان کے سامنے ان حقائق سے پردہ اٹھایا تھا۔ اب اگر پہلے ہی وہلے میں ان کی تمام تفصیلات کھول کر رکھ دی جاتیں تو اس کا بڑا امکان تھا کہ اس وقت کا مخاطب جس کے لئے یہ چیزیں بالکل نئی اور اجنبی تھیں ان کی پیچیدگی سے متحیر ہو کر وہ ان کا انکار کر کرتا ہی خود قرآنی کی اصل دعوت سے اس کا نفور ہو جانا بھی کچھ بہت زیادہ بعید از امکان نہ تھا۔ اسی وجہ سے قرآن نے ان حقائق کے ذیل میں

صرف اجمالی اشارات پر اکتفا کیا اور تفصیلات سے گریز کیا۔ اس پس منظر میں قرآن کا نقطۂ نظر بھی وہی تھا جس کی نشاندہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس فرمان کے ذریعہ کی تھی کہ :

أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأُمُورِ دُنْيَاكُمْ (مسلم) (اپنے دنیوی معاملات کا تم خود بہتر اندازہ کر سکتے ہو)

اس سلسلے میں جہاں تک کائناتی حقائق کا سوال ہے واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے اس ذیل کے انتہائی اہم اور باریک رازوں سے پردہ اٹھایا ہے جب کہ موجودہ سائنس کی رسائی ان تک آج ہو سکی ہے۔ مثال کے طور پر یہ بات کہ آسمان اپنی موجودہ صورت میں آنے سے پہلے دھوئیں کی شکل میں تھا[1] یا یہ کہ ابتدا میں آسمان اور زمین ایک ہی ساتھ ملے ہوئے تھے، بعد میں اللہ تعالیٰ نے انھیں پھاڑ کر الگ الگ وجود بخشا[2]۔ یا مثلاً یہ بات کہ زمین کی طرح آسمان کے اندر بھی زندہ چیزوں کا وجود پایا جاتا ہے[3]۔ آج سے تھوڑے زمانہ پہلے اگر کوئی شخص اس طرح کی باتیں کرتا تو کوئی شخص انھیں ماننے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ لیکن قرآن کا اعجاز دیکھئے کہ اس نے آج سے چودہ سو سال پہلے ان حقائق سے پردہ اٹھایا تھا۔ اسی طرح مثلاً قرآن ایک بات یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام زندہ چیزوں کو پانی سے پیدا کیا ہے[4]۔ نیز یہ کہ اس نے حیوانات کی طرح نباتات کو بھی جوڑے جوڑے بنایا ہے۔ اول الذکر کی طرح ان کے اندر بھی نر اور مادہ کا اصول کارفرما ہے[5]۔ پھر یہ کہ کائنات کی دیگر اشیاء کی طرح اللہ تعالیٰ نے نباتات کو بھی ایک خاص انداز سے اور ایک خاص پیمانے کے ساتھ پیدا کیا ہے[6]۔ ہواؤں کے اندر اللہ تعالیٰ نے بار آور کرنے کی صلاحیت رکھی ہے جس سے

---

[1] فصلت : ۱۱ [2] انبیاء : ۳۰ [3] انبیاء : ۱۹، اسراء : ۵۵، آل عمران : ۲۹، رعد : ۱۵، نحل : ۴۹، اسراء : ۴۴، کہف : ۹۳، حج : ۱۸، نور : ۴۱۔ وغیرہ دیگر آیات۔ [4] انبیاء : ۳۰ [5] یٰسین : ۳۶، حج : ۵، شعراء : ۷، لقمان : ۱۰، ق : ۷، مومنون : ۲۷۔ ذاریات : ۴۹۔ وغیرہ۔ [6] حجر : ۱۹ (مترجم)

فصلوں اور کھیتیوں کو شادابی نصیب ہوتی ہے[1]۔ اسی طرح دن اور رات کے الٹ پھیر کے سلسلے میں قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رات کو دن پر اور دن کو رات پر ڈھانپتا رہتا ہے[2]۔ جس سے علاوہ اور باتوں کے زمین کے مدور ہونے اور اس کے متحرک ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس لئے کہ لفظ تکویر، جو آیت زیر نظر میں ڈھانکنے کے لئے آیا ہے، اس کا صحیح استعمال اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ جو چیز ڈھنکی جارہی ہو وہ مدور ہو۔ اندازہ کیجئے قرآن نے ان عظیم کائناتی حقائق کی کتنی سادہ انداز میں نقاب کشائی کردی ہے جبکہ زمین کے مدور ہونے کا یہی مسئلہ تھا جس پر ماضی قریب تک جدید دنیا میں گرما گرم بحثیں ہوا کرتی تھیں۔

بہر حال یہ چند مثالیں ہم نے بطور نمونہ کے پیش کردی ہیں، یہ بات پورے اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر سائنس کی موجودہ تحقیقات ہمارے سامنے نہ ہوتیں تو ہم ان کی معنویت کو پورے طور پر سمجھ نہیں سکتے تھے۔ چاند، سورج اور تاروں ہی کی مثال لے لیجئے۔ ان کا ایک نظام میں منسلک ہونا، ایک خاص مدار پر متحرک ہونا اور ایک متعین مدت تک کے لئے ان کا اسی طرح سرگرم کار رہنا، جس سے یہ بات خود بخود نکلتی ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب کہ ان کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا، آج کے ترقی یافتہ نظام شمسی کا مطالعہ کئے بغیر صحیح طور پر ان کی معنویت کا ادراک کیونکر کیا جا سکتا ہے، جب کہ قرآن بار بار ان حقائق کی نشاندہی کرتا ہے اور اسلوب بدل بدل کر ان کی یاد دہانی کراتا ہے۔

ان کائناتی حقائق کے علاوہ، انسانی تاریخ اور اس کے فلسفے سے متعلق بھی قرآن نے ہمارے سامنے حیرت انگیز معلومات فراہم کی ہیں، جب کہ قرآن کے علاوہ ان کا پتہ دینے کے لئے دنیا میں کوئی کتاب موجود نہیں۔ قرآن کے علمی اعجاز کو نمایاں کرنے کے پہلو سے

---

[1] حجر : ۲۲، [2] زمر : ۵ (مترجم)

اس کی اہمیت بھی اوّل الذکر حقائق سے کم نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یہی بات کہ دنیا میں قوموں کا عروج وزوال یوں ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے کچھ متعین اصول ہیں جن کے اپنانے اور نہ اپنانے ہی سے کسی قوم کا عروج یا اس کا زوال وابستہ ہے۔ فلسفۂ تاریخ اور علم سماجیات کی یہ وہ لطیف بحثیں ہیں جن کے بعض گوشوں تک انسان کی رسائی آج سیکڑوں سال کی بحث وتمحیص اور ذہنی کاوشوں کی رہین منت ہے۔ [1]

داعی حق دینی حقائق کی تعبیر وتشریح کے سلسلے میں، جب کہ کار دعوت اسی حقیقت سے عبارت ہے، اگر اس پہلو کو مدنظر رکھ سکے اور اس انداز سے اس کی تیاری ہو تو لوگوں کے ذہنوں میں وہ اپنی بات زیادہ بہتر طور پر اتار سکے گا اور انھیں اسلام کی حقانیت کا قائل کرنے کے سلسلے میں دوسروں کے بالمقابل اسے زیادہ کامیابی نصیب ہوگی۔ آج کے زمانے میں سائنس لوگوں کے رگ ریشے میں سرایت کئے ہوئے ہے پس آدمی اپنی بات کو لوگوں سے اسی وقت منوا سکتا اور انھیں متاثر کر سکتا ہے جب کہ وہ ان سے انھیں کی زبان میں اور انھیں کی اصطلاحات میں بات کرنے کے قابل ہو۔ یہی وجہ ہے جو ہم دیکھتے ہیں کہ کار دعوت میں جن لوگوں نے اس پہلو کی رعایت ملحوظ رکھی ہے وہ دوسروں کے بالمقابل اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب ہیں۔ لوگ ان کی باتوں کو زیادہ توجہ سے سنتے اور بڑے پیمانے پر ان کا اثر قبول کرتے ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو: الوحی المحمدی صفحات ۳۰۸-۳۰۰۔ مطبوعہ المکتب الاسلامی۔

حالات حاضرہ پر نظر

گذشتہ صفحات میں دین کے ایک داعی کے لئے ہم نے جن ثقافتوں کی نشاندہی کی ہے، جن سے اپنے کو آراستہ کئے بغیر وہ کار دعوت کو کماحقہ انجام نہیں دے سکتا، یہ گفتگو نامکمل رہے گی جب تک کہ اس میں ایک اور دفعہ کا اضافہ نہ کیا جائے اور وہ ہے ثقافت واقعیہ یعنی حالات حاضرہ پر نظر اور اپنے گرد وپیش کے حالات وواقعات سے واقفیت۔ داعی اگر دینی علوم قرآن، حدیث، فقہ، تفسیر وغیرہ سے واقفیت بہم پہنچالے، ادب، لغت اور تاریخ پر بھی اس کی نظر ہو جائے، سماجی علوم پر بھی اس کی دسترس ہو جائے اور سائنسی علوم سے بھی وہ یک گونہ مناسبت پیدا کرلے، لیکن اس سب کے باوجود اگر اس کی موجودہ دنیا کے حالات پر نظر نہ ہو جس میں کہ وہ سانس لے رہا ہے اور جس سے اس کا صبح شام واسطہ ہے، تو وہ ہرگز ایک کامیاب داعی کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی کو ادا کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ پس داعی کے لئے ناگزیر ہے کہ دنیا کے حالات پر اس کی نظر ہو۔ آج کی دنیا پر کن افکار ونظریات کی حکمرانی ہے۔ کونسے عوامل اور کونسے رجحانات ہیں جو اس کے اندر کارفرما ہیں۔ کن متضاد قوتوں کی اس کے اندر آویزش ہے اور کیسی کیسی تحریکات ہیں

جو اس کے اندر کام کر رہی ہیں۔ نیز یہ کہ دنیا کے مختلف خطوں میں بسنے والے انسانوں کے کیا مسائل ہیں اور وہ کن مصائب اور کن مشکلات سے دوچار ہیں ان سب باتوں سے دین کے ایک داعی کا واقف ہونا ضروری ہے۔ خاص طور پر عالم اسلام کے حالات اس کی نظر اور بھی گہری ہونی چاہئے جس کا دائرہ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک وسیع ہے۔ اس کے کیا مسائل ہیں اور وہ کن مشکلات اور کن پریشانیوں سے دوچار ہے۔ نیز اگر اس کے پردے میں کچھ خوشی اور شادمانی کے پہلو ہیں تو وہ کیا ہیں؟ وہ سرچشمے کیا ہیں جو اس کے لئے قوت کا سامان فراہم کر سکتے ہیں اور وہ کونسے راستے ہیں جہاں سے کمزوریوں کو در آنے کا موقعہ ملتا ہے۔ اس کے بعد داعی کی دلچسپی کا تیسرا دائرہ اس کا اپنا وطن اور اس کے اپنے گردوپیش کے حالات ہیں کہ لوگ وہاں مقامی سطح پر کس نقطۂ نظر کے حامل ہیں اور کن رجحانات و میلانات کو ان کے درمیان قبول عام حاصل ہے۔ انھیں کن مشکلات کا سامنا ہے اور وہ مسائل کی کسی بھنور میں پھنسے ہوئے ہیں۔ نیز عموم واذکار کی وہ کونسی دنیا ہے جس کے سائے تلے وہ اپنی صبح و شام بسر کر رہے ہیں۔

داعی اپنے فریضۂ منصبی سے کامیابی کے ساتھ کبھی عہدہ برا نہیں ہو سکتا جب تک اسے خوب پتہ نہ ہو کہ وہ جن لوگوں کو اپنی دعوت کا مخاطب بنا رہا ہے، وہ کس نقطۂ نظر کے حامل ہیں اور ان کے رجحانات و میلانات کیا ہیں۔ اس واقفیت کے بعد ہی وہ یہ فیصلہ کرنے میں کامیاب ہو سکے گا کہ کس انداز سے ان کے سامنے اپنی بات رکھنی چاہئے، دعوت کی ترتیب کیا ہو، کس چیز کو ان کے سامنے پہلے لایا جائے اور کونسی چیز ہے جو ان سے ذرا بعد میں کہنے کی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضؓ کو یمن بھیجتے ہوئے جن باتوں کی نصیحت کی تھی اس میں ہمیں مخاطب کے احوال کی رعایت ملحوظ رکھنے کے اس اصول کی بہترین عکاسی نظر آتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

إِنَّكَ تَأْتِي قَوْمًا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ فَلْيَكُنْ أَوَّلَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ شَهَادَةَ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوا لِذٰلِكَ فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِي كُلِّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوا لِذٰلِكَ فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ۔

(متفق علیہ)

(تمہارا جانا اہل کتاب کی ایک جماعت کے پاس ہوگا تو سب سے تم انھیں جس چیز کی طرف بلاؤ گے وہ اس بات کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اب اگر وہ اس بات کو مان لیتے ہیں تو انھیں بتاؤ کہ اللہ نے ان پر روزانہ رات اور دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ پس جب وہ اسے بھی مان لیں تو انھیں بتاؤ کہ اللہ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے محتاجوں پر تقسیم کی جائے گی)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر حضرت معاذؓ کا واسطہ مجوسیوں، بے دینوں یا اسی طرح کے کسی دوسرے گروہ سے ہوتا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انھیں کسی اور طریقے سے مخاطب کرنے کے لئے آپ کو تاکید کرتے، اور دعوت کی ترتیب ان کے تئیں اس کے بجائے بدلی ہوئی ہوتی۔

اس پس منظر میں داعی کے لئے ضروری ہے کہ درج ذیل موضوعات پر اس کا مطالعہ اور ان سے متعلق معاملات و مسائل پر اس کی نظر ہو:

۱۔ **عالم اسلام کے حالات**: اسے اچھی طرح پتہ ہونا چاہئے کہ عالم اسلام کے جغرافیائی، اقتصادی اور سیاسی حالات کیا ہیں؟ اور ان اعتبارات سے اس کی آبادی کن مختلف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ کن تدبیروں کو اپنا کر اس کی صفوں میں اتحاد پیدا ہو سکتا اور وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ نیز اسے معاشی، سیاسی اور عسکری سطح پر ایک لڑی میں پرونے کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟ ظاہر ہے یہ خواب اسی وقت شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے جب کہ اس کے

اندر ذہنی اور فکری لحاظ سے پورے طور پر ہم آہنگی پیدا ہو چکی ہو اور پوری اسلامی دنیا اپنے کو وسیع تر اجتماعیت کے شیرازے میں کسنے کے لئے آمادہ ہو۔

'اسلامی صف بندی' 'اسلامی بلاک' اور 'اتحاد اسلامی' جیسے موضوعات پر بھی اسے کچھ نہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں ضرور ہونا چاہئے۔ اس کے بعد ہی 'وسیع تر دائرے میں اسلامی خلافت' کے حصول کی بات آگے بڑھ سکتی ہے۔ جب کہ آج ہر طرف سے اس کے حق میں آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ جب تک چھوٹی چھوٹی مسلم حکومتوں کی جگہ جو عام طور پر وطنی، جغرافیائی اور لسانی بنیادوں پر قائم ہیں، پورا عالم اسلام 'خلافت' کے جھنڈے تلے جمع نہ ہوگا اس وقت تک امت کا بھلا نہ ہوگا۔ اور وہ مسائل کی بھنور سے نکلنے میں کسی صورت کامیاب نہ ہو سکے گی۔

فلپائن، قبرص، اریٹیریا، حبشہ، سوویت یونین، مشرقی یورپ، البانیا، یوگوسلاویہ، چین اور ہندوستان جیسے ممالک میں مسلمانوں کے حالات اور ان کے مسائل سے واقفیت۔ جن میں کہیں تو وہ اقلیت (Minority) میں ہیں۔ اور دوسری جگہوں پر اگرچہ انھیں غالباً اکثریت کی پوزیشن حاصل ہے لیکن حکومت کے جانبدارانہ روے اور عالمی سطح پر دشمن اسلام طاقتوں کی سرپرستی میں انھیں مصائب کی چکی میں پیسا اور ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔

۲۔ دشمن اسلام طاقتوں کی صورتحال : یہ تین خطرناک طاقتیں ہیں : عالمی یہودیت، عالمی صلیبیت اور بین الاقوامی اشتراکیت۔ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ان کے جیسے کچھ اختلافات ہوں، اور جیسی کچھ آویزشیں باہم دگر جاری رہتی ہوں لیکن مسلمانوں اور عالم اسلام کی نسبت سے یہ سب یک زبان ہیں اور صبح شام اس تگ و دو میں لگی رہتی ہیں کہ کس طرح اسے چرکے لگائیں اور اسے زخموں سے نڈھال کئے رہیں۔

اپنے پیش نظر مقصد کو روبکار لانے کے لئے وہ کن وسائل و ذرائع سے کام لیتی ہیں اور ہمارے

خلاف سازشوں کے جال پھیلانے میں ان کے محرکات کیا ہیں، داعی کے لئے ان چیزوں کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ دراصل یہ بغض و حسد کی آگ میں جل رہی ہیں، عالم اسلام اور اس کے وسائل پر للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہیں، اسلام کی مضمر قوت سے یہ خوف محسوس کرتی ہیں۔ اور بے چین ہیں کہ کس طرح عالم اسلام پر اپنے پنجے گاڑلیں وغیرہ۔ عالم اسلام کے خلاف ان کی اس جنگ میں ان کے وسائل کیا ہیں؟ سیاسی جنگ، اقتصادی جنگ اور سب سے بڑھ کر فکری یلغار۔ اس فکری یلغار کے ڈھنگ اور اس کے آلات و وسائل، مشنیریاں، ان کی زبردست تنظیم اور امکانی خطرات اور کامیابی کے بڑھتے ہوئے امکانات۔ عالم اسلام پر عیسائیت کی یلغار۔ افریقہ کے اندر اسلام اور عیسائیت کی کشمکش۔ سب سے بڑے اسلامی ملک انڈونیشیا کو عیسائی مملکت میں تبدیل کرنے کے منصوبے۔ اسی طرح عالم عرب کے مختلف خطوں کو عیسائی اکثریت میں تبدیل کرنے کی کوشش اور ناکامی کی صورت میں پینترے بدل بدل کر اپنے منصوبے کو روبہ عمل لانے کی سعی و جہد۔ ان مقاصد کے حصول کی خاطر مشنیریوں اور استعماری طاقتوں کا باہمی تعاون، یہاں تک کہ مشنیریوں اور اشتراکی قوتوں کا گٹھ جوڑ۔ فتنہ استشراق : اس کے مقاصد اور اس کے وسائل۔ اسلامی ورثہ کو زندہ کرنے اور اسے منظر عام پر لانے میں ان کا حصہ۔ اسلام اور مختلف اسلامی علوم سے متعلق مستشرقین کا تصنیفی کام، ان کا علمی معیار اور ان کی قدر و قیمت کا تعین۔ انصاف پسند مستشرقین اور وہ جن کا شیوہ ہی اسلام اور عالم اسلام پر حملے کرنا ہے۔ استشراقی فکر کی زہر افشانی اور عالم عرب پر اس کے اثرات۔ مستشرقین کے تلامذہ اور ان کے خوشہ چیں حضرات۔ وغیرہ دیگر مسائل۔

اشتراکی حملہ : فنی ماہرین (Tecnicians) تعاون کی دوسری شکلوں، ثقافتی انجمنوں اور اداروں نیز اشتراکی ملکوں کی طرف پہنچنے والے تعلیمی اور خیر خواہ وفود کی راہ سے۔ غیر اشتراکی ممالک کی نسبت سے اندرون ملک کام کرنے والی اشتراکی تنظیموں اور جماعتوں کو سرمایہ فراہم کرنے، ان کی فکری

رہنمائی اور انھیں اخلاقی تائید وحمایت دینے کے ذریعہ ۔نیز ان کے علاوہ دیگر مختلف تدابیر:

خفیہ اور زیر زمین کام کرنے والی تنظیمیں : ماسونیت اور اس کی مختلف شاخیں ۔اس کے خطرات اور اس کے پُر فریب انداز ہائے کار، امرا اور رؤسا کے طبقے میں اس کے بڑھتے ہوئے اثرات، روٹری کلبس وغیرہ۔

داخلی جنگ : مغربی ایجنٹوں اور مغرب کے ذہنی غلاموں کے ذریعہ ۔اسی طرح ہم خیال تنظیموں اور جماعتوں کے ذریعہ جن میں کوئی اپنے کو لبرل پارٹی کا نام دیتی ہے تو دوسری اپنے کو بائیں بازو کے نام سے یاد کیا جانا پسند کرتی ہے ۔ دائرہ اسلام سے خارج اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے والے فرقوں اور جماعتوں کی پرورش و پرداخت اور انھیں زیادہ سے زیادہ منظم اور مضبوط بنانے کی کوشش مثال کے طور پر بہائیت اور قادیانیت وغیرہ جب کہ اس مقصد کے حصول میں انھیں بسا اوقات ملک کے الحاد زدہ حکمرانوں کی تائید وحمایت بھی حاصل ہوتی ہے ۔وغیرہ وغیرہ

اس مقام پر دو باتوں کا پیشِ نظر رکھنا بیحد ضروری ہے ۔

۱ ۔ اول یہ کہ ان دشمن اسلام طاقتوں اور ان کے پیش نظر منصوبوں کو نہ تو بالکل ہلکا لیا جائے، نہ ان کی خطرناکی سے گھبرا کر اپنے ہاتھ پاؤں بالکل ڈھیلے کر لئے جائیں ۔ان کو بالکل کمزور اور بے جان سمجھنا بھی غلط ہے اور یہ بات بھی نامناسب کہ قنوط ویاس کی تصویر بن کر ان کے سامنے بالکل سپر ڈال دی جائے ۔

۲ ۔ دوم یہ کہ یہ دشمن اسلام طاقتیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جس طرح دست بگریباں اور بدترین قسم کی آویزش کا شکار ہیں، کمال دانش مندی کے ساتھ اس کا بھرپور فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے ۔ ایسے کسی بھی موقعہ کو کسی صورت ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئے ۔ مثال کے طور پر روس اور چین کی آویزش اور کش مکش ۔جیسا کہ ہمارے پیش رو بزرگوں کا طرز عمل رہا ہے جو کہا کرتے تھے کہ : خدایا ظالموں کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ الجھائے رکھ ۔اور ہم پر ان کی

سازشوں اور ریشہ دوانیوں کو کوئی آنچ نہ آنے دے : اللھم اشغل الظالمین بالظالمین و اخرجنا من بینھم سالمین

مذاہب کی صورتحال

یہودیت : اس کی نمائندہ تورات جس کے اصل چہرے کو انسانی تحریفات نے داغدار کر رکھا ہے، نیز تالمود جسے پڑھ کر آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں ۔اقوام غیر کے تئیں ان کا نقطہ نظر اور ان کے ساتھ برتاؤ کی نوعیت ۔صہیونی تحریک اور اسرائیل کا قیام جو دراصل اسی نقطہ نظر کی رونمائی اور اسی تصور کی ادنیٰ جھلک ہے ۔

عیسائیت : اس کے مختلف فرقے اور ہر ایک کے علیحدہ چرچ ۔ان کے مابین پائی جانے والی آپسی آویزش اور کش مکش ۔پھر آپس میں ان کی ایک دوسرے سے قریب ہونے کی کوشش ۔یہودیت کے ساتھ ان کا گٹھ جوڑ اور اس کے لئے مسلسل اور پیہم جدوجہد ۔ویٹیکن (Vatican) کا معاہدہ جس کے تحت یہودیوں کو حضرت مسیح کے خون سے بری قرار دیا گیا ۔اسی طرح مسلمانوں اور عیسائیوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی کوشش جسے مسیحی اسلامی اتحاد کے نام سے جانا جاتا ہے، اس کی حقیقت اور اس کی واقعی قدر وقیمت ۔

مشرق بعید کے ملکوں کے بڑے بڑے مذاہب مثلاً ہندومت : اس کے عقائد اور اس میں پائے جانے والے بے شمار فرقوں کی تفصیل، مسلمانوں کے تئیں ان کا رویہ اور وہ برتاؤ جسے یہ روا رکھتے ہیں ۔

بدھ مت : مشرق بعید کے ملکوں میں اس کا پھیلاؤ اور اس کا حلقہ اثر نیز اس مذہب کے ماننے والوں اور اس کے پیروں کی زندگیوں پر اس کے مرتب ہونے والے اثرات ونتائج وغیرہ

مختلف سیاسی نظریات : اشتراکیت، سرمایہ داری، سوشلزم، جمہوریت، ڈکٹیٹرشپ، ان کے مختلف اسکول اوران کے لائحۂ عمل اور طریقہ کار کا ایک دوسرے سے اختلاف۔

مثال کے طور پر مارکسی نظریۂ اشتراکیت جسے روس میں لینن، اور اس کے جانشینوں نے عملی جامہ پہنایا وہ اس اشتراکی طریقۂ کار سے بہت کچھ مختلف ہے جسے ماؤزے تنگ نے چین میں اپنایا۔ بلکہ خود روس کے اندر اسٹالین سے لے کر خروشچیف اور آگے برزنیف تک اس نظریہ کے علمبردار برابر بنیتر ے بدلتے رہے ہیں اور ہر ایک کا طرزِ عمل اپنے پیش رو سے کافی حد تک مختلف رہا ہے۔ یہ حقیقت اس پر مستزاد ہے کہ اشتراکیت کا یہ خیالی فلسفہ کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا کہ سماج سے طبقاتی کشمکش کا یکسر خاتمہ ہوجائے گا، ذرائع دولت میں سب لوگ برابر کے شریک ہوں گے، پورے سماج کی گاڑی باہمی تعاون کی اسپرٹ سے چلے گی اور ریاست کے چنگل سے انسانوں کو ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی۔ وغیرہ وغیرہ

اشتراکیت مغربی یورپ کے مختلف ممالک میں : اس کے بہت سے عابدین کا مارکسی فلسفہ کی بہت سی بنیادی دفعات سے انکار مثلاً طبقاتی کش مکش کے تصور سے ان حضرات کا اظہار برأت مذاہب کے تئیں اشتراکیت کا رویہ خاص طور پر اسلام کے تئیں اس کا طرزِ عمل۔ اخلاقی اقدار کے سلسلے میں اس کا نقطۂ نظر، اور بنیادی انسانی آزادیوں کے تئیں اس کا رویہ۔

موجودہ سرمایہ داری : جس کے خد وخال اب اپنے ابتدائی ادوار سے بہت کچھ مختلف ہیں۔ امریکہ، یورپ کے بیشتر ممالک اور جاپان میں سرمایہ دارانہ نظام کی صورت حال۔ موجودہ سرمایہ داری کے رجحانات اور مذہب اور مذہبی اقدار کے تئیں اس کا رویہ۔ سرمایہ داری : بے دینی والحاد کی علمبردار۔ یورپ کے بعض ممالک میں جمہوری عیسائی پارٹیوں کے قیام کی معنویت، اس کے عوامل اور محرکات۔ وغیرہ۔

سوشلزم : اس کے مختلف مکاتب فکر۔ آپس میں ان کے ایک دوسرے سے اختلافات۔ سوشلزم کی مختلف تعبیرات اور ان کے نوع بہ نوع نقطہائے نظر کے مابین قدر مشترک۔ سوشلزم اور اشتراکیت کا فرق۔ مذہب اور مذہبی اقدار کے تئیں سوشلزم کا رویہ۔ بعض یورپی ملکوں میں عیسائی سوشلسٹ پارٹیوں کا قیام، ان کی معنویت اور اس کے اسباب و محرکات۔

جمہوریت : اس کا مفہوم اور اس کی بے شمار شاخیں۔ اشتراکیت، سرمایہ داری اور سوشلزم ان میں سے ہر ایک کے علمبرداروں کی طرف سے جمہوریت کے دعویدار ہونے کی حقیقت اور ان کے دعووں کی اصلیت۔ جمہوریت کے روبہ عمل آنے کی مختلف شکلیں اور اس کے مختلف نقطہائے نظر، موجودہ دنیا میں جمہوریت کو درپیش مسائل، ان کا تجزیہ اور ان کے حل کی تدابیر۔

ڈکٹیٹرشپ : اس کا مفہوم اور اس کی مختلف اقسام۔ ایک خاص طبقے کی ڈکٹیٹرشپ، ایک پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ، ملک کے حکمراں کی ڈکٹیٹرشپ۔ فاشزم اور نازی ازم کے تجربات۔ موجودہ دنیا میں ڈکٹیٹرشپ، اس کی صورت حال، اس کے مسائل اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے امکانی وسائل وغیرہ

ان مختلف سیاسی مسالک کے تئیں اسلام کا نقطۂ نظر۔ اسلام کامل نظام زندگی۔ مذکورہ مسالک سے اسلام کی کلی مغایرت، کسی ایک جزء سے موافقت تو ان کے بیشتر اجزاء سے اس کا جوہری اختلاف۔ اسلام کی راہ کا اپنے مقاصد اور ان کے حصول کے ذرائع ہر ایک میں ان سے بالکل الگ ہونا۔ بنا بریں مذکورہ مسالک میں سے کسی کے ساتھ اسلام کا جوڑ لگانا، اسلام کے ساتھ اس سے بڑھ کر کسی بے انصافی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ امت مسلمہ کے پاس قرآن و سنت اور ان کی تشریح و ترجمانی کا جو عظیم سرمایہ ہے اس کے پیش نظر وہ ہر اجنبی اور درآمد کئے ہوئے نظریے اور فکر سے بے نیاز ہے۔ امت پر باہر سے درآمد کئے ہوئے مسائل کے حلوں (Solutions) کو تھوپنا

وہ سب سے بڑا جرم جس کا اس کے تئیں تصور کیا جا سکتا ہے۔ مسائل کا حل صرف اسلام کے پاس ہے۔ اور اس باب میں وہ کسی قسم کی مداہنت کو انگیز کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اسلامی تحریکات کی صورت حال

ان میں کچھ تحریکات تو وہ ہیں جن کا دائرہ اپنے اپنے ملکوں تک محدود ہے دوسری وہ ہیں جنھوں نے اپنے لئے عالمی دائرے کا انتخاب کیا ہے۔ پھر بعض تحریکات وہ ہیں جنھوں نے احیاء اسلام کے سلسلے میں دین کے صرف چند اجزاء کا انتخاب کیا ہے اور کچھ ہیں جن کی دعوت ہمہ گیر ہے اور جو زندگی کے ہر گوشے میں تبدیلی و انقلاب کی علمبردار ہیں۔

عالم اسلام میں ان تحریکات میں اہم ترین تحریک ہے۔ جماعت اسلامی پاکستان اور جماعت اسلامی ہند ہیں۔ اسی طرح انڈونیشیا میں ماشومی پارٹی اور ترکی میں کام کرنے والی اسلامی تحریک تحریک آزادی فلسطین جس کا خاص دائرہ اثر فلسطین کے ارد گرد ہے۔ نیز اخوان المسلمون جس کا دائرہ مصر سے آگے اب پورے عالم عرب تک وسیع ہو چکا ہے عصر حاضر کی اسلامی تحریکات میں یہ سب سے اہم اور بڑی تحریک ہے۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ نہ صرف کچھ ملکوں بلکہ بین الاقوامی سطح پر آج اس کے اثرات محسوس کئے جا رہے ہیں۔

عالم اسلام میں دعوت اسلامی کی صورتحال: اس کے سلسلے میں کام کرنے والی تنظیمیں اور ادارے ان کی سرگرمیاں اور ان کے وسائل و ذرائع۔ مساجد ان کا پیغام اور ان کے نظام میں پائی جانے والی خامیوں کی نشاندہی۔ اصلاح کی صورت میں دعوت اسلامی کے سیاق میں ان کے متوقع رول کا جائزہ اور اس کا تجزیہ کہ اس پس منظر میں وہ کیا اہم خدمات انجام دے سکتی

ہیں۔ رسالۃ المسجد کانفرنس۔ اسلامی لٹریچر، انھیں زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کی کوشش اور ان کے دائرۂ اثر کو وسیع کرنے کا اہتمام۔

دعوت دین کے کام میں لگی ہوئی شخصیات اور اس سلسلے کے اہم ترین افراد۔ دعوت دین کے کام کو موثر بنانے اور اسے آگے بڑھانے نیز اس مقصد کے لئے افراد تیار کرنے کی بابت پہلی عالمی کانفرنس۔ اس کی قرار دادیں اور اس میں پیش کئے گئے تجاویز اور مشورے وغیرہ

اسلامی کالج اور یونیورسٹیاں نیز دیگر اسلامی اداروں کی اہمیت اور ان کے فرائض منصبی اوقاف اور اسلامی امور و مسائل (الشئون الاسلامیۃ) سے متعلق وزارتوں کا رول اس پس منظر میں عالم اسلام سے باہر کی دنیا کی دعوت اسلامی کی رفتار کار۔ ایشیا اور افریقہ نیز یورپ اور امریکہ میں، اسلامی مراکز، اسلامی تنظیمات، طلبہ تنظیمیں، اسلامی مدارس، ان تنظیمات اور اداروں کے درمیان تال میل اور توافق و ہم آہنگی کی اہمیت۔ ان کے تئیں دشمن اسلام طاقتوں کی سازشوں اور ان کی ریشہ کاریوں سے چوکنا رہنے کی ضرورت۔ اس باب میں عالم اسلام کا خصوصی تعاون۔ مادی اور اخلاقی ہر ممکن طریق سے نیز اس سیاق میں ادب اور صحافت کا اہم ترین کردار۔

جامعہ ازہر، رابطہ عالم اسلامی نیز ان کے علاوہ دیگر اسلامی تنظیمات اور اداروں کا رول دعوت اسلامی کے فروغ اور ارباب دعوت کے ساتھ ہمہ جہتی تعاون کے ذیل میں مسلم حکومتوں کو آگاہی کہ ملکی سیاست کے چکر میں وہ ان تنظیمات اور ان اداروں کی سرگرمیوں میں کسی قسم کی دخل اندازی سے مجتنب رہیں۔ اور انھیں پوری آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ دیں۔

مخالف اسلام قوتیں

اس سے ہماری مراد وہ تصورات ونظریات اوران کی علمبردار قوتیں ہیں جو آج عالم اسلام میں براہ راست اسلام سے متصادم ہیں اوراس طرح عالم اسلام کی جڑوں پر تیشہ چلا تے والی ہیں۔ مثال کے طور پر مارکسی نقطۂ نظر کی حامل قوتیں جنھیں عام طور پر بائیں بازو کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ خالص مادہ پرستانہ تصور حیات کی علمبردار ہیں اوراشتراکی بلاک کی ہمنوا ہیں۔

زندگی میں آزادروی کی قائل لبرل نقطۂ نظر کی حامل طاقتیں اور جماعتیں جو سرمایہ دارانہ مغربی بلاک سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ عالم اسلام میں ان کی نمائندگی کرنے والے بہت سے ارباب قلم اور مصنفین صحافی اور دانشور موجود ہیں۔ مستقل کتابوں کے علاوہ بہت سے اخبارات ورسائل اس نقطۂ نظر کے فروغ کے لئے کام کررہے ہیں۔ فکرونظر کا یہ دھارا بھی پوری طرح الحادزدہ اوراسلام کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

قومیت کی علمبردار قوتیں اور جماعتیں۔ عرب قومیت، ایرانی اور تورانی قومیت وغیرہ زندگی کا یہ نقطۂ نظر بھی ملحدانہ اور بے دینی پر مبنی ہے جس کا کہنا ہے کہ مذہب انسان کی پرائیویٹ زندگی کا معاملہ ہے دنیا کے معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔

اُمت ہی کی صفوں سے پیدا ہونے والے بعض فرقوں کی صورت حال جو اسلام پر کلہاڑا چلانے والے ہیں:

جن میں سب سے بڑا اور نمایاں فتنہ بہائیت اور قادیانیت کا ہے۔

جہاں تک اول الذکر کا تعلق ہے تو یہ ایک بالکل نیا دین ہے جس کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس کے علمبرداروں نے کبھی بھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ کسی بھی جہت سے اس کا تعلق

اسلام سے ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا خمیر اسلام کی سرزمین ہی میں تیار ہوا اور اسی سرزمین سے وہ اپنے پر پرزے نکالنے میں کامیاب ہوا۔

دوسرا فرقہ بھی دائرہ اسلام سے خارج اور بالکل گمراہ ہے جو خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک نئی نبوت کا دعویدار ہے۔ البتہ یہ مسلسل اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اپنے کو اسلام اور مسلمان امت سے جوڑے رکھے۔ اور اسے بدستور امت میں شامل سمجھا جاتا رہے۔ البتہ بہائی ہوں یا قادیانی ایک بات میں دونوں کا اتفاق ہے دشمن اسلام طاقتوں سے یہ برابر ملے رہتے ہیں، اوران سے ان کا گٹھ جوڑ مسلسل قائم رہتا ہے۔

اپنے قریبی ماحول پر نظر

داعیٔ حق کے فرائض میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اس کی اپنی قریبی ماحول پر نظر ہو۔ وہ اس کے حالات، اس کے رجحانات ومیلانات اوراس کی پسند ناپسند کے معیارات کو خوب اچھی طرح جانتا ہو۔ وہ اس ماحول کے مسائل اور وہاں کے لوگوں کی نفسیات کو پوری طرح سمجھتا ہو اور پوری گہرائی میں اتر کر ان کا تجزیہ کرسکے۔ اسی صورت میں وہ اس قابل ہو سکے گا کہ ان کے سامنے اپنی بات کو موثر طور پر رکھ سکے اوران کے دل کے دریچوں کو اس کے لئے کھلا پائے۔ اسی سے یہ بات نکلتی ہے کہ اسے ان کی زبان سے بھی اچھی طرح واقف ہونا چاہیے کہ اس کے بغیر وہ ان سے گفتگو کرنے اورانھیں اپنی بات سمجھانے کے قابل نہیں ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو اللہ نے ہر رسول کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ۔ (ابراہیم - ۴)	اور ہم نے جو کوئی رسول بھیجا وہ اپنی قوم کی زبان بولتا تاکہ ان کے سامنے بات کو کھول کر رکھ سکے۔

اسی طرح بین الاقوامی زبانوں میں سے چند ایک ورنہ کم ازکم ایک زبان سے داعی کو بہرحال واقف ہونا چاہئے (اس لئے کہ آج ہر جگہ اور ہر خطۂ زمین پر ان زبانوں کے بولنے اور سمجھنے والے پیدا ہوگئے ہیں۔ دنیا کے بہت سے علاقوں میں انھوں نے مقامی زبان کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اور رابطے کی زبان (Link Language) کی حیثیت سے تو کافی وسیع قطع ارضی پر ان کا چلن ہے)

گردوپیش کے حالات پر نظر کے باب میں یہ چند موٹی موٹی باتیں تھیں جن کی ہم نے نشاندہی کی۔ یقیناً اس موضوع سے متعلق معلومات آدمی کو صرف کتابوں ہی سے حاصل نہیں ہوسکتیں" نہ اس باب میں صرف کتابوں پر انحصار کی روش کچھ زیادہ مناسب ہی ہے۔ اس لئے کہ اس کا تعلق زندگی کے تیز رفتار سفر سے ہے جس کی منزل ہر نئے دن بدلتی رہتی ہے اور جس کے قدم ہر لمحہ آگے کو بڑھتے ہوتے ہیں۔ صرف کتابوں پر انحصار نہ کرتے ہوئے اخبارات ورسائل اور ریڈیو کی نشریات وغیرہ سے بھی اس سلسلے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ بیدار مغز داعی روزمرہ کے واقعات سے متعلق حاصل ہونے والی ان معلومات سے اپنی دعوت کے سیاق میں بڑا مواد فراہم کرسکتا اور اسے اپنے مقصد کے لئے کافی بہتر طریقے پر استعمال کرسکتا ہے۔

مناسب ہوگا کہ داعی اس مقصد کے لئے ایک الگ رجسٹر اور نوٹ بک بنائے جس میں روزمرہ کے واقعات میں سے اہم اور خاص چیزوں کو نوٹ کرتا ہے۔ اس طرح ایک ترتیب کے ساتھ اس کے پاس چیزیں اکٹھی ہوتی رہیں گی جو بعد میں اس کے لئے ایک قیمتی مواد بن جائیں گی جنھیں وہ حسب ضرورت مختلف موقع پر استعمال کرسکے گا۔ روزمرہ کے واقعات کو عام طور پر لوگ اہمیت نہیں دیتے حالانکہ آج کا یہی واقعہ کل کی تاریخ بن جاتا ہے جس کے مطالعہ کے لئے لوگ جانیں کھپاتے ہیں اور اس کے ایک ایک جزء کو تنقید وتحلیل کی نظر سے دیکھنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔

ماضی کی تاریخ اور ماضی کے حالات وواقعات کے مقابلے میں داعی کے لئے یہ تازہ اور سامنے کے واقعات زیادہ برمحل اور حسب موقعہ ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ پورا معاملہ لوگوں کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ اپنے حافظہ پر کوئی بوجھ ڈالے بغیر لوگ انھیں اپنی نگاہوں کے سامنے تازہ محسوس کرتے ہیں جس سے بات کافی آسانی سے سمجھ میں آتی اور مخاطب کے دل ودماغ میں اس کے گھر کرنے کے امکانات بیش از بیش ہوتے ہیں۔

اپنے زمانے اور اپنے گردوپیش کے حالات وواقعات سے واقفیت کے ضمن میں ان ذرائع معلومات کے علاوہ ایک دوسرا ذریعہ جو ان میں سب سے آسان اور غالباً ان سب سے زیادہ موثر ہے۔ وہ ہے اپنے بڑوں سے ملاقات ان کی صحبت میں رہنا، ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ان کی باتیں سننا، اور ان کی معیت میں زیادہ سے زیادہ وقت گذارنے کی کوشش کرنا۔ اس مقصد کے لئے اگر سفر کی مشقت بھی برداشت کرنی پڑے تو اسے بھی خندہ پیشانی کے ساتھ گوارا کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ معلومات میں جو گہرائی اور مزاج میں جو پختگی ان حضرات کے ساتھ رہنے اور ان کی صحبت کا فیض اٹھانے سے پیدا ہوتی ہے کسی دوسری صورت سے اس کا حصول ممکن نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے جو گذشتہ ادوار میں ہمارے علمائے اُمت کے ہاں یہ اس چیز کا کثرت سے چلن تھا۔ اپنی علمی پیاس بجھانے کی خاطر وہ دور دراز مقامات کا سفر کرتے اور اس کی مشقتوں کو خوشی خوشی انگیز کرتے تھے۔ بے شمار مثالیں تو ایسے لوگوں کی ہیں جنھوں نے اسی راہ میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ گزار دیا۔ سچی تڑپ اور علم کی حقیقی پیاس جس کسی کے اندر ہوگی، اسے اپنے سے بڑوں کی تلاش ہوگی اور اس راہ کی ہر زحمت کو وہ عین راحت تصور کرتے ہوئے انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ انگیز کرنے کے لئے آمادہ ہوگا۔ خوش نصیب ہیں وہ جنھیں حق تعالیٰ کی طرف سے اس کی توفیق عطا ہو۔